مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

کاروانِ زندگی

حصّہ سوم

مجلس نشریات اسلام
۱۔ کے ۳۔ ناظم آباد نمبر ۱ کراچی نمبر ۱۸

کاروانِ زندگی

(حصّہ سوم)

جنوری ۸۴ء سے لے کر نومبر ۱۹۸۷ء تک کے اہم حالات وواقعات، تحریکات و سرگرمیاں، جن سے مصنّف کتاب کا براہ راست تعلق رہا ہے اور جن کے بارے میں ذاتی مشاہدات وتاثرات اور اخذ کردہ نتائج، ملک وعالم اسلام کے آئندہ مورخین کے لئے شہادتِ عینی ودستاویزی مواد فراہم کرتے ہیں، نیز بعض قدیم اور نئے ملکوں کے طویل سفر، وہاں کے چشم دید حالات، ایک داعی دین، قرآن میں غور وفکر کرنے والے اور ملل وادیان کی تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مخلصانہ مشورے اور تبصرے، ملک کے تشویشناک اور قابل فکر حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ، پیام انسانیت اور بقائے باہم کی کوششوں اور علمی سیمناروں اور موتمرات کی مختصر روداد۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجلس نشریات اسلام

۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اپنی حیات میں مندرجہ ذیل اداروں کے ذمہ دار رہے

- ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ
- صدر مجلس انتظامی و مجلس علماء دارالمصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ
- رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
- صدر رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی و مدینہ یونیورسٹی
- صدر آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی آکسفورڈ۔

نام کتاب ـــــــــ کاروان زندگی (جلد سوم)
تصنیف ـــــــــ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
طباعت ـــــــــ مولائی پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت ـــــــــ ۳۶۰ صفحات

ٹیلیفون : ۶۶۰۱۸۱۷

اسٹاکسٹ : مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی فون ۲۶۳۸۹۱۷

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

فہرست عناوین

(کاروانِ زندگی سوم)

پیش لفظ ۹

باب اوّل

عمّان (شرق اردن) حجاز ویمن کا سفر، اہم مجالس میں تقریریں اور خطابات، یمن کے مشاہدات وتاثرات ۱۱–۵۲

کاروانِ زندگی کی تیسری جلد کا آغاز ۱۱
شرق اردن اور یمن کا تاریخی سفر ۱۲
عمّان میں ۱۳
ممتاز سیمنار ۱۴
ہندوستان میں مسلمان اور ان کا تاریخی کردار ۱۵
فلسطین اور بیت المقدس کے مسئلہ پر
امیر حسن کی پُرمعلومات اور مُدلّل تقریر ۱۷
لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف ۱۸
عمّان کی مصروفیتیں اور خطابات ۱۹
اصحابِ کہف کا غار ۲۱
عمّان کے احباب اور مجالس ۲۳
حجاز مقدس میں ۲۶
رابطۂ ادب اسلامی کا قیام ۲۷
مفتی عتیق الرحمن صاحب کی وفات کی اطلاع ۲۸
یمن کا سفر ۳۰
صنعاء میں ۳۲
صنعاء یونیورسٹی میں تقریر ۳۴
مسلمان کی قوت کا سرچشمہ ۳۷
قوم سبا کے قصّہ سے سبق ۴۱
ذمہ دارانِ حکومت سے ملاقاتیں ۴۳
یمن میں دعوتی لٹریچر اور اس کا اثر ۴۴
صنعاء اور اس کے اطراف ۴۵
یمن کے مرکزی وتاریخی مقامات کا دورہ ۴۸

باب دوم

بنگلہ دیش اور پاکستان کے سفر، اہم مجالس و خطابات

۵۳ — ۷۸

عنوان	صفحہ
بنگلہ دیش	۵۳
دینی شعور، اسلامی حمیت کی بیداری کی تلقین اور مثبت و تعمیری مشورے	۵۵
نعمتِ اسلام کی قدر اور اس پر شکر کی ضرورت	۵۷
اسلامک فاؤنڈیشن میں اہم تقریر	۵۷
بنگلہ زبان میں اہلِ دین کی مہارت و قیادت کی ضرورت	۵۸
اس ملک کی قسمت اسلام سے وابستہ ہے اور وہ اس کی دائمی ملکیت ہے	۶۰
علمی، ادبی و فکری میدان میں آزاد و خود کفیل ہونے کی ضرورت	۶۱
رفقائے سفر کی مشغولیت و افادیت	۶۳
کراچی (پاکستان) میں چار روز قیام اور شدید مصروفیت	۶۴
ملک و قوم کی سطح پر اسلامی معاشرہ کی ضرورت	۶۶
صالح اور طاقتور معاشرہ ہی اقتدار اور تہذیب کی بنیاد اور ان کا اصل سرچشمہ ہے	۶۸
صحیح اسلامی اقتدار کی ذمہ داری اور اس کے برکات	۶۹
جاہ طلبی اور حصول اقتدار کی چاٹ سب سے بڑا خطرہ	۷۰
نوجوانوں میں احساس ذمہ داری اور ضبط نفس مملکت کی اصل دولت ہے	۷۰
ایک آزاد ملک میں علماء کی ذمہ داری	۷۲
ہر وقت چوکنا اور ہوشیار رہنے کی ضرورت	۷۳
"تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم" (تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ)	۷۴

باب سوم

ہندو احیائیت کی ہندگیر تحریک، مسز اندرا گاندھی کے نام ایک تاریخی خط، اندرا جی کا قتل اور سکھوں کے خلاف اس کا ردِ عمل اور میرا موقف، حجاز مقدس کا ایک سفر، پیام انسانیت کا ایک دورہ، انگلستان و بلجیم کا سفر

۷۹ — ۱۱۰

عنوان	صفحہ
ہندو احیائیت کا طوفان اور ملت اسلامیہ کے لئے خطرہ	۷۹

عنوان	صفحہ
اہم اور تاریخی مساجد کو منڈیوں میں تبدیل کرنے کا مطالبہ	۸۱
مسز اندرا گاندھی کے نام تاریخی خط	۸۴
مسز اندرا گاندھی کا قتل اور اس کا ردِ عمل	۹۱
حجاز مقدس کا ایک سفر اور ایک اہم تقریر اور ایک استقبالیہ	۹۴
پیام انسانیت کا ایک دورہ	۱۰۴
لندن، آکسفورڈ اور کیمبرگ میں چند دن	۱۰۶
ایک مخلص ملی کارکن اور رفیق کار کی وفات	۱۱۰

باب چہارم

عنوان	صفحہ
مسلم پرسنل لا (مسلمانوں کے عائلی قانون) کے تحفظ کی مہم، ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے لئے نئی آزمائش، ہندگیر تحریک، اسلامی عائلی قانون میں عدالت عالیہ کی مداخلت، اس کا مقابلہ اور ملت کی کامیابی	۱۱۱-۱۶۰
مسلم پرسنل لا (مسلمانوں کے عائلی قانون) کے تحفظ کی مہم اور تحریک اور اس کی ذمہ داری	۱۱۱
کلکتہ کا اجلاس عام	۱۱۳
سپریم کورٹ کا فیصلہ کھلی مداخلت فی الدین اور شریعت اسلامی پر حملہ	۱۱۶
سپریم کورٹ کا فیصلہ اور شرعی قانون کا تقابل	۱۱۹
ایک خطرناک اقدام	۱۲۱
سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف ہندگیر مہم اور عظیم الشان جلسوں کا سلسلہ	۱۲۳
انگریزی، ہندی پریس کا ناقابل فہم موقف اور زلزلہ انگیز طوفانِ مخالفت	۱۲۸
وزیر اعظم سے ملاقاتیں اور افہام و تفہیم کی کوشش	۱۳۱
ایک نازک مرحلہ	۱۳۵
بابری مسجد	۱۳۸
مسٹر راجیو کے بل کی حمایت میں بیانات	۱۳۹
بل کی پارلیمنٹ سے منظوری	۱۴۱
راجیو جی کے نام ایک اہم خط	۱۴۸
مشترک عائلی قانون کا خطرہ	۱۵۱
سطحی و عامیانہ خیال	۱۵۳
جمہوری ملک میں حقوق کی حفاظت کا طریقہ	۱۵۵
بابری مسجد	۱۵۷
چند اہم اجتماعات	۱۵۹

باب پنجم

استنبول (ترکی) میں رابطۂ ادب اسلامی کا جلسہ
کراچی کا چند روزہ قیام اور اس کی اہم تقریریں
۱۶۱—۱۷۸

ترکی میں رابطۂ ادب اسلامی کا جلسہ	۱۶۱
شکوۂ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی	۱۶۴
حیات بعد الموت کی وسعت	۱۶۶
بورصہ میں	۱۶۹
کراچی میں ڈھائی دن	۱۷۱
اسلامی معاشرہ کے لئے حقیقی خطرات	۱۷۲
نعمتوں پر شکر اور ہوشمندانہ تقابل	۱۷۵

باب ششم

انگلستان، الجزائر، اور حجاز کے سفر، آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر اور الجزائر کے "ملتقی الفکر الاسلامی" کے سیمنار میں شرکت، حجاز میں چند روزہ قیام، چند اہم واقعات ۱۷۹—۱۹۲

اسلامک سنٹر آکسفورڈ میں	۱۷۹
الجزائر کے سیمنار میں	۱۸۰
ملتقی کا مقالہ	۱۸۲
رفیق قدیم مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی کی وفات	۱۸۷
امام حرم اور سکریٹری جنرل رابطۂ عالم اسلامی کی لکھنؤ اور دار العلوم میں آمد	۱۸۹

باب ہفتم

دہلی، ناگپور اور پونہ کے ڈائلاگ ۱۹۳—۲۱۴

شاخ نشیمن	۱۹۳
ناگپور کا ڈائلاگ	۲۰۰
دوسرے جلسے	۲۰۴
پونہ	۲۰۵
جلسہ	۲۰۶
مقالہ کے اہم نکات	۲۰۷
دوسری مجالس	۲۱۲

باب ہشتم

رابطۂ ادب اسلامی کے اجلاس ۲۱۵—۲۳۴

رابطۂ ادب اسلامی کا جلسہ ندوۃ العلماء میں	۲۱۶
جامعۂ ہدایت جے پور میں رابطہ کا سیمنار	۲۱۸
مغربی فکر و ادب کی بے راہ روی، خامی و نارسائی کا بنیادی سبب	۲۲۲
دنیا کی علمی، فکری اور ادبی قیادت، مسلمانوں کا منصب اور فریضہ	۲۲۶

باب نہم ۹

ملیشیا کا سفر اور وہاں کی مختلف مجالس، اداروں اور مسلم تنظیموں میں خطاب ۲۳۵-۲۵۰

ملیشیا کا سفر اور اس کی دعوت و تحریک	۲۳۵
دہلی سے کوالالمپور	۲۳۷
ترنگانو کا سفر اور وہاں کے خطابات	۲۳۹
مسلم ممالک میں بے چینی اور عوام اور حکومتوں میں محاذ آرائی کی وجہ	۲۴۲
قدح کا سفر اور خطابات	۲۴۴
دین کے نوجوان داعیوں اور علمبرداروں کے کام کی نزاکت اور ایمانی زندگی کے مراحل	۲۴۶
کوالالمپور کا آخری دن	۲۴۹

باب دہم ۱۰

آیۃ اللہ خمینی صاحب کی مخالفت، فرقۂ اثنا عشریہ کے بعض مشہور اور مسلّم عقائد پر تنقید اور "دو متضاد تصویریں" کی تالیف ۲۵۱-۲۶۲

ایرانی انقلاب اور اس کا سحر و اثر	۲۵۱
ایک غیر متوقع ردِّ عمل	۲۵۳
سحر و دل کشی کے اسباب	۲۵۵
مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی کتاب "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت"	۲۵۶
"دو متضاد تصویریں"	۲۵۷
بعض اہلِ تعلق کا استعجاب اور مصنف کا اطمینان	۲۶۰

باب یازدہم ۱۱

میرٹھ کا ہولناک فساد، اندرون و بیرون ملک کے چند سفر ۲۶۳-۲۷۷

میرٹھ کا ہولناک فساد	۲۶۳
علالت اور دہلی و بمبئی کا سفر	۲۶۸
لندن اور کویت کا سفر	۲۷۰
آکسفورڈ اور لندن میں	۲۷۲
ہندوستان واپسی	۲۷۶

باب دوازدہم ۱۲

حجاز کا سفر، رابطہ کے مؤتمر اسلامی عام سوم میں شرکت، حجاز کی مصروفیات و محاضرات ۲۷۸-۳۰۹

رابطہ کی تیسری عمومی اسلامی کانفرنس	۲۷۸
مکۂ معظمہ کا سفر اور مؤتمر کی مصروفیت	۲۸۰
مکۂ معظمہ و مدینہ منورہ کی حرمت پر تقریر	۲۸۲

دوسری نشستیں، مقالہ اور آخری تقریر	۲۸۷
بلد امین (مکہ) کی خصوصیات اور شعار و دعوت	۲۹۴
مکۂ معظمہ وحرم کے تأثرات	۲۹۸
مدینہ طیبہ کی حاضری	۳۰۰
مدینۂ طیبہ کا چند روزہ قیام	۳۰۳
رابطۂ ادب اسلامی کی نشستیں	۳۰۵
جدہ کا ایک روزہ قیام اور ایک تقریر	۳۰۵

باب سیزدہم ۱۳

دو سیمینار، ایک عظیم حادثہ	۳۱۰—۳۳۲
دار العلوم ندوۃ العلماء میں رابطۂ ادب اسلامی کا ایک سیمینار	۳۱۰
ایک عظیم حادثہ، سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی وفات	۳۱۸
شیخ الاسلام امام حافظ ابن تیمیہؒ پر جامعۂ سلفیہ بنارس کا سیمینار	۳۲۵
اشاریہ (انڈکس)	۳۳۳

مرتبہ از:- محمد غیاث الدین ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

"کاروانِ زندگی" کی دوسری جلد پر جو ۱۹۸۳ء کے واقعات اور روئیداد پر ختم ہوئی ہے، تیسری جلد کے لکھنے کا خیال بھی نہ تھا، لیکن جب ان دو جلدوں کا عربی ترجمہ عزیز القدر مولوی سید سلمان حسینی ندوی کے قلم سے مکمل ہو کر دار القلم دمشق وجدہ کے مالک استاد محمد علی دولہ کے پاس پہونچا اور وہ شعبان ۱۴۰۷ھ (مئی ۱۹۸۷ء) میں طباعت کے اس اعلیٰ پیمانہ اور معیار پر "فی مسیرة الحیاة" کے نام سے زیور طبع سے آراستہ ہوا جس پر کم تر کتابیں شائع ہوتی ہیں، تو اچانک طابع و ناشر (استاد محمد علی دولہ) اور مصنف کے علم میں یہ بات آئی کہ غلطی سے سرورق پر جلد اول کا نمبر پڑ گیا ہے، شاید فاضل ناشر کے خیال میں یہ بات رہی ہو کہ اس کی تیسری جلد تیار ہوگی اور وہ اس جلد کے بعد جلد دوم کے عنوان سے شائع ہوگی، استاد محمد علی دولہ نے معذرت کے ساتھ اس بات کی خواہش کی کہ اب یہ سلسلہ مکمل کر لیا جائے، اور اس کی تیسری جلد بھی لکھ لی جائے، جو "فی مسیرة الحیاة" کی جلد دوم کے طور پر شائع کی جا سکے، ورنہ خریدار اور قارئین کتاب کو نامکمل سمجھیں گے اور جو اس کو حاصل کریں گے وہ اس کی دوسری جلد کے منتظر رہیں گے۔

ادھر جلد دوم کی تکمیل کے بعد ناچیز مصنف کی زندگی اور ملک و ملت کے دائرہ میں

بہت سے ایسے اہم واقعات اور مرحلے پیش آئے جن کی روئیداد لکھنا اور ان کو تاریخی طور پر محفوظ کر دینا مفید اور ضروری نظر آیا، خاص طور پر مسلم پرسنل لا کے دفاع اور تحفظ اور سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے خلاف جس میں صریحی مداخلت فی الدین تھی، ہندوستانی مسلمانوں کی وہ عظیم الشان مہم اور جدوجہد شروع ہوئی جس کی نظیر اپنی عمومیت اشدت، اہمیت اور نزاکت میں ملت اسلامیہ ہندیہ کی پچھلی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، اور اس کے متعلق یہ خطرہ ہے کہ کچھ وقت گذر جانے کے بعد اس کے بارہ میں صحیح معلومات اور ضروری تفصیلات کا دستیاب ہونا مشکل ہو جائیگا، اسی طرح دوسرے ملی مسائل، فرقہ وارانہ صورت حال، بقائے باہم اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور انصاف کرنے اور احترام انسانیت کے سلسلہ میں ڈائلاگ کی شکل میں ہندوستان کے مختلف مرکزی شہروں میں جو کوشش کی گئی ہے اس کا ریکارڈ بھی ملنا مشکل ہو جائیگا، اس کے علاوہ کچھ اہم بیرونی سفر اور عالم اسلام سے تعلق رکھنے والے بعض اہم سفر اور واقعات پیش آئے جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہ سب احساسات و حقائق اس تیسری جلد کے محرک ہیں، اب یہ جلد قارئین کے سامنے پیش کی جا رہی ہے، تقدیری بات ہے کہ اس کے ضمن ابتدائی ابواب گرمی کے رمضان المبارک میں لکھوائے گئے، اور بقیہ حصہ طویل علالت کے دوران لکھوایا گیا۔

اللہ تعالیٰ ان مجبوریوں اور کمزوریوں کے باوجود (جن میں یہ کتاب وجود میں آئی) اس کو مفید اور صحت مند اسلامی ادب میں جگہ پانے کی مستحق قرار دے۔

وما ذلك على الله بعزيز

ابوالحسن علی ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اوّل

عمّان (شرقِ اردن) حجاز و یمن کا سفر، اہم مجالس میں تقریریں اور خطابات، یمن کے مشاہدات و تاثرات

کاروانِ زندگی کی تیسری جلد کا آغاز و جواز

کاروانِ زندگی کی جلد دوم امارات و کویت کے اس سفر کی مختصر روئیداد پر ختم ہوئی تھی جو ۱۵ر نومبر ۱۹۸۳ء کو شروع ہو کر ۱ار دسمبر ۱۹۸۳ء پر ختم ہوا تھا، "کاروانِ زندگی" کا اس کے بعد رواں دواں رہنا اور سفرِ حیات کا تسلسل (صحت کی کیفیت، مختلف امراض او ضعف و انحطاط کے روز افزوں سلسلہ کو دیکھتے ہوئے) مشکوک نظر آرہا تھا، کتاب کی ضخامت بھی ۳۸۹ صفحات تک پہنچ چکی تھی، اس لئے قلم کو وہیں روک دینا پڑا۔

لیکن اس کے بعد بھی زندگی کی مہلت ملی اور اس چار سال کی مدت میں متعدد اہم سفر، ہندوستان اور عالم اسلام میں تاریخی اہمیت کے حامل واقعات، خصوصاً ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے عظیم آزمائش و امتحان کے مسائل پیش آئے جن سے راقم سطور کا براہ راست تعلق تھا، بیرون ہند ایسی تقریبات و اجتماعات میں بھی شرکت کے مواقع حاصل ہوئے، جن کی یادیں اور واقعات تاریخ کی

قابلِ حفاظت امانت، نوخیز و خورد سال اسلامی نسل کے لئے سبق آموز و معلومات خیز ذخیرہ ہے، اور اس سب سے مستقبل کے مورّخ کو اس عہد کی تاریخ کی ترتیب و تکمیل میں مدد ملے گی، اس لئے اس "کاغذی کشتی" کو "بسم اللہ مجریھا و مرساھا" کہہ کر پھر متحرک و رواں کرنا پڑا۔

شرق اردن اور یمن کا تاریخی سفر

راقم سطور کئی سال سے شرق اردن کے علمی و تحقیقی ادارے اور اکیڈمی مؤسّسۃ آل البیت کا رکن چلا آرہا تھا جس کو ولی عہد سلطنت ہاشمیہ عالی مرتبت امیر حسن بن طلال کی سرپرستی حاصل ہے، اور اس سے ان کو خصوصی دلچسپی اور ربط و تعلق ہے، اس کے سالانہ جلسوں (مؤتمرات) کے موقعہ پر ادارہ کا دعوت نامہ اور امیر حسن کی طرف سے ترغیب و تاکید کا خط آتا، لیکن ابھی تک مجھے اس دعوت کو قبول کرنے اور اس کے جلسوں میں شرکت کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی، اواخر مارچ یا اوائل اپریل ۸۴ء میں پھر اس کا دعوت نامہ اور تاکیدی خطوط آئے، اور اطلاع دی گئی کہ ۲۵ تا ۲۹ ر اپریل ۸۴ء کی تاریخوں میں عمّان میں اس کے اہم ترین شعبے "مجمع بحوث الحضارۃ الاسلامیۃ" (اسلامی تہذیب و تمدّن اکیڈمی) کی تیسری سالانہ کانفرنس منعقد ہوگی جس میں اسلامی تہذیب و تمدّن اور اس میں مختلف ممالک کے تاریخی کردار اور وہاں کے تحقیقاتی اور علمی کارناموں پر مقالات پڑھے جائیں گے اور تبادلۂ خیال ہوگا، مجھے بار بار معذرت کرنے سے شرم آئی، خاص طور پر عالی مرتبت امیر حسن کا لحاظ غالب آیا جنھوں نے شخصی طور پر

کئی مرتبہ یاد فرمایا، اور میری شرکت کی خواہش کا اظہار کیا تھا، میں نے اس مرتبہ عمّان جانے کا فیصلہ کرلیا اور مؤسسہ کے ذمہ داروں کو اس کی اطلاع دیدی اور وہاں پڑھنے کے لئے ایک مضمون بھی تیار کرلیا، جس کا تعلق ہندوستان میں اسلامی تمدّن وعلوم اور ان میں ہندوستانی مسلمانوں کی خدمات وخصوصیات سے تھا' اس مرتبہ اپنی رفاقت کے لئے خواہرزادۂ عزیز مولوی سید محمد واضح حسنی ندوی (استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مدیر خصوصی "الرائد") کا انتخاب کیا، جن سے مجھے وہاں کے مجالس، علماء ادباء سے ملاقاتوں اور علمی، ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال میں مدد ملنے کی امید تھی' اخباری نمائندوں کے لئے انٹرویو اور بیانات وغیرہ تیار کرنے میں بھی ان کے رواں اور شاداب قلم سے ہمیشہ مدد ملتی رہی ہے' اس مؤتمر یا سیمینار میں عالم عربی کی ممتاز علمی ادبی شخصیتوں کی (سفر کی سہولتوں اور ایک سلطنت کی سرپرستی کی وجہ سے) بڑی تعداد شریک ہوتی ہے' اور ایک جگہ بیک وقت مختلف مکاتبِ فکر کے نمائندوں ورہنماؤں اور علماء وادباء سے ملاقات میسر آجاتی ہے' میں نے اس سفر میں حجاز ویمن کی زیارت کا بھی ارادہ کرلیا، یمن کی دعوت پہلے سے آئی ہوئی تھی' اور حجاز کو عمرہ وزیارت کے شوق اور اس لئے بھی شامل کیا گیا کہ وہاں سے صنعاء کا سفر آسان ہوگا۔

عمّان میں

۲۳ / اپریل ۸۴ء کو دہلی سے (B. O. A. C.) کے طیارہ سے کویت روانگی ہوئی' وہاں ایک دن اپنے عزیزوں[1] کے پاس ٹھہر کر اور آرام کرکے اگلے دن

---

[1] کویت میں عزیزان سید ابراہیم حسنی ندوی اور سید احمد علی حسنی ندوی کے پاس ٹھہرنا ہوا۔

۲۴ر اپریل کو کویت کے طیارہ سے عمّان روانگی ہوئی، ملکہ عالیہ ہوائی اڈہ پر مؤسسہ کے نائب صدر فاروق جرّار (غالباً امیر حسن کے ایماء سے) استقبال کے لئے موجود تھے، عمّان کے متعدد مخلص احباب بھی نظر آئے، اس سے پہلے میرے عمّان کے تین سفر ہو چکے تھے جن کا ذکر "کاروانِ زندگی" کی پہلی دوسری جلدوں میں اپنے اپنے موقعہ پر آچکا ہے، والیٔ سلطنت ملک حسین اور ولی عہد سلطنت کے نامور دادا ملک عبد اللہ بن شریف حسین سے ۱۹۵۱ء میں بیت المقدس سے واپسی پر دو ملاقاتیں ہو چکی تھیں[۱]، اگست ۱۹۷۳ء میں شاہ حسین سے تفصیلی ملاقات ہوئی تھی، اور وہ بڑے اکرام سے پیش آئے تھے[۲]۔

ممتاز سیمنار

عمّان میں ہمارا (سیمنار کے دوسرے مہمانوں کے ساتھ) قیام دار السلطنت کے بڑے ہوٹل ریجنسی پالاس (REGENCY PALACE) میں ہوا جو بیس منزلہ ہوٹل ہے اور پہاڑ کی ایک چوٹی پر واقع ہے جہاں سے عمّان کا سارا شہر نظر آتا ہے، مؤتمر ۲۵ر اپریل ۱۹۸۴ء کو شروع ہوئی، ممتاز و مشہور اہلِ علم و ادب، علمی و تحقیقی کام کرنے والے بڑی تعداد میں شریک تھے، اس تیسری کانفرنس میں ۳۲ ممالک کے ۱۳۰ علماء و مفکرین نے حصہ لیا جن میں ماسکو سے بھی علماء کا ایک وفد آیا ہوا تھا جس کی قیادت وہاں کے مذہبی امور کے ذمہ دار مرحوم ضیاء الدین بابا خانوف کے فرزند شرف الدین بابا خانوف کر رہے تھے، مندوبین کے علاوہ مختلف

---

[۱] ملاحظہ ہو "کاروانِ زندگی" جلد اول ص ۳۸۶ [۲] "کاروانِ زندگی" حصہ دوم ص ۱۶۵-۱۶۶

ممالک کے سفراء، شاہی خاندان کے افراد اور دیگر ممتاز لوگ شریک تھے:

امیر حسن نے اپنی استقبالیہ تقریر میں خصوصیت کے ساتھ میرا نام لے کر میری آمد پر اپنی مسرت کا اظہار کیا، اور میں نے ان کے اس خصوصی تذکرہ اور اظہار مسرت و ممنونیت پر مناسب الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا، میں نے کہا کہ میں اُردن کو عالم اسلام کی آخری دفاعی لائن اور ایسا اہم اور نازک و حساس محاذ جنگ سمجھتا ہوں جس کا ہر مسلمان پر حق ہے، اسی احساس نے مجھے صحت کی کمزوری اور مشاغل کی کثرت کو نظر انداز کر کے اس سفر اور کانفرنس کی شرکت پر آمادہ کیا۔

ہندوستان میں مسلمان اور ان کا تاریخی کردار

اگرچہ میں اپنا مقالہ سکریٹریٹ کو پیش کر چکا تھا، لیکن امیر موصوف کی خواہش پر میں نے زبانی ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ایک مجمل خاکہ پیش کیا، مسلمانوں نے اس ملک کی خدمت کے ساتھ اپنی اسلامی شخصیت و ملی خصوصیات کی حفاظت جس طرح کی اس کا بھی ذکر کیا، عربی زبان اور اس کے علوم و ادب سے گہری دلچسپی و وابستگی اور اس کے عوامل و اسباب کی نشاندہی بھی کی جن میں عشق رسول ﷺ، حرمین شریفین سے قلبی تعلق، دینی غیرت و حمیت کو خاص مقام حاصل ہے، اس سلسلہ میں حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اس حکیمانہ وصیت کا حوالہ دیا کہ وہ اپنی اسلامیت کی حفاظت کے لئے حرمین شریفین سے ہمیشہ تعلق اور آمد و رفت رکھیں، اور عربی زبان، اس کے

قواعد و علوم و آداب و تعلیم و تعلّم کا اہتمام رکھیں، وہ اپنے رسالہ "المقالة الوضّية فی النصیحة والوَصیّة" میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"ہم پردیسی لوگ ہیں، ہمارے آباء و اجداد نے ہندوستان کی طرف ہجرت کی، نسب اور زبان کی عربیت ہمارے لئے سرمایۂ فخر ہے کہ یہی ہمارے لئے سیّد الاولین والآخرین افضل الانبیاء والمرسلین مفخر وجود صلے اللہ علیہ وسلم سے قرب کا ذریعہ ہے"!

آگے تحریر فرماتے ہیں :۔

"ہم میں خوش نصیب وہ ہے جس کو عربی زبان، اس کی صرف و نحو اور کتب ادب سے حصہ ملا ہو، اور اس کو حدیث و قرآن سے واقفیت ہو، ہمارے لئے حرمین شریفین کی حاضری اور ان کے ساتھ تعلق خاطر بھی ضروری ہے، یہی ہماری سعادت کا راز ہے، اور وہ کم نصیب اور محروم ہے، جو ان سے روگردانی کرتا ہے"!

ہندوستان کی مختلف پہلوؤں سے اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں والدِ ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کی عربی تصنیفات کا ذکر کیا جن میں سے ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کی تاریخ اور علمائے ہند کی تصنیفات کی ڈائرکٹری "الثقافة الاسلامية فی الهند" کے نام سے دمشق کی مشہور و موقر سرکاری اکیڈمی "المجمع العلمی العربی"[1] کی طرف سے شائع ہو چکی ہے، اور حال میں اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا ہے۔

---

[1] حال مجمع اللغة العربية دمشق۔

فلسطین اور بیت المقدس کے مسئلہ پر امیر حسن کی پُر از معلومات اور مدلل تقریر

اسلامی تہذیب و تمدن، اس کی خصوصیات، تاریخی کردار اور اس کے عروج و ارتقاء اور مظاہر و مراکز کی علمی بحثوں اور مقالات کے ساتھ فلسطین اور بیت المقدس کا مسئلہ اس کی بازیافت، استخلاص کے ذرائع و تدابیر پر بحث و فکر، پوری مؤتمر اور اس کی زیادہ تر نشستوں پر چھایا رہا، اور ایسا ہونا بیت المقدس کے جغرافیائی قُرب و ارتباط، شرق اردن کی اس کے بارے میں خصوصی ذمہ داری اور عرب علماء، زعماء کے اس عظیم اجتماع، پھر سب سے بڑھ کر اس وجہ سے کہ یہ مؤتمر رجب کے مہینہ میں ہو رہی تھی (جو اسراء و معراج کا مہینہ ہے، اور جس کی اولین منزل خود مسجد اقصیٰ تھی) بالکل قدرتی و طبعی امر بلکہ ایک دینی و اخلاقی فرض تھا، ۲۷ رجب کا پورا دن (جو معراج کی خاص تاریخ ہے) اسی مسئلہ کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔

امیر حسن نے خود اس بحث کا آغاز کیا، اس کے مختلف پہلوؤں، اس کے تاریخی پس منظر اور اسرائیل کی موجودگی سے عالم اسلام اور عالم عربی کے لئے جو پیچیدہ مسائل و خطرات پیدا ہوتے ہیں، ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی، انھوں نے ان نقشوں کی مدد سے جو خاص طور پر اس موقعہ کے لئے تیار کئے گئے تھے، ایسے اعداد و شمار پیش کئے جو اس مسئلہ سے تعلق رکھنے والے تمام ممالک اور دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے غور طلب اور قابل فکر و تشویش ہیں، یہ جلسہ ہوٹل کے قاعۃ الابتراء میں ہو رہا تھا، اور پورا مجمع گوش بر آواز اور

ولی عہدِ سلطنت کے گہرے مطالعہ اور وسیع معلومات سے متاثر تھا۔

لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف

میں نے امیرِ موصوف کی تقریر کے بعد کچھ کہنا ضروری سمجھا، میری تقریر کی روح اور خلاصہ یہ تھا کہ انسانی بالخصوص اسلامی تاریخ کی متواتر شہادتیں ہیں کہ اصل فیصلہ کن چیز ملّتوں اور قوموں کی تقدیر کو بدلنے والی حقیقت، ممالک کا سیاسی اور جنگی نقشہ یکسر تبدیل کرنے والی طاقت' اعداد و شمار، قلّت و کثرت کا تناسب اور تسلیم شدہ صورت حال نہیں ہوتی، اصل انقلاب انگیز طاقت اور ناممکن کو ممکن بنانے والی چیز اس ہستی کا وجود ہے جو عزم و ایمان کی خارق عادت طاقت سے سرشار، صورت حال کو یکسر تبدیل کر دینے کے لئے ہمہ تن تیار' اور اس کی راہ میں ہر طرح کی قربانی و جاں نثاری، خطر پسندی و مہم جوئی کے لئے مضطرو بیقرار ہو' تاریخ کی شہادت ہے کہ اس موقعہ پر یہ ٹھوس اعداد و شمار اور مشکلات اور مخالفتوں کے پہاڑ برف اور موم کی طرح پگھل کر پانی ہو جاتے ہیں' اور فتح کا آفتاب رات کے اندھیرے اور سردی کے کہر کو چیرتا اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہوا طلوع ہوتا ہے' یہی سلطان صلاح الدین ایوبی کی سرگزشت اور جنگ صلیبی کی تاریخ کا خلاصہ ہے' اقبال نے اسی حقیقت کو اپنے خاص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی — اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ نکتہ فاش — لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف

الحمد للہ اس تقریر نے دلوں کو گرما دیا اور بہت سی آنکھیں اشکبار دیکھی گئیں۔

عمّان کی مصروفیتیں اور خطابات

اردن میں ۸ دن کا قیام رہا، رجب کا مہینہ ہونے کی وجہ سے تقریروں کا زیادہ تر موضوع اسراء و معراج، اس کے مضمر معانی و لطائف اور اسکے دوررس مقاصد و نتائج تھے، یہ تقریریں بنی اسرائیل سے اسلام قبول کرنے والے عربوں کی طرف انسانیت کی امامت و قیادت اور منصبِ ہدایت کی منتقلی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اُمّتوں کے امام اور نبیِّ آخر الزماں ہونے کے اعلان، اور اس سلسلہ میں اس خیرِ اُمّت کے منصب و مقام کی طرف واضح اشارات پر مشتمل ہوتی تھیں، خاص ۲۷ رجب کو اس موضوع پر ایک مفصل تقریر، زرقاء (اردن) کی مسجد سیدنا عمر بن الخطابؓ میں ہوئی، جس میں "شبِ معراج" کی خصوصیت کی وجہ سے سامعین کی بڑی تعداد تھی، اور وسیع جامع مسجد میں گنجائش نہیں رہی تھی، باہر بھی دور تک لوگ کھڑے تھے۔

دوسری تقریر ۲۹ رجب کو اِربد کی جامعۃ الیرموک[1] (YARMOOK UNIVERSITY) کے ہال میں ہوئی، جس میں یرموک کی فیصلہ کن جنگ کا

---

[1] میدان یرموک اس قدیم تاریخی شہر کے سامنے ہے، قریبی مقام اُمّ قیس پر کھڑے ہوکر دریائے یرموک اور گولان کی پہاڑیاں صاف نظر آتی ہیں، اسی مناسبت سے اس کا نام جامعۃ الیرموک رکھا گیا ہے۔

تذکرہ کرتے ہوئے اس سے سبق لینے اور اس امتیازی اسلامی وایمانی تشخص کو پیدا کرنے کی دعوت دی گئی جو تمام اسلامی فتوحات اور کامیابیوں کا اصل راز تھا، اس سلسلہ میں مقرر نے بتایا کہ آج بھی برِ صغیر ہند کے مسلمانوں کو ان تاریخی مقامات اور اسلامی جنگوں اور ان کے میدانوں سے کیسا تعلق ہے، میں نے کہا کہ میں جب ۱۹۵۶ء میں دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر شام گیا تو میرے محترم دوست اور مشہور عرب فاضل اور دینی قائد کلیۃ الشریعۃ کے عمید (پرنسپل) ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی مرحوم نے مجھے یونیورسٹی کا مہمان بنا کر دمشق کے اس ہوٹل میں ٹھہرایا جس کا نام "فندق الیرموك" ہے، میں نے ہندوستان کے مشہور عالم ومصنف مولانا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کو (جن کا میں استاد کی طرح احترام کرتا تھا) اسی ہوٹل سے خط لکھا خط کے سرنامہ پر "فندق الیرموك" لکھا تھا، مولانا کو نہیں معلوم تھا کہ یہ ہوٹل یرموک کی رزم گاہ سے سیکڑوں میل دور دمشق کے شہر میں واقع ہے، لیکن ان پر یرموک کا نام دیکھتے ہی وجد کی ایک کیفیت طاری ہوگئی، اس وقت وہ وجع الفواد (انجائنا) کے مریض تھے، اور پٹنہ کے ایک اسپتال میں داخل تھے، انھوں نے میرے خط کے جواب میں جو لکھا اس کا ایک حصہ سناتا ہوں:-

"خدا ہی جانتا ہے کہ الیرموک کی موجوں نے کن دبے دبائے تاریخی محفوظات اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات میں طوفانی ہلچل برپا کردی، صرف الیرموک کے لفظ پر نظر پڑتے ہی تخیل کو آپ کے مشاہدے

جو تھوڑا بہت سہارا ملا تو گھنٹوں پر موک اور جو کچھ اس کے ساحل
پر گزرا اسی میں غرق ہو گیا۔"[1]

کانفرنس کے اختتام پر ۳۰ راپریل کو میں اپنے رفیق عزیز کے ساتھ دارالبشر کے مہمان خانہ میں منتقل ہو گیا۔

آخری تقریر یکم شعبان کو عمّان کی مشہور کُلّیۃُ العلوم العربیۃ میں ہوئی جس میں ہزاروں کی تعداد میں طلبا زیر تعلیم ہیں اور اس پر یونیورسٹی کا دھوکہ ہوتا ہے، تقریر میں معراج نبوی کے واقعہ سے روشنی حاصل کرتے ہوئے ملت وافراد کی اسلامی شخصیت کی خصوصیات کو برقرار رکھنے اور اس معنوی طاقت کو دوبارہ بروئے کار لانے کی دعوت دی گئی جس نے روم وایران کی ترقی یافتہ تہذیب اور مادی ترقی کے نقطۂ عروج پر پہونچے ہوئے معاشرہ پر فتح حاصل کی اور ایک نئے عہد اور نئی دنیا کی بنیاد رکھی، کلیۃ العلوم کی طرف سے مقرر کو "قبّۃ الصخرۃ" (مسجد اقصیٰ) کا خوبصورت مرمری ڈھانچہ تحفہ اور یادگار کے طور پر پیش کیا گیا۔

اصحابِ کہف کا غار

مؤتمر کے بعد دو روز قیام رہا، عمّان کے اس قیام میں ڈاکٹر رفیق وفا الدجانی کی معیت ورہبری میں (جو محکمۂ آثار قدیمہ کے ماہر فن اور ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں) جبل رجیب پر اہلِ کہف کے غار کی زیارت کی جو کہف الرجیب

---

[1] "پرانے چراغ" حصہ اول ص ۱۹

کے نام سے مشہور ہے، یہ عمّان کے جنوب مشرق میں ۸ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، ڈاکٹر رفیق وفا دجّانی کی تحقیق یہ ہے کہ اہل کہف کا یہی وہ غار تھا، جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے، ہم لوگ اس غار میں اترے اور اس کو ایک ماہرِ فن اور محقّق کی رہبری میں تفصیل سے دیکھا، قرآن مجید کی آیات میں اس کی جو صفت اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں، وہ اس پر منطبق معلوم ہوئیں، ڈاکٹر رفیق نے دوسرے تاریخی قرائن و آثار اور شواہد و دلائل سے اس کو ثابت کیا، کھدائی میں جو تختیاں نکلی ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، ان میں کہف کا نام "کہف الرقیم" لکھا ہے، مختلف اسلامی عہد کے کتبے بھی ملے جن پر سنین ثبت تھے، اس غار میں اب بھی ۸ قبریں پائی جاتی ہیں، مسلمان مؤرخین میں سے مقدسی، البیرونی، یاقوت کا بھی یہی خیال ہے کہ یہی اصحاب کہف کا غار ہے، فرانسیسی مستشرق "گالو" بھی اس کی تائید کرتا ہے[۱]۔

---

[۱] ملاحظہ ہو رفیق دجّانی کی کتاب "کہف اهل الکهف" جو انھوں نے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے طور پر یونیورسٹی کو پیش کیا تھا، اس میں ثابت کیا ہے کہ کہف کی جگہ شہر افسس نہ تھا، جو اناطولیہ کے شہروں میں سے ایک ہے، اور وہ ترکی کے موجودہ شہر ازمیر سے ساٹھ کلومیٹر کی مسافت پر ہے، (اور جس کو مصنّف نے بھی اپنی کتاب "الصراع بین الایمان والمادیة" میں اختیار کیا ہے) بلکہ عمّان میں واقع یہ مقام ہے، انھوں نے اس کے لئے ناقابل تردید تاریخی واثری دلائل دیئے ہیں، اور اس کی صحت کے قرائن و آثار بتائے ہیں، یہ بات بعید از قیاس نہیں، کیونکہ موجودہ مشرق اردن رومی مملکت کا ایک حصہ تھا، اور اس کا قدیم نام فلاڈلفیا تھا، (جس پر امریکہ کے شہر فلاڈلفیا کا نام رکھا گیا)

عمّان کے احباب اور مجالس

اس ہشت روزہ قیام میں زیادہ تر اپنے قدیم فاضل عرب دوست اور صاحبِ قلم استاذ محمد ابراہیم شقرہ کے ساتھ وقت گذرتا تھا جو ۱۹۷۵ء کے ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ اجلاس میں عمّان سے شرکت کے لئے آئے تھے، اور انھوں نے اس کی مجلسِ مضامین اور تجاویز وغیرہ کی ترتیب میں خصوصی حصہ لیا تھا، وہ وزارت اوقاف میں مدیر شئون القدس کے عہدہ پر متعیّن ہیں، اجلاس میں شرکت اور شہر میں نقل و حرکت میں وہ ہمیشہ ہم دونوں کے ساتھ رہتے تھے، دوسرے نمبر پر اپنی متعدد کتابوں کے عرب ناشر مؤسسۃ الرسالۃ اور دار البشیر کے مالک استاد رضوان دعبول کے ساتھ وقت گذرا، جنھوں نے عمّان میں ایک تحقیقی مرکز بھی قائم کر رکھا ہے، جس کے ذمہ دار ایک محقّق عالم الشیخ شعیب ارناؤوط ہیں، ان دونوں حضرات کے علاوہ اپنے قدیم اخوانی دوست عبدالرحمٰن خلیفہ کی وجہ سے جو اخوان کے قائد و ذمہ دار رہے ہیں، سفر میں مطلق اجنبیّت اور بیگانگی محسوس نہیں ہوئی۔

مجمع البحوث کے علاوہ جمعہ کو مسجد صلاح الدین میں (جس میں شیخ محمد ابراہیم شقرہ امام ہیں) بعد نماز جمعہ خطاب ہوا جس میں مجاہد اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی کی ذات اور خصوصیات موضوع تھا، مسجد کی نسبت، حالات کے تقاضے اور اس محبوب نام کے اثر سے تقریر میں جوش اور مضامین کی آمد تھی۔

عمّان میں تبلیغی مرکز میں بھی جماعت کے افراد اور اس طریقہ پر کام

کرنے والوں سے خطاب ہوا، اور ان سے ان کے وطن اور ماحول اور زمان و عہد کے لحاظ سے کچھ باتیں کہی گئیں۔

اس تقریر میں اذکار و نوافل کے ساتھ اخلاق و معاملات کی اہمیت پر زور دیا گیا، اور دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کی انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کی نشاندہی کی گئی، اسی کے ساتھ دعوتی کام کرنے والوں کو مطالعہ کا مشورہ بھی دیا گیا اور کہا گیا کہ داعیانِ دین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ماحول اور اپنے زمانہ سے واقف ہوں، زمانہ کی ضروریات، مقتضیات اور خطرات پر نگاہ ہونی چاہیئے، ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ زمانہ کے فکری و سماجی رجحانات کیا ہیں؟ کس طرح کی تحریکیں چل رہی ہیں؟ اور اسلام اور مسلمانوں کو کس کس طرف سے خطرات کا سامنا ہے، اس کے بغیر وہ نہ تو زندگی و معاشرہ میں مؤثر ہو سکتے ہیں، نہ دین کی مؤثر خدمت انجام دے سکتے ہیں، بقول اقبالؔ ؎

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زُجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

عمّان کے معززین اور اعیان میں استاد کامل الشّریف (جو اصلاً فلسطینی ہیں) راقم کے پرانے دوستوں میں ہیں، وہ عرصہ تک شرق اردن کے سفیر رہے، رابطۂ عالم اسلامی (مکہ معظمہ) کے شروع سے رکن ہیں، انھوں نے اپنے گھر پہ ایک خصوصی نشست رکھی، جس میں ہمارے قدیم کرم فرما ڈاکٹر اسحٰق فرحان (سابق وزیر اوقاف و وزیر تعلیم شرق اردن) عربی کے مشہور ادیب و شاعر استاد عمر بہاء الامیری (سابق سفیر شام) ابراہیم شنقرہ، کمال ابو المجد اور دوسرے

ممتاز حضرات تھے، گفتگو کا مرکزی موضوع تحریک اسلامی کے تجربوں کا جائزہ، اور حکام کے ساتھ موقف کا تعیّن تھا، اس سلسلہ میں عمر بہاء الامیری کا موقف یہ تھا کہ حکام کے ساتھ بہتر تعلق اور افہام و تفہیم کی کوشش بہتر نتائج پیدا کر سکتی ہے، استاد رضوان دعبول کے مکان پر بھی علماء اور ممتاز لوگوں سے کھانے پر ملاقات ہوئی۔

کانفرنس کے شرکاء اور اپنے قدیم ملاقاتیوں میں مغرب کے مشہور فاضل مہدی بن عبّود، ابوظبی کے رئیس القضاۃ شیخ احمد بن عبد العزیز المبارک، شام کے (حال مقیم رباط) عربی کے مشہور شاعر اور سابق سفیر شام متعینہ پاکستان وسعودی عرب عمر بہاء الامیری اور مشہور مصری فاضل ڈاکٹر یوسف القرضاوی (عمید کلیۃ الشریعۃ قطر) اور مشہور اخوانی مصنّف اور داعی شیخ محمد الغزالی سے خاص طور پر ملاقاتیں اور مجلسیں رہیں۔

ولی عہد کی ایک دعوت میں بھی شرکت کا موقعہ ملا، اس دعوت میں عمّان (مسقط) کے مفتی حمد الخلیلی بھی موجود تھے، جنھوں نے امیر کے سامنے میری کتاب "روائع اقبال" کے صفحے کے صفحے زبانی سنانے شروع کیے۔

۲ مئی کو مقامی وقت کے مطابق تقریباً ۲ بجے دوپہر میں ہوائی اڈہ کے لئے روانہ ہوئے، متعدد احباب پہونچانے آئے، مؤسسہ کے صدر ڈاکٹر ناصر الدین الاسد (غالباً عالی مرتبت امیر حسن کے ایماء و خواہش پر) رخصت کرنے کے لئے خود موجود تھے، انھوں نے غرفۂ ملکیۃ (شاہی کمرہ) میں بٹھایا، اور اسی راستہ سے طیارہ تک پہونچایا، عمّان سے سعودی طیارہ پر روانہ ہو کر

اسی روز شام کو جدّہ پہونچے، ڈاکٹر مختار الدین صاحب آرزو (سابق صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو سیمنار میں شرکت کے لئے ہندوستان سے ساتھ ہی آئے تھے) بھی ہم سفر تھے، جو حجاز سے ہندوستان واپس ہوئے۔

حجازِ مقدس میں

۲ مئی ۱۹۸۲ء کو عمان سے روانہ ہو کر اسی روز شام کو جدّہ پہونچ گئے، پہلے سے مدینہ طیبہ سے احرام باندھنے کی نیت کرلی تھی، اور ابتداءً وہیں حاضری کا ارادہ تھا، اس لئے بغیر احرام کے یہ سفر کیا گیا، اپنے قدیم معمول کے مطابق جدّہ میں ہات نورولی صاحب کے یہاں قیام کیا[1]، ۳ مئی کی صبح کو برادر عزیز سید حسن طارق صاحب کی معیت میں (جو مدینہ طیبہ میں ٹیلیفون کے محکمہ میں انجینیر ہیں) مدینہ طیبہ کے لئے روانگی ہوگئی، وہاں چار دن قیام رہا، مقصد صرف حاضری، درود وسلام اور مسجد نبوی تھی، اس لئے وہاں کوئی پروگرام نہیں رکھا گیا، قیام گاہ ہی پر جامعہ اسلامیہ کے اساتذہ اور مدینہ طیبہ کے علماء و احباب تشریف لاتے رہے۔

یمن کے سفر کے بارے میں تاخیر، موسم کی سختی، اور اس وجہ سے کہ اصل دعوت

---

[1] عبد الغنی محمد نورولی کے نام سے جدہ میں مشہور فرم ہے جس کا مالک ایک قدیم ہندوستانی دیندار خاندان ہے جو تقریباً ایک صدی قبل پٹن (گجرات) سے یہاں منتقل ہوا، اور نورولی کے نام سے مشہور ہے، اس وقت اس خاندان کے ذمہ دار فرد اور فرم کے مالک الحاج محمد نور عبد القادر نورولی ہیں، ۶۲ء سے جدہ اور مدینہ طیبہ میں انھیں کے یہاں قیام رہتا ہے، ان کے برادر عم زاد محمد ولی عبد اللہ نورولی بھی خاص تعلق رکھتے ہیں۔

مکتبۃ التوجیہ والإرشاد (الهیئۃ العامۃ للمعاهد العلمیۃ) اور اتحاد طلاب الیمن یمن کے طلبہ کے وفاق (فیڈریشن) کی طرف سے تھی، اور یہ زمانہ شاید مدارس کے امتحانات کا ہو، یمن کے سفر کے بارہ میں بڑا تردد پیدا ہو گیا تھا، اور اس کو ملتوی کر دینے کا ارادہ غالب تھا، لیکن جامعہ اسلامیہ کے ایک ممتاز استاد عبداللہ قادری صاحب نے جو اصلاً یمن ہی کے ہیں، اور ان کے وہاں کے ذمہ داروں اور جمعیات کے عہدہ داروں سے خصوصی تعلقات ہیں، سفر پر زور دیا اور کہا کہ نہ موسم گرم ہو گا، اور نہ طلبہ کے امتحانات اس سفر کے لئے کوئی مانع ہے، انھوں نے سفر کے انتظامات کی ذمہ داری لی اور صنعاء سے براہ راست رابطہ قائم کیا، جدہ میں جمعیۃ اتحاد الطلبۃ کے نمائندوں نے بھی اس معاملہ میں تعاون کیا، اور سفر کا عزم کر لیا گیا۔

رابطۂ ادب اسلامی کا قیام

مدینہ طیبہ سے ۷، مئی کو جدہ واپسی ہوئی، مکۂ مکرمہ جا کر عمرہ کیا، وہاں عربی ادب کے ممتاز علماء کا ایک وفد آ کر ملا، یہ وفد ریاض کی امام محمد بن سعود یونیورسٹی اور مدینہ یونیورسٹی کے اساتذہ ڈاکٹر عبدالباسط بدر استاد حید بدر اور ڈاکٹر عبدالقدوس ابو صالح پر مشتمل تھا، یہ حضرات ریاض اور مدینہ سے خاص غرض سے مکہ مکرمہ آئے تھے، انھوں نے رابطہ ادب اسلامی کے اغراض و مقاصد بیان کئے اور اس کے آئین کا مسودہ پیش کیا اور مجھ سے اس کی سربراہی قبول کرنے اور اس رابطہ کو ایک بین الاقوامی تنظیم

کی حیثیت سے قائم کرنے کی اجازت دینے کی خواہش کی[1]، یہ بھی طے پایا کہ عرب دانشوروں کی ایک کمیٹی بنا دی جائے، اور مراکش اور الجزائر سے لے کر خلیج کی ریاستوں کے ادباء اور اہلِ قلم کو شرکت و رکنیت کی دعوت دی جائے، اور آئندہ سال اس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہو، اس کا صدر دفتر ندوۃ العلماء ہی میں رہے گا، اور عزیزی مولوی محمد رابع ندوی عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ اس کے جنرل سکریٹری ہوں گے۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی وفات کی اطلاع

۱۰ رشعبان ۱۴۰۴ھ (۱۲ رمئی ۱۹۸۴ء) کو ہم لوگ جدہ میں نور ولی صاحب کے مکان پر

---

[1] اس رابطہ کے قیام کے اصل محرک و داعی امام محمد بن سعود یونیورسٹی کے شعبۂ ادب کے صدر ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الباشا تھے، جنھوں نے ادباء کی ایک مجلس میں پہلی ملاقات کے موقعہ پر کئی سال پہلے ریاض میں مجھ سے یہ کہا تھا کہ ادب اسلامی کے نقطۂ نظر سے اور ادب عربی میں اسلامی عناصر کو تلاش اور اُجاگر کرنے کے لئے ادب عربی اور عربی زبان کے اسلامی کتب خانہ کو دوبارہ کھنگالنے اور اس کا ازسرنو جائزہ لینے کا خیال سب سے پہلے آپ کی کتاب "مختارات" کے مقدمہ اور اس مضمون سے پیدا ہوا، جو آپ نے المجمع العلمی العربی، دمشق کا رکن منتخب ہونے پر ۱۹۵۶ء میں لکھا تھا، اور وہ "المجمع" کے سہ ماہی رسالہ میں شائع ہوا تھا، ڈاکٹر پاشا نے خود سالہا سال سے اسی لائن پر کام شروع کر رکھا تھا، اور کئی مجموعے مرتب کر کے شائع کر چکے تھے، اسی نقطۂ نظر سے وہ اپنے طلبہ کو ڈاکٹریٹ کے مقالوں کی تیاری کے لئے مشورہ دیتے تھے، اس طرح بالواسطہ اور بلاواسطہ ادب اسلامی کا ایک ذخیرہ منظر عام پر آ گیا، ادبائے عرب کی یہ وسیع النظری اور فراخ دلی کی دلیل ہے (جو ان کا قومی اور نسلی خاصہ ہے) کہ انھوں نے اس رابطہ کی صدارت کے لئے ایک عجمی ہندی نژاد خادم دین و ادب کا انتخاب کیا۔

بیٹھے ہوئے تھے کہ حافظ کرامت اللہ صاحب[1] کا دہلی سے فون آیا کہ مفتی عتیق الرحمن صاحب کا انتقال ہو گیا، اور فلاں وقت تدفین ہے، مفتی صاحب اگرچہ آخر فروری ۱۹۸۲ء سے علیل تھے، ۲۴ فروری ۱۹۸۲ء کو دار المصنفین کے "اسلام اور مستشرقین" پر ہونے والے سیمنار سے واپس ہوتے ہوئے راستہ میں ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا جس سے وہ صحت یاب نہیں ہوئے، بالآخر وہ حادثہ پیش آگیا جس کا عرصہ سے خطرہ تھا، لیکن فرطِ تعلق سے ایسا معلوم ہوا کہ یہ حادثہ اچانک اور ناگہانی طور پر پیش آیا ہے، معاصر علماء، ملت کے قائدین، دینی اداروں اور مسلمانوں کی بزم ملی کے اراکین بلکہ اساطین میں سے کسی سے شاید ایسا تعلق و اُنس نہ رہا ہو گا، جیسا مفتی صاحب مرحوم سے تھا "کاروانِ زندگی" میں مجلس مشاورت، کے دوروں کے سلسلہ میں تعاون، سفروں میں رفاقت اور اتحادِ فکر و خیال کی طویل داستان "کاروانِ زندگی" جلد دوم میں پڑھی جا سکتی ہے[2] اطلاع کا قلب و دماغ پر بڑا اثر پڑا اور میں نے احباب خاص سے اسی وقت استدعا کی کہ وہ مفتی صاحب کی نیت سے عمرہ و طواف کر کے ان کی روح کو ثواب پہونچائیں، اسی وقت کئی دوست جو اہلِ دین و صلاح اور ہندوستان کی ملتِ اسلامی کا درد رکھنے والے تھے، مکہ معظمہ روانہ ہو گئے، میں نے جدہ ریڈیو سے مفتی صاحب کے بارہ میں ایک تقریر اردو میں نشر کی جس میں ان کی ملی خدمات اور ان کی خداداد خصوصیات و کمالات کا ذکر کیا اور بتایا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں ان کی وفات سے قیادت و رہنمائی کا

---

[1] حافظ کرامت صاحب، دہلی کے بڑے ٹھیکیداروں میں ہیں اسی کے ساتھ دیندار، تبلیغی جماعت اور تبلیغی مرکز سے خاص تعلق رکھنے والے ہیں، مرکز کے قریب ہی نظام الدین ویسٹ میں ان کی کوٹھی ہے، اور راقم سطور کا ادھر کئی برسوں سے دہلی میں انھیں کے یہاں قیام رہتا ہے، [2] "کاروانِ زندگی" جلد دوم ص ۹۱-۱۰۵

کیسا خلا پیدا ہوگیا ہے، یہ بھی مفتی صاحب کی مقبولیت کے آثار میں سے ہے کہ جب وہ ناگزیر مرحلہ پیش آیا جو سب کو پیش آتا ہے، تو ان کا ایک محب و مخلص قدرداں اور خوردرفیق کار اس سرزمین مقدس پر تھا، اور اس کو ان کے دوستوں اور کثیر التعداد نیازمندوں کو ان کے لئے دعا و ایصال ثواب کی طرف توجہ دلانے کی توفیق ہوئی۔

ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔[1]

یمن کا سفر

یمن سے تعلق اور اس ارض علم و ایمان اور سرزمین رنگ و بو کو دیکھنے کا اشتیاق تو ہر مسلمان کو ان امتیازی اوصاف اور تعریف کی بنا پر ہونا قدرتی ہے جو زبانِ نبوت سے اہلِ یمن کی شان میں ان الفاظ میں آئی ہے "أتاكم أهل اليمن أرق أفئدة وألين قلوبًا الإيمان يمان والحكمة يمانية"[2] (تمہارے یہاں اہلِ یمن آئے ہیں، بڑے رقیق القلب، نرم دل ہیں، ایمان یمن کا حصہ ہے، دین کی سمجھ اور حکمت یمن کی خصوصیت ہے) لیکن میرے لئے ذاتی طور پر ایک اور محرک تھا، وہ یہ کہ میری عربی زبان و ادب کی تعلیم اور اس کا ذوق یکسر شیخ خلیل بن محمد بن حسین یمانی[3] کا رہینِ منت ہے، ان کو یمنی خصائص کا ایک بڑا حصہ وراثت میں ملا تھا،

---

[1] مفتی صاحب پر راقم کا مفصل مضمون "برہان" کے یادگاری نمبر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

[2] یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں (کتاب المغازی) بخاری ہی کی دوسری روایت میں "والفقه يمان والحكمة يمانية" کے الفاظ بھی آئے ہیں (صحیح بخاری جلد ۲) [3] تفصیلی تعارف اور ان کے خصائص و کمالات معلوم کرنے کے لئے "پرانے چراغ" جلد اول کا مضمون ملاحظہ ہو جو ان کے بارہ میں ہے (ص ۲۰۷-۲۲۸)

اوران کے رگ وپے میں ساری وجاری، ان کی صحبت میں یمن سے گرویدگی اور اس کے دیکھنے کا اشتیاق پیدا نہ ہونا محلِّ تعجب تھا، اس کے ساتھ میری سندِ حدیث جو مجھے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ شاگرد رشید امام حدیث اور خاتم المحدثین شیخ حسین بن محسن یمانی بھوپالی سے حاصل ہوئی، اس کے ابتدائی شیوخ و وسائط سب یمنی ہیں لیکن تقدیری بات ہے، اور ایک طرح سے موجبِ حیرت کہ عالمِ عربی کے اکثر بلاد وامصار (خلیج سے لے کر الجزائر اور رباط و مراکش تک) کی سیاحت وسفر کا موقعہ ملا اور اکثر بلاد میں ایک سے زائد بار جانا ہوا لیکن ابھی تک یمن کے سفر کی نوبت نہیں آئی تھی، ۱۹۷۶ء میں یمن آنے کی دعوت ملی تھی، اور ٹکٹ بھی بھیج گئے تھے، لیکن ویزا میں تاخیر ہوگئی اور وہاں کا سفر ملتوی کر کے آگے کا پروگرام (ابوظبی وغیرہ کا) مکمل کر لیا گیا" الأمور مرهونة بأوقاتها" کی مثل جیسے صدیوں پہلے صادق تھی آج بھی ایک حقیقت ہے، میری عربی تصنیفات یمن میں پہونچ چکی تھیں، اور بعض نصاب میں داخل ہیں، وہاں کے علماء و مصنفین ان سے مانوس تھے۔

سفر کے بڑے محرک اور اولین داعی ایک فاضل یمنی نوجوان احمد عبدہ ناشر تھے، جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے فاضل ہیں، اور اس وقت یمن کے مکتبۃ التوجیہ والارشاد (قومی تربیت کا محکمہ) کے منیجر ہیں، شمالی یمن کی حکومت نے بھی جس میں اس وقت دینی رجحان کے لوگ غالب ہیں، اس سفر سے خاص دلچسپی لی اور تعاون کیا، وہاں جا کر یہ دیکھ کر تعجب ہوا، کہ حکومت نے ایسے خصوصی اعتماد کا اظہار کیا، جو ابھی تک کسی اسلامی مملکت یا کسی عرب ملک نے نہیں کیا تھا، اور ایسے مرکزوں میں تقریر کی اجازت دی جہاں باہر کے لوگوں کو آزادی سے جانے اور دیکھنے کا بھی موقعہ نہیں دیا جاتا ہے، اس میں وہاں کے ان بعض علماء، قضاۃ اور صدور کا بھی

بڑا دخل تھا جن کا عوام اور اہلِ حکومت دونوں کی نظر میں احترام ہے، اور صدر جمہوریہ و وزیر اعظم سے لے کر عام محکّام وارکان پارلیمنٹ سب ان کو مخلص، بلند پایہ عالم اور ملک و وطن کا سچّا خیر خواہ اور قابلِ اعتماد مشیر سمجھتے ہیں، اس سب کا بیان اپنی اپنی جگہ پر آئے گا۔

صنعاء میں

۱۴ر مئی کو صبح ۱ بجے جدّہ سے سعودی ایر لائنس کے طیارہ سے روانگی ہوئی، طالب علمی کے زمانہ میں حماسہ کا ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کا پہلا مصرعہ تھا۔ ع

لا بُدَّ من صنعاء وإن طال السفر[۱]

اب طیارہ کے سفر نے اس کو گھنٹوں کی بات کر دی ہے، سوا گھنٹہ کے بعد ہم صنعاء ایرپورٹ پہونچ گئے، ہوائی اڈہ پر احمد عبدہ ناشر، شیخ محمد المؤید (مدیر الدعوة والارشاد) یمن اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نمائندے اور دوسرے ممتاز اصحاب موجود تھے۔

اقبال نے قرطبہ میں کہا تھا ؎

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اب ہم خود یمن پہونچ گئے تھے، طبیعت میں ایک انشراح اور سُرور محسوس ہو رہا تھا، مطار پر آنے والے حضرات قانونی کارروائیاں مکمل کرنے کے بعد

---

[۱] صنعاء جانا ضروری ہے چاہے سفر کتنا طول طویل ہو۔

ہمیں شہر کی طرف لے چلے، ایک پرانے طرز کے محلہ میں جہاں معمولی قسم کے مکانات تھے انھوں نے موٹر روکی، مجھے تعجب ہوا کہ عام طور پر مہمانوں کو شہر کے کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہرایا جاتا ہے، یا کسی معزز آدمی کا مہمان بنایا جاتا ہے جس مکان میں وہ لے گئے اس میں بکریاں بندھی ہوئی تھیں، خیال ہوا کہ کیا یہیں ٹھہرنا ہوگا؟ دروازہ کھلا اور قدیم علماء کا نمونہ ایک صاحب نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں خوش آمدید کہا، انھوں نے دین کی دعوت دینے والی اور اس کے غلبہ کی کوشش کرنے والی جماعتوں پر تبصرہ کیا اور کہا کہ دو طریق کار ہیں، ایک یہ کہ اہلِ ایمان (حکومت کی) کرسیوں تک خود پہونچ جائیں (یعنی ان کو براہ راست اقتدار حاصل ہو جائے) دوسرے یہ کہ ایمان ان کرسیوں تک پہونچ جائے (یعنی اہل حکومت دین کی دعوت قبول کرلیں اور اس کی ترویج و تنفیذ کا خود ذمہ لے لیں) انھوں نے فرمایا کہ میں آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے سمجھا ہوں کہ آپ اس دوسرے طریق کار ہی کو ترجیح دیتے ہیں، میں نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ ہمارے یہاں برِ صغیر ہند میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی (م ۱۰۳۴ھ) نے یہی طریق کار اختیار کیا تھا، اور اس کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ ہمارے علم میں عالمِ اسلام میں کسی انقلابی و اصلاحی تحریک کو حاصل نہیں ہوئی، پھر انھوں نے شمالی یمن کی موجودہ صورتِ حال کام کے امکانات اور تقاضوں پر مختصر تبصرہ کیا، اس کے بعد مجلس برخواست ہوئی، اور ہم لوگ ان سے رخصت ہوئے، معلوم ہوا کہ ان کا نام شیخ یٰسین عبدالعزیز ہے، اور وہ ایک عالم و مخلص داعی ہیں، ہمارے رفقاء نے بتایا کہ ہم کو اپنی جائے قیام پر پہونچنے سے پہلے یہاں اس لئے لایا گیا تاکہ ہم

ملک کی صورت حال سے واقف ہوجائیں، اور یہاں کے قیام میں اس سے فائدہ اٹھائیں، ہمیں ان کی یہ جدّت بہت پسند آئی، اور اس میں "الحکمۃُ یمانیۃٌ" کا پَرتَو نظر آیا۔

یہاں سے وہ ہمیں سیدھے ہوٹل فندق الحمد السیاحی لے گئے، جو کسی زمانہ میں امیر علی کا محل تھا، بعد میں اسی ہوٹل کے احاطہ میں ہماری سہولت کے پیش نظر ایک (VILLA) نما چھوٹی سی عمارت میں ہمیں منتقل کر دیا گیا، جہاں موٹر دروازہ تک آجاتی تھی، یمن میں ہمارے پروگراموں کی ترتیب اور اس سفر و قیام سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا نقشہ بنانے، اس کے لئے بہتر سے بہتر مواقع فراہم کرنے، اور ذمہ دارانِ حکومت سے ملانے اور ان سے آزادانہ تبادلۂ خیال کا موقعہ فراہم کرنے میں جن لوگوں کا خاص طور پر دخل تھا اور ان کی رہنمائی تھی، ان میں یمن کے مدارس و معاہد کی ہیئت عام (الهيئة العامة للمعاهد العلمية) کے صدر شیخ یحیی الفسیّل، اور القاضی الارشی تھے، جو سابق صدر جمہوریہ حال نائب صدر جمہوریہ اور مجلس الشعب کے صدر ہیں، آخر الذکر یمن کی بڑی محترم و معتمد علیہ شخصیت ہیں، جن کا علم و صلاح اور اخلاص عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، ان کے بعد پارلیمنٹ کے ایک ممبر حمود ہاشم الذارجی اور صنعاء یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبد العزیز المقالح کا نمبر ہے۔

صنعاء یونیورسٹی میں تقریر

پہونچنے کے دوسرے ہی روز (۱۴ رشعبان ۱۴۰۴ھ، ۱۵ رمئی ۱۹۸۴ء) صنعاء یونیورسٹی میں تقریر کا پروگرام تھا، ہم ہال میں پہونچے، تو دیکھا کہ طلبہ اور صنعاء کے

تعلیم یافتہ حضرات سے ہال بھرا ہوا ہے، جن کو کرسیوں پر جگہ نہیں ملی تھی، وہ فرش پر بیٹھے تھے، باہر کا میدان بھی سامعین سے پُر تھا، یمن میں میری تقریر کا پہلا موقعہ تھا، مجھے محسوس ہوا کہ طبیعت کھُلی ہوئی ہے اور مضامین کی آمد اور خیالات کا جوش ہے۔

میں نے اپنے اس دلی تأثر و مسرّت کا اظہار کرتے ہوئے تقریر یہاں سے شروع کی کہ آپ لوگ دنیا کے اس مشہور آبشار سے واقف ہیں، جو کنیڈا کے مشہور شہر ٹورنٹو (TORONTO) کے قریب اور NIAGARA FALLS کے نام سے مشہور ہے، اور دنیا کے سات عجائبات میں اس کا شمار ہے، میں نے خود اس کو دیکھا ہے، وہ ایک سو آٹھ میٹر کی بلندی سے گرتا ہے، پانی کی بلندی ۵۴ میٹر ہوتی ہے، لیکن جس ملک کو اللہ تعالیٰ نے یہ آبشار عطا فرمایا ہے، وہ اس سے صرف قوتِ کہربائی (ELECTRIC POWER) حاصل کرتا ہے، جس سے کہتے ہیں کہ پچاس لاکھ (MEGA-WATT) کی قوت حاصل کی جاتی ہے، اور اس سے دُور دُور کے شہر میں روشنی پہونچائی جاتی ہے، اس سے یہی کام لیا جا سکتا ہے، اور اس ملک و معاشرہ کا یہی ذہن اور یہی میدانِ عمل ہے۔

لیکن میں آج آپ کو ایک دوسرے "آبشار" کی خبر دیتا ہوں جس میں اس اُمّت اسلامیہ کا عام اور آپ کے ملک کا خاص حصہ ہے، اور جس کے وجود اور قوت کی شہادت زبان نبوت نے دی ہے، وہ "آبشار ایمانی" ہے جس سے اللہ نے خاص طور پر آپ کے ملک اور قوم کو سرفراز فرمایا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "أتاكم أهل اليمن ارقّ افئدة وألين قلوباً الإيمان يمان والحكمة يمانية" دنیا کے ممالک اور قومیں دنیا بھر کی طاقتوں، دولتوں اور خزانوں کی مالک ہیں لیکن اس آبشار سے محروم ہیں، اس کا نتیجہ مادہ پرستی، قوم پرستی، نفسانیت، جماعتی اور

سیاسی تعصبات اور انتشار و تصادم ہے، میں نے ان مغربی ممالک کا نقشہ ان کے سامنے کھینچا اور بتایا کہ آج بھی مسلم ممالک اور مسلم اقوام کن خصوصیات کی مالک ہیں، ان سے کتنا بڑا کام لیا جا سکتا ہے، اور دنیا میں انقلاب لایا جا سکتا ہے، لیکن عوام ان سے نا واقف اور ان کے قائدین اور ذمہ دارانِ حکومت ان سے خائف اور متوحش ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اس سے کام نہیں لیا جا رہا ہے، بلکہ اس کو کمزور کرنے اور ربند کرنے کی تدبیریں سوچی جا رہی ہیں، اس کو قدامت پسندی[1] کا ایک نشان اور رجعیت کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔

پھر میں نے ان نوجوانوں کو خطاب کر کے کہا کہ آپ خود شناسی اور خود نگری سے کام لیں اور گویا اقبالؔ کے ان اشعار کو اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں منتقل کرنے کی کوشش کی ؎

بینی جہاں را خود را نہ بینی	تا چند غافل فارغ نشینی
نورِ قدیمی شب را با فروز	دستِ کلیمی در آستینی
بیروں قدم نہ از دورِ آفاق	تو بیشتر از ینی تو پیشتر از ینی
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید؟	مرگ است صیدے تو در کمینی

تقریر کرتے کرتے ایک ایسا مضمون قلب میں وارد ہوا جس سے خود مجھے بھی حدیث کے فہم کی ایک نئی لذّت ملی، میں نے کہا۔

عزیزو اور بھائیو! اگر کوئی طبیب کسی شخص کو دیکھ کر کہے کہ تم بالکل تندرست ہو،

---

[1] اس کو ہندوستان کی موجودہ سیاست و صحافت کی زبان میں بنیاد پرستی (FUNDAMENTALISM) کہا جاتا ہے۔

تم صحت کی بڑی اچھی حالت میں ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ شخص دو دن یا چار دن کے بعد بھی ایسا ہی رہے گا، اس لئے کہ طبیب نے اپنے فن اور تجربہ کے مطابق اس کی موجودہ حالت کو دیکھ کر اس کو اطمینان دلایا، لیکن جب خدا کا پیغمبر جس کی صفت "لَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى" بیان کی گئی ہے وہ فرماتا ہے کہ "الإيمانُ يمانٍ" تو ضروری ہے کہ اس قوم میں اس ایمان کی تجلّی ہر زمانہ میں ہو، اور خود آپ کو بھی غیرت آنی چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ یہ خصوصیت جو نبی کی شہادت پر مبنی ہے ہمیشہ آپ کے ملک اور آپ کی قوم کا خاصّہ رہے۔

پھر میں نے کہا کہ آج دنیا کی بہت سی مسلم اقوام اور مختلف ملکوں کے مسلمان آپ سے اس معاملہ میں سودا کرنے اور تبادلہ پر تیار ہیں کہ ان کے پاس جو کچھ ہے ان سے لے لیجئے اور ایمان کی یہ گواہی جو نبی برحق کی زبان نے دی ہے، ان کو دے دیجئے، اور میں ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے تو پورے اطمینان و وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کے جتنے چاہئے کتب خانے، مدرسے اور دولت نیز تمدّن و ترقی کے مظاہرے لیجئے اور ہم کو یہ شرف و عزّت دے دیجئے جو اللہ کے نبی نے آپ کو عطا کی۔

یہ تقریر ڈیڑھ دو گھنٹے کے قریب جاری رہی، اور سامعین ہمہ تن گوش برآواز اور محو سماعت رہے۔[1]

مسلمان کی قوت کا سرچشمہ

مجلسوں میں کئی جگہ آبشار کا تذکرہ سنا، شہر میں اس کا چرچا تھا، صنعاء میں

---

[1] پوری تقریر "نفحات الإيمان بين صنعاء وعمّان" میں دیکھی جا سکتی ہے، جو "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی طرف سے اور "دار الصحوة" قاہرہ کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔

تین تقریریں اور ہوئیں ایک کُلّیۃ الطیران (AIR FORCE) ٹریننگ کالج میں جو صنعاء پہونچنے کے بعد ہی ہوئی، مغرب کے بعد تقریر کا پروگرام تھا، ہم لوگ مسجد میں مغرب سے پہلے پہونچ گئے، دیکھا کہ خاصی تعداد میں نوجوان تلاوت قرآن میں مشغول ہیں، معلوم ہوا کہ نماز یہاں لازمی ہے۔

افسوس ہے کہ اس تقریر کا کیسٹ نہیں مل سکا اور نہ کوئی یادداشت، اس لئے اس کا خلاصہ پیش نہیں کیا جا سکتا، البتہ مُدرّعات (ARTILLERY CENTRE) میں جو ٹینک پر کام کرنے والے فوجیوں کا ہیڈ کوارٹر ہے، کی تقریر محفوظ ہے اور اس کا خلاصہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس مرکز کے حدود میں پہونچے تو وہاں کے افسر اعلیٰ نے استقبال کیا، اور فوجی طریقہ پر فوجیوں کو ہال میں جمع ہونے کا اشارہ دیا، جو کئی سو کی تعداد میں تھے، مقرر کے لئے پہلا موقعہ تھا کہ اس اہم اور نازک موقعہ و مرکز میں خطاب کرتا، اپنے طویل اور کثیر التعداد سفروں اور مسلم و عرب ممالک میں سے بعض کی حکومتوں کی دعوت پر ان ملکوں میں جانے کے باوجود یہ پہلا تجربہ تھا کہ حکومت نے ایرفورس اور (ARTILLERY) سے خطاب کا موقعہ دیا۔

تقریر میں نے قرآن مجید کے سورۂ نساء کی اس آیت سے شروع کی:۔

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ	اور دشمنوں کے پیچھا کرنے میں سستی
إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ	نہ کرنا، اگر تم بے آرام ہوتے ہو تو
يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ	جس طرح تم بے آرام ہوتے ہو
مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ	اسی طرح وہ بھی بے آرام ہوتے ہیں

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (سورۂ نساء - ۱۰۴)

اور تم خدا سے ایسی ایسی امیدیں رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھ سکتے اور خدا سب کچھ جانتا ہے، اور بڑی حکمت والا ہے۔

پھر اس کی تفسیر کرتے ہوئے تفصیل سے بتایا کہ مسلمان سپاہی کی قوت کا سرچشمہ اللہ کے ان وعدوں پر ایمان ہے، جو شہید کے لئے کئے گئے ہیں، اور اس فضیلت و مرتبہ اور اجر و ثواب کے حصول کا شوق جو قرآن مجید کے آیات اور احادیث صحیحہ میں بتایا گیا ہے، اور جو درجۂ قطعیت و تواتر تک پہونچ گیا ہے، ورنہ انسانی جسم و اعضاء اور درد و تکلیف، زخم و جراحت کے احساس اور زندگی و موت کے طبعی قانون کے لحاظ سے سب انسان برابر ہیں، میں نے ان آیتوں کی تلاوت اور ان متعدد احادیث کا حوالہ دینے کے بعد جو شہادت اور شہید کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں، بتایا کہ یہی وہ خارق عادت، محیّر العقول اور ناقابلِ قیاس طاقت تھی، جس میں امّت اسلامیہ کے مجاہدین و سرفروش، دنیا کے تمام قوموں سے ممتاز اور ان پر فائق تھے، اور جس طاقت سے معجزات اور خوارق کا ظہور ہوا، دنیا کا نقشہ بدل گیا، انسانیت کی تقدیر تبدیل ہوگئی، اور اس نے تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا، اس سلسلہ میں میں نے حضرت جعفر طیارؓ، حضرت انس بن النضرؓ، سعد بن ربیعؓ اور حضرت خُبیبؓ[1] کی جاں سپاری، سرفروشی، اور ناقابلِ قیاس شجاعت کے واقعات بیان کئے۔

پھر میں نے کہا کہ شاید کوئی یہ کہے کہ یہ اس زمانہ کے واقعات ہیں جو خیر و برکت سے

---

[1] یہ واقعات مجموعۂ "نفحات الایمان" میں درج اس تقریر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

معمور اور سراپا سعادت اور نور تھا، آپ ایسے لوگوں کے حالات بیان کر رہے ہیں، جو نبوت کے گود میں پلے اور قرآن و ایمان کے مدرسہ میں پڑھے اور بڑھے تھے، ان کی توقع ان لوگوں سے کیا کی جا سکتی ہے جن کو نہ وہ مبارک زمانہ ملا، نہ وہ مقدس ماحول ومقام، اس لئے میں ہندوستان کی تحریک جہاد و دعوت کے جس کی قیادت حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے تھے، چند ایمان افروز واقعات سناتا ہوں، پھر میں نے مایار کی جنگ، ایک زخمی مجاہد سید ابو محمد کی جان کنی کے وقت شکر و مسرت اور مقدمۂ انبالہ (۱۸۶۴ء) کے "ملزموں" کا اپنی پھانسی کا فیصلہ سننے پر بشاشت اور حمد و شکر کے منظر، اور مولانا یحییٰ علی صاحبؒ صادق پوری کے صبر و استقامت اور فرحت و اطمینان کا واقعہ سنایا[1] پھر میں نے کہا کہ اس قوت کو جو وحی اور تعلیمات نبوت کا نتیجہ ہے کسی طرح ضائع نہیں ہونے دینا چاہئے، اسی طرح خدا کی نافرمانی سے احتیاط ضروری ہے، اس موقعہ پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اس تحریر کا اقتباس سنایا جو انھوں نے اپنے فوجی قائد (کمانڈر) کو بھیجی تھی، انھوں نے تحریر فرمایا تھا:-

"اگر مخالفین اور ہم معاصی میں برابر ہو گئے تو قوت و طاقت اور تعداد میں تو وہ ہم سے پہلے ہی سے بڑھے ہوئے ہیں، اگر ہم اپنی حقانیت اور فضیلت کی بناء پر نصرت الٰہی کے مستحق نہیں ہوئے تو محض اپنی طاقت سے ان پر غلبہ نہیں پا سکتے...... اس لئے طاقت اور قدرت کے بجائے اپنے طرز زندگی اور گناہوں کی فکر زیادہ ضروری ہے۔"[2]

---

[1] یہ واقعات "سیرت سید احمد شہیدؒ" یا مصنف کی دوسری مختصر کتاب "جب ایمان کی بہار آئی" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ [2] یہ تحریر "نفحات الایمان" میں مندرج تقریر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

قومِ سبا کے قصہ سے سبق

تیسری تقریر جامع مشہد میں ایک بڑے مجمع کے سامنے ہوئی، جس میں اس تاریخی حقیقت سے فائدہ اٹھایا گیا کہ قوم سبا اور ملکۂ سبا کا تعلق یمن ہی کی سرزمین اور قدیم تاریخ سے تھا[1]، میں نے آیت کی تفسیر اور شان نزول بیان کرتے ہوئے سامعین کو انسان کی اس فطری کمزوری پر متنبہ کیا کہ وہ راحت و آرام، سکون و اطمینان کے تسلسل اور ایک ہی قسم کی چیز سے (خواہ وہ کتنی لذّت بخش اور راحت رساں ہو) اکتا جاتا ہے، اور تبدیلی چاہتا ہے، چاہے یہ تبدیلی اس کے بالکل برخلاف اور سخت آزمائشوں میں مبتلا کر دینے والی ہو، اسی کو قرآن مجید نے "بَطِرَ" کے بلیغ لفظ سے ادا کیا ہے:-

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا۔ (سورۂ قصص-۵۸)

اور ہم نے بہت سی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا جو اپنی (فراخی) معیشت میں اترا رہی تھیں۔

یہ قومِ سبا کی کہانی ہے، جس کو اللہ نے سب کچھ دیا تھا، سفر کو نہایت سہل اور پُر راحت بنا دیا تھا، فاصلے قریب کر دیئے تھے:-

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً

اور ہم نے ان کے اور ان کی بستیوں کے درمیان جہاں ہم نے برکت رکھی تھی،

---

[1] سبا کا دار السلطنت صنعاء کے مشرق میں ۱۷۳ کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے اور یہ قوم یمنی الاصل اور یمنی الوطن تھی۔

وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ ٥ (سورۂ سبا - ۱۸)	بستیاں آباد کر رکھی تھیں (دور سے) نظر آنے والی، اور ہم نے اس میں سفر ٹھہرا دیا تھا، سفر کرو اس میں رات اور دن بے کھٹکے۔

لیکن انھوں نے اس نعمت کی ناشکری کی قرآن کہتا ہے :-

فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا۔ (سورۂ سبا - ۱۹)	پھر وہ کہنے لگے اے ہمارے پروردگار ہمارے سفروں میں درازی کر دے۔

یہ کوئی سفر ہے کہ ہم کھاتے پیتے مزے اڑاتے، بات کرتے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچ جاتے ہیں؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان سے وہ سب نعمتیں سلب کر لیں اور ان کو ملکوں میں تتر بتر کر دیا اور اُن کو تاریخ کا افسانہ بنا دیا:-

فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ۔ (سورۂ سبا - ۱۹)	تو ہم نے ان کو افسانہ بنا دیا اور ان کو بالکل تتر بتر کر دیا۔

پھر میں ماضی سے حال کی طرف آیا، اور میں نے کہا کہ مجھے بہت سے مسلم اور عرب ممالک اور اسلامی معاشروں کے بارہ میں اسی بیماری (بطر) کے پیدا ہونے کا خطرہ ہے کہ وہاں ہر طرف ھل من جدید کا نعرہ سنتے ہیں آتا ہے، ھل من مزید کا نعرہ اتنا خطرناک نہیں جتنا ھل من جدید کا نعرہ ہے، کیسے ہی حالات ہوں، بہرحال " انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگایا جاتا ہے، یہ ملک و قوم کو نئے خطرہ اور

آزمائش سے دوچار کرلینے کے مرادف ہے کہ صالح کے بجائے طالح، امن کے بجائے بدامنی، خیر خواہی کے بجائے بدخواہی کی کوئی تمیز اور عواقب و نتائج سے کوئی بحث نہ ہو، یہ طرز فکر اور نفسیات (PSYCHOLOGY) بہت خطرناک ہے، اور قوم سبا کے انجام سے دوچار کرسکتا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا	کیا آپ نے ان لوگوں کو سن رکھا
نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا	جنھوں نے اللہ کی نعمتوں کے
قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ	معاوضہ میں کفر کیا، اور اپنی قوم کو
(سورۂ ابراہیم۔۲۸)	ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں لا اتارا۔

ذمہ دارانِ حکومت سے ملاقاتیں

صنعاء میں چوٹی کے ذمہ دارانِ حکومت سے ملاقاتیں ہوئیں، ان میں صدر جمہوریہ علی عبداللہ الصالح بھی تھے، جنھوں نے جمعہ کے دن قصر جمہوریہ میں کھانے پر مدعو کیا، شیخ یحییٰ الفسیل کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھی، جو معاہد علمیہ کی ہیئتہ عامّہ کے صدر ہیں، اور صدر جمہوریہ سے ان کے اچھے تعلقات معلوم ہوتے ہیں، نماز کے بعد کھانے پر گئے، صدر صاحب نے مجلس میں بھی اور تنہائی میں بھی گفتگو کی، بڑی سادگی، بے تکلفی، احترام اور اظہار اعتماد کے ساتھ ملے، میں اٹھنے لگا تو انھوں نے تھوڑی دیر اور بٹھایا، وہاں سے نکلنے کے بعد T. V. اور ریڈیو پر پروگرام تھا، جس میں میں نے اپنی تعلیم اپنے استاذ خلیل عرب صاحب اور یمن سے قدیم تعلقات کا حوالہ دیا، اور رمضان المبارک کی

آمد آمد[1] پر اس کے استقبال اور اس کا حق ادا کرنے کی طرف بھی توجہ دلائی۔

صدر جمہوریہ کے علاوہ وزیر اعظم عبدالعزیز عبدالغنی، وزیر اوقاف، وزیر خارجہ صُبیحی اور بعض ارکان پارلیمنٹ سے بھی ملاقاتیں رہیں، اور سب نے پوری آزادی کے ساتھ بات کرنے کا موقعہ دیا اور دلچسپی اور توجہ کا اظہار کیا، علماء و قائدین میں سے قاضی عبدالرحمٰن محبوب اور یحییٰ لطیف الفسیّل سے برابر ملاقاتیں اور رابطہ رہا، اول الذکر مکتبۃ التوجیہ والارشاد کے سربراہ ہیں، جو عوام کی فکری اور دینی رہنمائی کا مرکز ہے، ثانی الذکر الهیئۃ العامّۃ للمعاهد العلمیۃ کے سربراہ ہیں، جو پورے ملک میں تعلیمی ترقی اور مدارس کے قیام اور ان کی باہمی ربط کا بھی ذمہ دار ہے۔

یمن میں دعوتی لٹریچر اور اس کا اثر

یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ باہر کی دنیا سے روابط کی کمی کے باوجود ہماری عربی کتابیں اور رسائل یہاں پہونچے ہوئے تھے، اور پڑھے گئے تھے، بعض حضرات سے ملنے جانا ہوا تو دیکھا کہ دروازہ پر ہماری بعض کتابوں اور رسائل کا اسٹال لگا ہوا ہے، ان میں "اذاهبّت ریح الایمان"[2] بھی نظر آئی، بعض ثقہ لوگوں سے معلوم ہوا کہ

---

[1] رمضان المبارک میں ایک ہی عشرہ رہ گیا تھا اور واپسی سے پہلے یمن سے سفر مراجعت تھا، اس لئے اس سے فائدہ اٹھایا گیا۔ [2] یہ کتاب حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی جماعت کے مؤثر اور سبق آموز واقعات، دینی جذبے، شوق جہاد و شہادت، ایثار و قربانی اور اخلاقی بلندی کے واقعات پر مشتمل ہے، جو قرون اولیٰ کی یاد تازہ کرتے ہیں، اس کا ترجمہ عزیز مرحوم سید محمد الحسنی کے قلم سے "جب ایمان کی بہار آئی" کے نام سے موجود ہے۔

جب جنوبی یمن کی کمیونسٹ حکومت کی فوجوں نے شمالی یمن پر حملہ کیا اور اہم مقامات پر قبضہ کرلیا، اور یہ نظر آنے لگا کہ شمالی یمن کی حکومت ان سے عہدہ برآ نہیں ہوسکے گی، اس وقت کے ذمہ دارانِ حکومت کے حوصلے بھی پست ہوگئے، اس وقت نوجوانوں کی ایک جماعت کھڑی ہوئی جس نے عربی میں ایسا دعوتی اور فکری لٹریچر پڑھا تھا جو دینی جذبات کو غذا پہونچاتا، فکر کو متاثر کرتا اور اسلام کے غلبہ کے لئے جدّ وجہد کی اُمنگ اور شوق پیدا کرتا ہے[1]، وہ کمیونسٹوں کے ارادے اور ان کے اثر و اقتدار کے نتائج سے واقف تھے، اور جانتے تھے کہ ان کے برسرِ حکومت آجانے کے بعد کچھ بھی باقی نہیں رہے گا، اور آزادی سے اسلامی زندگی گزارنا بھی مشکل ہوجائے گا، انھوں نے حکومت سے اجازت مانگی کہ ان کو کچھ سامان جنگ دے کر مقابلہ کی اجازت دی جائے، اہلِ حکومت نے پہلے اس کو ان کی ناتجربہ کاری اور عمر کی کمی و خامی پر محمول کیا، پھر ان کے اصرار سے تجربۃً ان کو چند توپیں اور اسلحہ دیئے، یمن پہاڑیوں کا ملک ہے، انھوں نے ایک پہاڑی پر مورچہ لگایا اور بنام خدا نعرۂ تکبیر سے کام شروع کیا، اللہ تعالےٰ نے ان کی خارق عادت طریقہ پر مدد فرمائی، انھوں نے جنوب کی بڑھتی ہوئی فوجوں کو پیچھے ڈھکیل دیا، نقشۂ جنگ بدل گیا اور شمالی یمن کمیونزم کے خطرہ سے بچ گیا۔

صنعاء اور اس کے اطراف

صنعاء کے احباب نے صنعاء کے باہر کا پروگرام بھی بنایا تھا، اس میں ملکۂ سبا

---

[1] اس سلسلہ میں (والعہدۃ علی الراوی) بیان کرنے والوں نے تین کا نام لیا جن کی کتابیں اس طبقہ نے ذوق و شوق سے پڑھی تھیں اور ان سے ان کے اندر نیا جوش اور اعتماد پیدا ہوا تھا، سید قطب، مولانا مودودی اور راقم سطور۔

کا دار السلطنت اور سدِ مأرب کے دیکھنے کا پروگرام بھی تھا، (جو صنعاء سے ۱۷۳ کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے) لیکن وقت کی تنگی اور سفر کی صعوبت کی وجہ سے ہم اس کی ہمت نہ کرسکے، حکومت نے ہیلی کاپٹر کے انتظام کا بھی اشارہ کیا لیکن پھر بھی اس کی ہمت نہ کی جاسکی، صنعاء میں بھی صرف محدث جلیل عبد الرزاق بن ہمام صاحبِ [۱] "مصنَّف" کی قبر کی زیارت کی جو ایک ٹیلہ پر مسجد کے بغل میں واقع ہے، وہاں راستہ کی ناہمواری اور پتھروں کی وجہ سے صرف فوجی جیپ ہی جاسکتی تھی، اسی سے ہم لوگ وہاں پہونچے اور فاتحہ پڑھی، علامہ محمد بن علی الشوکانی صاحبِ "نیل الاوطار" کی (جو ہمارے شیوخ حدیث میں ہیں) قبر کی زیارت نہ کرسکے کہ وہ صنعاء سے زیادہ فاصلہ پر ہے، قابلِ دید مقامات میں سے امام یحیی کا محل دیکھا، جو صنعاء کے ایک نواحی محلہ میں واقع ہے، اس کے علاوہ صنعاء میں قابلِ دید مقامات ہیں بھی کم، سڑکیں عام طور پر کچی اور ناہموار ہیں، یمن کے حکّام (ائمۂ یمن) نے ملک کو متمدّن اور ترقی یافتہ بنانے سے قصداً گریز کیا اور تمدّن و تنظیم جدید کی مفید اور ضروری چیزیں بھی اختیار نہیں کیں، انھوں نے یمن کے دروازے مضبوطی سے بند رکھے، لیکن فطرتِ انسانی اور قانونِ قدرت نے اپنا کام کیا، یمن میں انقلاب آگیا، پہلے تجدّد پسند اور کمیونسٹ نواز عنصر غالب آیا، اور اس نے یمن میں تیزی سے تبدیلی لانے کی کوشش کی، اس کے بعد حالات نے کئی کروٹیں لیں، بالآخر موجودہ حکومت کے لوگوں نے

---

[۱] عبد الرزاق بن ہمام حمیری صنعانی دوسری تیسری صدی ہجری کے جلیل القدر محدثین میں تھے، (ولادت ۱۲۶ھ وفات ۲۱۱ھ) امام احمد کو بھی ان سے تلمذ تھا، اور خاص اس مقصد کے لئے (مکہ معظمہ میں ان کے مل جانے کے باوجود) انھوں نے ان کی خاطر صنعاء کا مستقل سفر کیا۔

ملک کی باگ ڈور سنبھالی جن کا رجحان اگر کھلا ہوا دینی نہیں تو مخالف دین بھی نہیں ہے،
اب وہ ملک کو ترقی دینے کی کوشش کر رہے ہیں، تیزی سے سڑکیں بن رہی ہیں،
اور عصر جدید کی سہولتیں اور تمدّن کے لوازم سے ملک کو روشناس کیا جا رہا ہے لیکن
یہ معلوم نہیں کہ اس میں کتنی منصوبہ بندی اور نئی نسل اور ملک کے مستقبل پر اسلام اور
قابل حفاظت یمنی خصوصیات کے بقا و اقتدار کا لحاظ ہے[1]۔

یمن میں قدیم سے زیدی مذہب غالب چلا آ رہا ہے[2]، اس کے آثار اب بھی
نمایاں ہیں، لیکن عبادات، اجتماعات، اخلاق و معاملہ میں کوئی فرق محسوس نہیں
ہوتا، یمن میں نسلی، قومی نقشہ اور حلیہ کے علاوہ دو چیزیں مشترک پائیں، ایک خاص
طرح سے سر پر عربی رومال باندھنا، جو غالباً قدیم عربوں کے رواج سے قریب تر ہے،
ہم نے اپنے استاد عرب صاحب کو ہمیشہ اسی طرح رومال باندھتے ہوئے دیکھا، نجد
اور منطقۂ شرقیہ میں رومال کو صرف سر پر ڈال لیتے ہیں، قدیم حجاز اور موجودہ یمن
کا طریقہ عمامہ کی سنّت سے قریب تر ہے۔

دوسرے کمر میں خنجر باندھنا جس کو جنبیہ کہتے ہیں، جو حیثیت کے مطابق سستا

---

[1] یمن کے ماضی و حال پر مفصل تبصرہ، امکانات اور خطرات کی نشاندہی کی تفصیل مصنف کی کتاب
"مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" میں پڑھی جائے ص ۳۹-۴۸

[2] یہ فرقہ اگرچہ حضرت علی کی تفضیل کا قائل ہے لیکن مذہب اثنا عشری جعفری سے بہت مختلف
ہے، اس میں تبرّا، صحابہ کرام کی تکفیر اور ان کی ردّت کا خیال اور اہلِ سنّت کے خلاف غلو نہیں
پایا جاتا، یمن کے اخیر دور کے محدثین کبار اور علمائے اہلِ سنت میں سے کئی زیدیت ترک کر کے
اہلِ سنّت کے دائرہ میں آئے، اور حدیث کی بڑی خدمت انجام دی۔

اور قیمتی ہوتا ہے، یمنیوں کا شعار بن گیا ہے، اس سے علما بھی مستثنیٰ نہیں، اس طرح یمنی قوم نیم مسلح ہے۔

یمن کے مرکزی و تاریخی مقامات کا دورہ

صنعاء کے احباب نے یمن کے اہم تاریخی شہروں اور قدیم علمی مرکزوں کی زیارت کا بھی پروگرام بنایا تھا، ان میں وقت کی کمی کی وجہ سے انھوں نے تین ہی مقامات رکھے تھے، تعِز جو یمن کا دوسرا دار السلطنت سمجھا جاتا ہے، زَبِید جو کسی زمانہ میں لغت اور حدیث کا عالمی شہرت کا مرکز رہا ہے، اور حُدَیدہ جو یمن کی ایک بندرگاہ بھی ہے، اور بڑا شہر بھی، اور ہمارے سلسلۂ حدیث کے شیخ اکبر شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی اور ان کے خاندان کا وطن بھی۔

صنعاء سے ہم ۴، ۵ ممتاز اور فاضل یمنی علماء کے ساتھ تعِز کے لئے روانہ ہوئے، راستہ چونکہ پہاڑی تھا، اس لئے ایک رہبر حفاظتی کار (PILOTCAR) جس میں کچھ سپاہی بھی تھے، آگے آگے چل رہی تھی، راستہ بڑا خوش منظر اور نظر فریب تھا، پہاڑیاں نہایت سرسبز اور وادیاں نہایت شاداب حسین اور آبادیوں سے معمور تھیں، معلوم ہوتا تھا کہ ہم کشمیر میں سفر کر رہے ہیں۔

تعِز میں وہاں کے دو سربرآوردہ حضرات قاضی اسماعیل الاکوع اور شیخ محمد علی الاکوع سے ملاقات ہوئی، تعز کے ایک دینی ذہن رکھنے والے صنعت کار نے اپنے مکان پر معززین شہر اور اعلیٰ عہدیداروں کو جمع کیا، اور وہاں ایک مختصر خطاب رہا، دوپہر کے کھانے کے بعد جب قات

کا دور[1] شروع ہوا، تو میں نے اجازت لی اور آرام کیا۔

شام کو شہر کی جامع مسجد جامع المظفرؔ میں بعد مغرب تقریر ہوئی جس میں علماء اور معززین شہر کی بڑی تعداد شریک تھی، مسلم ممالک اور معاشروں کے عام حالات اور یمن کے خصوصی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے (جس کے سر پر جنوبی یمن کی کمیونسٹ حکومت کے غلبہ اور کمیونزم کے اثر کا خطرہ ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے) میں نے تقریر کا موضوع اور اس کا مرکزی نقطہ فاتح مصر سیدنا عمرو بن العاصؓ کے اس تاریخی جملہ کو بنایا جس سے انھوں نے عرب فاتح فوج اور مسلمانوں کو مخاطب کیا تھا، انھوں نے فرمایا تھا "إنکم في رباط دائم، لکثرۃ الأعداء حولکم وتشوّف قلوبهم إلیکم" (تم اپنے کو مستقل محاذ جنگ پر سمجھو، اس لئے کہ تمھارے چاروں طرف کثرت سے دشمن پھیلے ہوئے ہیں، اور ان کی نیتیں اور نگاہیں ہر وقت تمھارے اوپر ہیں) میں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے دائمی طور پر بیدار اور ہشیار اور خطرات و امکانات سے خبردار رہنے کی ضرورت بیان کی، اسی کے ساتھ تن آسانی

---

[1] قات یمن کی ایک بوٹی ہے جس کے یمنی شدت سے عادی ہیں (چائے، کافی اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے زیادہ) دوپہر کے کھانے کے بعد خاص طور پر اس کا دور چلتا ہے، اور اس کی چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں پیش کی جاتی ہیں، اس کے کھانے سے سرور اور ہلکا سا نشہ پیدا ہوتا ہے، اس کا معدہ اور صحت پر خوشگوار اثر نہیں، لیکن علمائے یمن کی اکثریت اس کے جواز کی قائل ہے اور اس میں کوئی دینی کراہت نہیں سمجھتی، بعض علماء کے اس کے بارہ میں مستقل رسائل اور فتاوی ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کا یمنی قوم کے قویٰ اور ملک کی اقتصادیات پر (اس لئے کہ وہ قیمتی چیز ہے) برا اثر پڑ رہا ہے، اگر کبھی وہاں کوئی ہمہ گیر اصلاحی تحریک پیدا ہوئی تو وہ اس کو ضرور ممنوع قرار دے گی۔

اور سہولت پسندی کی زندگی اور اخلاقی گراوٹ اور اجتماعی امراض سے بھی آگاہی دی، اور علامہ اقبال کے ایک شعر کی عربی میں تشریح کی ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رُباب آخر

پھر میں نے ہندوستان کی مغل حکومت کے آغاز و انجام کو پیش کیا کہ وہ بابر کی جفاکشی، شہسواری، اور کشور کشائی سے شروع ہوئی تھی، اور محمد شاہ رنگیلے اور اس کے جانشینوں کی عیش پسندی اور رنگ رلیوں پر ختم ہوئی، پھر قرآن مجید کی اس آیت کو پڑھ کر اس کی تشریح اور واقعات سے اس کی تائید بیان کی :۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً	جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے
اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا	ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے
فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا	ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں،
تَدْمِيْرًا ۝	تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے
(سورہ بنی اسرائیل ۔ ۱۶)	اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

تعز سے چل کر ہم لوگ زَبید پہونچے، یہاں اپنے یمنی شیوخ حدیث میں سے علامہ سلیمان بن یحییٰ بن عمر بن مقبول الاہدل ہی کے گھر میں ناشتہ کیا اور اسی خاندان کے ایک محترم فرد شیخ اہدل کے مہمان رہے، زَبید میں علامہ مجد الدین فیروز آبادی کی قبر پر فاتحہ پڑھی جو اسلامی حکومت کی طرف سے یہیں متعین تھے، اور یہیں ان کا انتقال ہوا، اسی زَبید میں فخرِ ہندوستان علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی (متوفی ۱۲۰۵ھ) نے ادب و حدیث میں مہارت پیدا کرنے کے شوق میں اتنا طویل قیام کیا کہ زبیدی کے لقب سے

مشہور ہو گئے، اور اچھے اچھے اہل علم بھی بھول گئے کہ وہ اودھ کے قصبۂ بلگرام کے رہنے والے اور سادات کے مشہور خاندان کے فرد تھے، ان کی دھوم ساری عربی دنیا میں مچی ہوئی تھی، ان کو اہلِ زبان نے خود عربی زبان و لغت کا امام تسلیم کر لیا تھا، بڑے بڑے بادشاہ ان کی کتابوں کی نقلیں منگواتے تھے، اور ان سے سند حاصل کرنا فخر سمجھتے تھے[۱]۔ انھوں نے قاموس کی شرح "تاج العروس" لکھ کر اپنی زبان دانی اور تحقیق کا سکّہ علمائے عرب و عجم سے منوا لیا، اس کی نظیر کسی دوسری زبان کی کسی لغت، قاموس (DICTIONARY) کے معاملہ میں نہیں ملتی، قدیم تاریخی مسجد کی بھی زیارت کی۔

زبید سے ہم لوگ حُدیدہ گئے، وہاں اس خیال سے کہ یہ ہمارے محبوب استاد شیخ خلیل عرب اور ہمارے شیوخ حدیث کا وطن ہے، ایک کشش اور محبت محسوس ہوئی، حُدیدہ میں تبلیغی مرکز میں مختصر خطاب اور معہد علمی میں عمومی اور مفصل خطاب ہوا، جلسہ کے آغاز میں بچوں نے ایک استقبالیہ نظم بڑے دل کش اور پُر اثر لہجہ میں پڑھی جس میں بار بار آتا تھا کہ ہم ابو الحسن کا استقبال کرتے ہیں، سر آنکھوں پر، یا مرحبا بأبي الحسن عشي على الرؤس والمقل میں نے وہاں کھُل کر اس شہر سے اپنے محبوب و محسن استاد کے رشتہ سے تعلق کا ذکر کیا، پھر عربی زبان کی (قرآن مجید کی بدولت) عالمگیری محبوبیت، اور اس کی وسیع فتوحات، اہل عجم کے اس کے ساتھ عشق و شغف کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ اس کی یہی ایک مثال کافی ہے کہ ایک ہندی نژاد علامہ سید مرتضیٰ مشہور بہ زبیدی نے ایک دوسرے ایرانی نژاد امام لغت

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" از مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنی رحمۃ اللہ علیہ جلد ہفتم ترجمہ "السید مرتضیٰ ابن محمد البلگرامی"

مجد الدین فیروز آبادی کی کتاب قاموس کی شرح چودہ[۱۴] برس دو[۲] مہینے مشغول رہ کر دس[۱۰] ضخیم جلدوں میں کی ہے، جس کی مثال کسی دوسری زبان میں نہیں پائی جاتی، پھر میں نے علامہ عبد العزیز میمنی مرحوم کا ذکر کیا، میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا تھا کہ ان کو ۷۵ ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان عربی اشعار یاد ہیں، اس کی وجہ محض اہلِ عجم کا قرآن کی زبان سے تعلق، عقیدت و عشق ہے، اس سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس وصیت کا ذکر کیا جو عمّان کی پہلی تقریر میں آچکی ہے، پھر میں نے ذات نبویؐ کا حضرات انصار سے جو نسلاً یمنی تھے، تعلق خاص کا ذکر کیا، اور اس نسبت پر فخر اور شکر کرنے اور اس کی خصوصیات و اثرات کو اپنی زندگی میں نمایاں کرنے کی دعوت دی۔

قارئین کو شاید یمن کے تذکرہ میں کچھ طوالت و درازنفسی محسوس ہوئی ہو، لیکن۔ ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

دورہ سے واپس آکر صنعاء میں دو[۲] روز قیام رہا، ۲۱ مئی کو صنعا سے جدّہ اور ۲۳ مئی کو جدّہ سے کراچی روانگی ہوئی۔

بابِ دُوم

بنگلہ دیش اور پاکستان کے سفر، اہم مجالس اور خطابات

بنگلہ دیش

بنگلہ دیش کا سفر حقیقتاً شرق اردن، حجاز اور یمن کے سفر سے پہلے (۹ تا ۱۹ مارچ ۱۹۸۴ء میں) پیش آیا تھا، اور پاکستان کا سفر شرق اردن، یمن اور حجاز کے سفر کے بعد (۲۲ تا ۲۸ مئی ۱۹۸۴ء میں) ہوا تھا، اس لئے تاریخی ترتیب کے لحاظ سے بنگلہ دیش کے سفر کا تذکرہ شرق اردن اور یمن کے سفر سے پہلے، اور کراچی کے مختصر قیام کا تذکرہ شرق اردن اور یمن کے بعد ہونا چاہیئے تھا، لیکن مناسب سمجھا گیا کہ اول الذکر تینوں عرب ملکوں کے سفر کی روئیداد کے لئے ایک باب مخصوص کر دیا جائے کہ وہ ہم جنس اور ہم زبان ممالک ہیں، اور ایک مستقل باب (باب دوم) میں بنگلہ دیش اور پاکستان کے سفر کی روئیداد درج کی جائے۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق اور تقدیری امر ہے کہ میرے سفروں اور دوروں کا رُخ نیز علمی سرگرمیوں اور دعوتی مساعی کا میدان زیادہ تر مغرب رہا، جہاں ایک طرف الجزائر اور مراکش اور دوسری طرف امریکہ اور کنیڈا تک جانا ہوا، لیکن مشرق میں میری دنیا زیادہ تر کلکتہ تک محدود رہی، اس میں صرف برما اور سری لنکا کا استثناء ہے، جہاں بعض شدید تقاضوں کی بناء پر جانا ہوا، لیکن عام طور پر ہوڑہ اسٹیشن سے

آگے مشرق کی طرف بڑھنا نصیب نہیں ہوا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے خلفاء کی تحریک و دعوت کا مشرقی بنگال (ڈھاکہ اور چاٹگام) سے قدیم تعلق ہے، سید صاحبؒ ہی کے ایک نامور خلیفہ مولٰنا کرامت علی صاحب جونپوری نے حضرت سید صاحب کی ہدایت اور ایماء سے مشرقی بنگال کو اپنی تبلیغی و اصلاحی جدّوجہد کا میدان بنایا، اور ان کو اس میں ایسی کامیابی حاصل ہوئی جو صرف مُؤَیَّدِ مِنَ اللہ داعیوں اور مصلحین کو حاصل ہوئی ہے، میرے کانوں نے نواب بہادر یار جنگ کو ایک تقریر میں یہ کہتے ہوئے سُنا کہ "میری معلومات یہ ہیں کہ جن لوگوں کو مولانا کرامت علی صاحب جونپوری کے ذریعہ مشرقی بنگال میں ہدایت نصیب ہوئی یا ان کی اصلاح ہوئی، ان کی تعداد دو کروڑ تک پہونچتی ہے" میں بچپن میں بھی سنتا تھا کہ ہمارے خاندان کے بعض بزرگ ڈھاکہ وغیرہ جایا کرتے تھے، لیکن مشرقی بنگال کا یہ خطہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں شامل ہوا، پھر ۱۹۷۲ء میں پاکستان سے علٰحدہ ہوا، لیکن میرے جانے کی نوبت نہیں آئی، یہ علٰحدگی جس سیاسی سازش اور اس سے زیادہ افسوسناک تر لسانی اور تہذیبی تعصّب کے طوفان کے نتیجہ میں عمل میں آئی اس پر میں نے تحریرًا و تقریرًا پوری صفائی کے ساتھ اپنے تأثرات و جذبات کا اظہار کیا جس کا نقطۂ عروج وہ تقریر تھی جو میں نے ۲۳ مئی ۱۹۷۲ء کو کلکتہ میں کی، جو بعد میں "لسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق" کے عنوان سے اُردو، انگریزی، عربی، اور بنگلہ میں شائع ہوئی، اور جو بنگالی حُجّاج کے ذریعہ مکہ معظمہ سے بنگلہ دیش میں پہونچی اور مؤثّر ثابت ہوئی۔

دینی شعور اسلامی حمیّت کی بیداری کی تلقین اور مثبت و تعمیری مشورے

ضرورت تھی کہ اس صدائے احتجاج اور قلبی کرب و اضطراب کے اظہار کے بعد اس خطّہ میں رہنے والی ملّتِ اسلامیہ کے (جس نے ماضی میں اپنی اسلامیت، دینی حمیّت اور جذبۂ جہاد و قربانی کے تابندہ نقوش تاریخ کے صفحات پر ثبت کئے اور حضرت سید شہیدؒ کی تحریک جہاد میں ایمان و عزیمت کے ایسے نمونے پیش کئے جن کی مثال ملنی مشکل ہے) زخم پر مرہم بھی رکھا جائے، اس کو تعمیری اور مثبت مشورے بھی دیئے جائیں، اس کی اس اسلامیت کو (جو اس کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے) متحرک اور فعّال بنایا جائے، اور اس کے دینی و ذہنی شعور کو ایسا بیدار کیا جائے کہ وہ پھر کسی ایسی جاہلی دعوت کا شکار اور شرمناک المیہ سے دوچار نہ ہو کہ اِنذار و تبشیر دونوں توأم ہیں، اور دونوں داعی کے فرائض میں داخل ہیں۔

اِدھر کئی سال سے بنگلہ دیش کے دوستوں کی طرف سے بنگلہ دیش آنے کے لئے اصرار تھا، میری اردو، عربی تصنیفات وہاں شوق کے ساتھ پڑھی گئی تھیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بھی کچھ فضلاء تھے، اور خاص طور پر بنگلہ دیش کے ایک نوجوان عالم مولوی سلطان ذوق جو چاٹگام کے جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں استاد تھے، اور جن کو ادبِ عربی کا اچھا ذوق ہے، اور خاص طور پر ادبِ اسلامی سے اور اس میں بھی علامہ اقبال کے کلام اور اس سلسلہ میں میری عربی پیش کش "روائع اقبال" سے ان کو بڑی دلچسپی تھی، اور عرصہ سے وہ مجھ سے علمی و قلمی رابطہ رکھتے تھے لکھنؤ بھی

آچکے تھے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طویل قیام بھی کیا تھا، اس سفر کے بڑے محرک داعی تھے۔

آخر اس کی تقریب نکل آئی، بنگلہ دیش کے بعض اہم مدارس اور تنظیموں کی خواہش اور طلب، اور اسلامک فاؤنڈیشن ڈھاکہ کی دعوت پر وہاں کا سفر طے کرلیا گیا، اور ۹ مارچ ۱۹۸۴ء کو رفقاء کی ایک جماعت کے ساتھ جن میں مولانا عبدالکریم پاریکھ ناگپوری، مولانا ابوالعرفان خاں ندوی، عزیزی مولوی سید سلمان حسینی ندوی، اور میرے سفر کے عام رفیق و معاون حاجی عبدالرزاق رائے بریلوی تھے، ۹ مارچ ۱۹۸۴ء کو جمعہ کے دن بذریعہ ہوائی جہاز لکھنؤ سے کلکتہ ہوتے ہوئے ٹھیک مغرب کے وقت ڈھاکہ پہونچنا ہوا، جناب بشیرالدین صاحب (مالک جمیل الدین لمیٹڈ ۳۶ نیو اسکاٹن ڈھاکہ) کے یہاں قیام ہوا، جو ایک دیندار صاحب خیر تاجر اور اکثر علماء کے میزبان رہتے ہیں۔

بنگلہ دیش میں ۹ مارچ ۸۴ء سے ۱۹ مارچ ۸۴ء تک دس روز قیام رہا، اس سفر میں ڈھاکہ، چاٹگام، کوکس بازار، مومن شاہی (میمن سنگھ) اور سلہٹ کے مرکزی مقامات پر جانا ہوا، بڑے بڑے جلسوں میں خطاب ہوا اور مدارس کا معائنہ کیا گیا، چاٹگام اور کوکس بازار کے دورہ میں نہیلہ تک جانا ہوا، جو برما کی سرحد پر واقع ہے، وہاں ہماری آمد کو سن کر برما کے بہت سے اہل ذوق اور اہل علم تشریف لائے، ڈھاکہ کے قیام میں سنار گاؤں بھی گئے، جو قدیم مسلم سلطنت کی آخری مشرقی حد تھی، یہیں سے شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی سڑک شروع ہوتی تھی (جو نیلاب سندھ تک جاتی ہے، اب یہ مقام پنیام (PAINAM) کے نام سے ضلع ڈھاکہ میں شامل ہے۔

نعمتِ اسلام کی قدر اور اس پر شکر کی ضرورت

پہلی تقریر ۱۰ مارچ ۱۹۸۴ء کو بعد عصر جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں ہوئی جس کا عنوان "نعمت اسلام کی قدر اور اس پر شکر کی ضرورت" تھا جس میں بنگلہ دیش میں پیش آنے والے پچھلے واقعات کو سامنے رکھ کر ایمان کی نعمت، دین کے رشتے، کلمہ گو مسلمان کے حق اور اس کی جان و آبرو کی حرمت کو یکسر فراموش کر دینے اور ہر ایسی دعوت و تحریک کو قبول کرنے کی مذمت کی گئی، اور اس کا خطرہ بیان کیا گیا جس سے جذبات کی تسکین ہوتی ہو، یا جس میں دل فریبی کا سامان ہو، اس سلسلہ میں بنی اسرائیل کے بعض واقعات کا حوالہ بھی دیا گیا جن میں اس مرض اور کمزوری سے مماثلت پائی جاتی ہے، اور قومیت جاہلیہ اور نسل و زبان پرستی پر تنقید کی گئی، جو اپنی حد سے بڑھ کر ظلم و کفر، وحشت و بربریت اور قتل مسلم کی حد تک پہونچا دیتی ہے۔

اسلامک فاؤنڈیشن میں اہم تقریر

سب سے اہم تقریر وہ تھی جو اس جلسۂ استقبالیہ میں کی گئی جو اسلامک فاؤنڈیشن بنگلہ دیش کی طرف سے ۱۳ رمارچ کو ہوٹل پوربانی میں دیا گیا تھا، اور جس میں ڈنر کا بھی انتظام تھا جس میں ڈھاکہ کا جوہر (CREAM) آگیا تھا، فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر جناب ابوالفائز محمد یحییٰ صاحب نے اس سے خاص دلچسپی لی تھی اور اہتمام کیا تھا، اور خیر مقدمی تقریر کی تھی۔

اس تقریر کا عنوان "محبت اور سچی روحانیت کی فتح ہے" تقریر میں مسلم اقوام کی ان خصوصیات کا ذکر کیا گیا جن کی نظیر دوسری قوموں میں نہیں ملتی، مثلاً خلوص، جوش ایمانی، جذبۂ قربانی، سادگی، بہادری، ان خصوصیات اور صلاحیتوں سے جو خدا کی دین اور اسلام کا معجزہ ہے، افسوس ہے کہ وہ کام نہیں لیا جا رہا ہے، جو لیا جانا چاہیئے، ایمان و خلوص کے اس فطری آبشار اور محبت و اطاعت کے اس آب رواں سے کھیتیاں نہیں سینچی جاتیں، اس سے وہ کہربائی طاقت نہیں پیدا کی جاتی ہے جس سے لاینحل مسائل چٹکیوں میں حل ہو سکتے ہیں، اور جس سے تو م سونا نہیں بلکہ اکسیر اور پارس بنائی جاسکتی ہے، اور اسی ملک میں نہیں، عالم اسلام میں ایک نئی طاقت پیدا کی جاسکتی ہے لیکن یہ سیاسی لیڈروں کا کام نہیں، سچے دل اور خلوص والوں کا کام ہے، ضرورت ہے کہ جو خلیج پرانے طبقہ اور نئی نسل اور علماء اور یونیورسٹیوں کے گریجویٹس کے درمیان پڑگئی ہے اور گہری اور وسیع تر ہوتی جارہی ہے، اُس کو پُر کیا جائے، اور دونوں طبقے دین و ملّت کی خدمت کے میدان میں دوش بدوش کام کریں، پھر یہ امید ظاہر کی گئی کہ اسلامک فاؤنڈیشن جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے ان کی زبان اور جدید اسٹائل میں اسلامی لٹریچر پیش کرے گی، یہ امید کا ایک ستارہ ہے جس سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

بنگلہ زبان میں اہلِ دین کی مہارت وقیادت کی ضرورت

جامعہ امدادیہ کشور گنج کے جلسہ میں جو ۱۴؍ مارچ ۱۹۸۴ء کو ایک میدان میں ہوا تھا جس میں علماء، طلبہ، دانشوروں کی ایک بڑی تعداد تھی، بنگلہ دیش میں

اہلِ علم واہلِ فکر کی اس ذمہ داری پر روشنی ڈالی گئی کہ وہ بنگلہ زبان میں مہارت وقیادت کا مقام حاصل کریں، اور اپنی توجہ او صلاحیت عربی اور اردو ہی پر (ثواب کا کام سمجھ کر) مرکوز نہ کریں، بنگالی زبان میں بھی امتیاز و تفوّق پیدا کریں، اس خلا کے باقی رہنے کی حالت میں کہ لسانی وادبی، تحریری وخطابی، قیادت وزعامت، علماء اور زیادہ صحیح الفاظ میں اہلِ دین کے ہاتھوں میں نہیں رہتی، اور تجدد و ترقی پسند طبقہ، یا مخالف اسلام عنصر کی اس پر اجارہ داری قائم ہوجاتی ہے، جن خطرات اور نقصانات کا اندیشہ ہے، ان کی نشاندھی کی گئی، اس سلسلہ میں علمائے ہند کی اس خصوصیت کا تذکرہ کیا گیا کہ انھوں نے زبان وادب اور جدید اسالیب سے اپنا رابطہ ٹوٹنے نہیں دیا اور وہ علم وادب اور ثقافت کے قافلہ سے بچھڑنے نہیں پائے، ماضی میں اردو ایوان ادب کے چار ستون تھے، اور وہ چاروں قدیم نظام تعلیم کے پروردہ تھے[1]۔

یہ خیالات اور مشورے بہت سے سامعین کے لئے خلاف توقع اور خلافِ قیاس تھے، وہ توقع نہیں کرتے تھے کہ دینی وعربی تعلیم کا ایک داعی اور مدارس عربیہ کا ایک پُرجوش نمائندہ اس بنگالی زبان کی طرف توجہ دینے کی تلقین کرے گا، جس نے ماضی قریب میں وہ گل کھلایا تھا، جو سب کو معلوم ہے، اور خود مقرر نے اس المیہ اور لسانی عصبیت پر ایسی گرم تقریر کی تھی جو اور کسی سے سننے میں نہیں آئی، لیکن جو کچھ کہا گیا وہ خلوص وخیر خواہی اور حقیقت پسندی کی بناء پر کہا گیا اور جس کی

---

[1] اشارہ ہے خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا شبلی نعمانی کی طرف۔

تائید علم و ادب کی تاریخ، مختلف ملکوں اور معاشروں کے تجربات سے ہوتی ہے، اور بنگلہ دیش کو (جس کی زبان بہر حال بنگالی ہی رہنی ہے) اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے اور اہلِ علم و دین کو اس کے لئے پہلے سے تیاری کرنی چاہیئے۔

اس ملک کی قسمت اسلام سے وابستہ ہے اور وہ اس کی دائمی ملکیت ہے

۱۶ مارچ ۱۹۸۴ء کو جمعہ کا دن تھا، نماز ڈھاکہ کی مرکزی جامع مسجد بیت المکرّم میں پڑھنی تھی، اور امامت بھی کرنی تھی، یہاں بنگلہ دیش کے صدر جنرل ارشاد بھی نماز پڑھنے کے لئے آنے والے تھے، جمعہ کے خطبہ سے پہلے میں نے تقریر کی جس میں صفائی کے ساتھ کہا کہ اس ملک کی قسمت اسلام سے وابستہ ہے، میں نے کہا کہ پرانے رؤساء اور والیانِ سلطنت کسی کو کوئی جاگیر دیا کرتے تھے، اور وہ اس کو (ALLOT) ہو جاتی تھی، اگر کوئی اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا تھا تو والی ریاست یا حکومت سے جنگ سمجھی جاتی تھی، آپ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ سرزمین (بنگلہ دیش) اسلام اور اللہ کے آخری رسول محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام الاٹ (ALLOT) ہو چکی ہے، اب اس صورت حال کو بدلنے کی کوشش کرنا اور اس ملک و علاقہ کو کسی اور کے اختیار میں دینا، اور کسی اور کا جھنڈا اس پر نصب کرنا اس فیصلۂ خداوندی کے خلاف بغاوت سمجھی جائے گی، اس ملک کے لئے تقدیرِ الٰہی اور قضا و قدر کا فیصلہ ہے کہ یہ ملک مسلمان رہے، اور اس ملک کی خیریت و سلامتی بھی اسی میں ہے، میں اس منبر پر محراب میں بیٹھ کر مسجد میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہ ملک کبھی خوشحال نہیں ہو سکتا، اور اس ملک کی

چُول کبھی بیٹھ نہیں سکتی، اگر اسلام کو اس نے چھوڑا، کوئی پروجیکٹ (PROJECT) کوئی پلان (PLAN) کوئی باہر کی مدد (AID) اندر باہر کی سیکوریٹی اس ملک کو بچا نہیں سکتی سمجھنے والے اس بات کو سمجھ لیں اور لکھنے والے اس بات کو لکھ لیں، پھر میں نے آئندہ نسلوں کو اسلام اور اس کی تعلیمات سے وابستہ رہنے اور خود مکمل اسلامی زندگی اختیار کرنے کے سلسلہ میں مشورے دیئے اور اس پر زور دیا کہ یہ دینی، اعتقادی، ایمانی، وعلمی تسلسل اس ملک میں باقی رہنا چاہیئے۔

علمی، ادبی وفکری میدان میں آزاد و خود کفیل ہونے کی ضرورت

آخری اہم تقریر اسلامک فاؤنڈیشن ڈھاکہ میں ۱۹ / مارچ ۱۹۸۴ء کو ادیبوں دانشوروں اور تحقیقی کام کرنے والوں کی مجلس میں کی گئی جس کی روح اور خلاصہ یہ تھا کہ اس مسلم ملک کو علمی، ادبی وفکری میدان میں بھی آزاد و خود کفیل ہونا چاہیئے ان کو علم وادب، شاعری اور اسلوب تحریر میں بھی باہر کا غلام، دست نگر اور باج گذار نہیں ہونا چاہیئے، ادب و شاعری میں بھی کسی ایسے طبقہ یا افراد کا ذہنی طور پر غلام ہونا، اس سے بہ شدت مرعوب ہونا، اور اس بارہ میں احساس کہتری میں مبتلا ہونا، اور افکار، ادبیات کو باہر سے درآمد (IMPORT) کرنا بڑا خطرناک ہے، اور اس راہ سے ایک ملک اور ایک نسل ذہنی ارتداد کے راستہ پر پڑ سکتی ہے، آپ کو اپنے ادیب و شاعر پیدا کرنے چاہئیں، اور ان مسلمان شعراء و ادباء کو اپنا ہیرو بنانا چاہیئے، جنھوں نے اسلامی دائرہ کے اندر رہ کر زندگی کی روح پھونکی اور ادب و شاعری کو صحیح رُخ دیا، جیسے آپ کے یہاں کے قاضی نذر الاسلام، اور عالمِ اسلام

کے علامہ اقبال۔

میں نے اس سلسلہ میں تاتاریوں کا واقعہ یاد دلایا کہ وہ پوری اسلامی سلطنت کے فاتح اور سیاسی طور پر عالمِ اسلام پر قابض ہوگئے تھے، ان کے پاس اپنا ادب، اپنی تہذیب، نظامِ سلطنت اور ایک متمدن دنیا پر حکمرانی کے لئے کوئی قانون نہ تھا، اس میں وہ مسلمان دانشوروں اور فضلاء کے محتاج تھے، اور انھوں نے ان سے مدد لی، اس احتیاج اور استعانت نے ان کو رفتہ رفتہ اسلام کا قائل اور اس کا حلقہ بگوش بنا دیا، میں نے صفائی سے کہا کہ:۔

"میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ قوم ہمیشہ خطرہ میں رہے گی اور کبھی پورے طور پر آزاد نہیں ہوسکتی، جب وہ علمی، ادبی (CULTURAL) حیثیت سے کسی دوسری قوم کی باج گذار یا شرمندۂ احسان ہو، جو قوم غالب ہوگی اس کا وہ اثر مانے گی، اور اس کے معیار و اقدار (IDEALS & VALUES) مستعار لے گی، اور آخر میں اس کا امکان ہے کہ اس کا مذہب بھی اختیار کرلے!"

یہ تقریر محض امکانات و مفروضات اور "اندیشہ ہائے دور دراز" پر مبنی نہیں تھی، میں نے بنگلہ دیش کے قیام ہی میں سنا تھا کہ مغربی بنگال سے بنگالی کے ایک غیر مسلم ادیب اور اہل قلم آئے تھے، تو ان کے استقبال و اعزاز میں مسلمان ادیبوں اور دانشوروں نے ایسا غلو اور مبالغہ کیا تھا، گویا آسمان سے فرشتہ نازل ہوا ہے، اس کے ماسوا بھی "نوشتۂ دیوار" کو ہر ایک پڑھ سکتا ہے، اور وہ بتا رہا تھا، کہ اگر اس ملک میں رابندرا ناتھ ٹیگور کا (جس کو اب بھی بہت سے

مسلمان نوجوان ٹھاکر کے لفظ سے یاد کرتے ہیں) (جن کی شاعری اور کہانیوں سے ہم بھی لطف اندوز ہوتے ہیں) دماغوں پر اسی طرح سے سحر اور طلسم قائم رہا تو یہ ملک ذہنی و علمی طور پر اسی طرح سے مغربی بنگال اور وہاں کے فکر و تخیل کا ویسے ہی اسیر ہو جائے گا، جیسے یورپ و ایشیا کے بہت سے ممالک یونان کے ذہنی طور پر غلام بن گئے تھے، اور اس سے الحاد و ارتیابیت اور عقلیت پرستی مسیحی اور مسلم حلقوں میں پھیلی۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اسلامک فاؤنڈیشن نے اسلامی ادبیات کی اشاعت کا منصوبہ بنایا ہے، اور ہماری بھی کئی کتابوں کا جو "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، ترجمہ بھی کروایا، مگر جہاں تک معلوم ہے ابھی اس کی رفتار سست ہے اور اس کی طرف مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

رفقائے سفر کی مشغولیت و افادیت

بنگلہ دیش کے دس روزہ قیام میں ہمارے تینوں رفقائے سفر مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا ابو العرفان ندوی اور عزیزی مولوی سید سلمان ندوی کی تقریروں کا سلسلہ بھی جاری رہا، اور ان سے بہت فائدہ پہونچا، مولانا عبدالکریم پاریکھ کو قرآن مجید پر بڑا عبور حاصل ہے، وہ اس کی روشنی میں بڑی مفید اصلاحی تقریر کرتے ہیں، مولانا ابو العرفان ندوی کی قدیم نصاب تعلیم، درس نظامی کی تاریخ، اس کے مصنفین و مرتبین کے مراتب اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر ایسی نظر ہے جو ہمارے علماء میں سے بہت کم لوگوں کی ہوگی، ان کی تقریریں عام طور پر فضلاء اور طلبۂ مدارس کے لئے مفید اور دلچسپ ہوتی تھیں، عزیزی سلمان کو اردو و عربی

تقریر پر یکساں قدرت حاصل ہے، بالعموم (مدارس میں) عربی میں انھیں کی تقریریں ہوتی تھیں، اس طرح یہ دورہ مختلف طبقات کے لئے مفید رہا اور خطابات وتقاریر میں تنوّع اور مختلف سطح کے لوگوں کی رعایت رہی۔

۲۰ رمارچ کو ہوائی جہاز سے وفد کی کلکتہ واپسی ہوگئی، اس سفر میں مولوی سلطان ذوق صاحب ابوالفائز محمد یحییٰ صاحب ڈائرکٹر اسلامک فاؤنڈیشن حاجی بشیر الدین صاحب، مولانا عبید الحق صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ ڈھاکہ اور ان کے صاحبزادہ عزیزی مولوی سعود الحق ندوی اور مولوی محی الدین صاحب ایڈیٹر "مدینہ" ڈھاکہ کی خاص معاونت ورفاقت رہی "جزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء"۔

کراچی (پاکستان) میں چار روز قیام اور شدید مصروفیت

۱۲ رمئی ۱۹۷۸ء کو صنعاء سے جدّہ واپسی ہوئی تھی، دو دن وہاں بعض اہم ملاقاتوں اور مجلسوں میں گزرے، اور پاکستان کے ویزا کے حصول میں صرف ہوئے، ۲۳ مئی کو جدہ سے کراچی روانگی ہوئی، چونکہ رمضان بالکل قریب آگیا تھا، اور اس زمانہ میں میں اپنے وطن رائے بریلی ہی میں قیام کرتا ہوں اور مختلف اطراف سے احباب واہلِ تعلق وہیں آکر رمضان گزارتے ہیں، اس لئے پاکستان میں زیادہ قیام اور کئی مقامات پر جانے کا موقعہ نہ تھا، صرف چار دن قیام کی گنجائش تھی، جو کراچی میں صرف ہو گئے، ۱۹۶۸ء کے بعد (جب رابطۂ عالمِ اسلامی کے ایشیائی اجلاسِ عام کے موقعہ پر پاکستان آنا ہوا تھا، اور مختلف

شہروں میں جانا ہوا تھا[۱]) اب پاکستان کے سفر کی نوبت آئی، اس کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ عزیزی محمد واضح کا ابھی تک پاکستان کا کوئی سفر نہیں ہوا تھا، اعزہ کی بڑی تعداد زیادہ تر کراچی اور کچھ لاہور میں ہے، خاندان کا دو تہائی حصہ خصوصاً ٹونک اور بھوپال کے اعزہ تقسیم کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے، عزیزان رابع و واضح سلمہما کے چچازاد بھائی کراچی میں ہیں، اس لئے وقت کی تنگی، پاکستان کی وسعت، اور وہاں کے تعلقات کی کثرت کے باوجود چار پانچ روز نکال لئے گئے۔

کراچی میں قیام حسب معمول مولوی قاری سید رشید الحسن (نبیرۂ والا جاہ امیر الملک نواب سید صدیق حسن خانؒ والی بھوپال) کے یہاں رہا کہ وہ میری بھانجی کا گھر ہے، قاری صاحب جامع مسجد، بنوری ٹاؤن (نیو ٹاؤن) کے خطیب و امام ہیں، اور یہ مسجد دار العلوم نیو ٹاؤن کے احاطہ میں واقع ہے، اس لئے علماء اساتذۂ مدارس، احباب اور اہلِ تعلق سے ملنے کی سہولت ہے۔

اس چار روزہ قیام میں چھ تقریریں ہوئیں اور سب اہم اجتماعات اور منتخب مجمعوں کے سامنے، پاکستان اس زمانہ میں ایک بڑے سیاسی بحران سے گزر رہا تھا، طلبہ کی تحریک اور ایجی ٹیشن پر چند روز پہلے ہی قابو پایا گیا تھا، اور یونیورسٹی ایک عرصہ تک بند ہونے کے بعد کھلی تھی، حالات نے جو رُخ اختیار کیا تھا، وہ نہ صرف اہلِ پاکستان کے لئے بلکہ ملّتِ اسلامیہ کے بہی خواہوں کے لئے بھی باعثِ تشویش و فکر تھا، کہ یہ مملکت بڑی قربانیوں کے بعد اور بڑی توقعات کے ساتھ قائم ہوئی تھی، اور اس کی بہت بڑی قیمت (چار و ناچار) برصغیر کے مسلمانوں کو ادا کرنی پڑی تھی

---

[۱] تفصیل ملاحظہ ہو "کاروانِ زندگی" جلد دوم باب یازدہم ص ۲۵۳-۲۶۶

پاکستان کے احباب واہلِ تعلق کو نیز ملّت کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں اور اس نوخیز اسلامی مملکت کے بارہ میں فکرمندوں کو جب ہماری آمد کی خبر ہوئی تو مختلف سمتوں، تنظیمات ومجالس سے خطاب کا تقاضہ ہوا، سب کی فرمائش کی تعمیل تو ممکن نہیں تھی پھر بھی فارسی کے اس پرانے شعر پر عمل کرنا پڑا ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

ان تقریروں کا قدرِ مشترک حسب ذیل تھا، جیسا کہ محبِّ گرامی اور رفیقِ قدیم مولانا محمد ناظم صاحب ندوی نے ان تقریروں کے مجموعہ "تحفۂ پاکستان" کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔

١۔ اُمّت اسلامیہ کے تاریخی دشمنوں کے کردار کا ذکر۔

٢۔ پاکستان کے اسلامی تشخّص کی (جو اس کے قیام کا جواز ہے) نہ صرف حفاظت بلکہ اس کو مزید اُجاگر کرنے کی ضرورت۔

٣۔ پاکستان کی عام زندگی کا ایک پہلو جو بہت باعثِ تشویش اور مُوجبِ تنقید ہے، وہ رہن سہن میں اسراف، تقریبات اور مظاہر میں صَرف بے جا کا پہلو اور معیارِ زندگی بلند کرنے کے لئے جنون کی حد تک مسابقت کا جذبہ ہے، جس نے بے شمار معاشرتی خرابیاں، اخلاقی بیماریاں اور زندگی کے مسائل پیدا کر دیئے۔

ملک وقوم کی سطح پر اسلامی معاشرہ کی ضرورت

کراچی کے قیام میں پہلی تقریر ٢٥ مئی کو خطبۂ جمعہ سے پہلے جامع مسجد

بنوری ٹاؤن میں ہوئی، جہاں علماء اور تعلیم یافتہ حضرات کی بڑی تعداد معمولاً جمعہ پڑھنے آتی ہے، اس تقریر کا عنوان "ملک و قوم کی سطح پر اسلامی معاشرہ کی ضرورت" تھا، اس میں تفصیل سے بتایا گیا کہ ظہورِ اسلام اور بعثت محمدیؐ کے وقت انفرادی صلاح و دیانت اور صالح افراد معدوم نہیں ہوئے تھے، قرآن مجید نے بھی اس کا ذکر کیا ہے[1] لیکن اس کا کوئی اثر نسل و تمدنِ انسانی پر، انسانی رجحانات اور زندگی کے رُخ پر نہیں پڑ رہا تھا، یہ برسات کی اندھیری رات میں کرمک شب تاب (جگنو) کی طرح تھے، یا "بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی" ضرورت ملک و قوم کی سطح پر ایک اسلامی معاشرہ کی تھی، جو دنیا کے لئے نمونہ بن سکے اور لوگوں کو دعوت فکر اور دعوتِ انقلاب دے، اسی لئے نبی کی بعثت کے ساتھ (بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ) ایک پوری اُمت کی بعثت عمل میں آئی، اور اس طرح آپ کی بعثت "بعثت مقرونہ" (دوہری) تھی، اس دعوت اور اس اُمت نے ایک ایسے آزاد معیاری و مثالی اسلامی معاشرہ کا نمونہ پیش کیا جس کے نمائندے کسی پہاڑ کی چوٹی یا کسی جزیرہ میں الگ تھلگ زندگی نہیں گزار رہے تھے، ان کے ساتھ حکومت کی ذمہ داریاں بھی تھیں، دولت بھی تھی، طاقت بھی تھی، تجارت اور ذرائع معاش بھی تھے، اور باہر کی دنیا سے تعلقات بھی، انھوں نے زندگی کا ایک نیا نقشہ کامیاب بنا کر پیش کیا، دنیا اسی وقت توجہ اور غور کرنے پر مجبور ہوتی ہے جب پورے معاشرہ کی سطح پر، پورے تمدن کی سطح پر، عالمگیر اسٹیج پر (جس پر تمام دنیا

---

[1] ملاحظہ ہو سورہ آل عمران کی آیات "لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ ..... وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ" (سورۂ آل عمران آیت ۱۱۳ تا ۱۱۵)

کی نگاہیں پڑتی ہیں) صحیح اور مکمل اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کیا جائے، اور قوموں اور ملکوں کی نگاہیں یہ اندازہ لگا سکیں کہ اسلام کا عقیدہ انسان کی زندگی میں یہ تبدیلی پیدا کرتا ہے، اور اللہ کے یہاں سے آئی ہوئی روشنی اور ہدایت کا نور اس کی زندگی کو اس طرح چمکاتا اور سنوارتا ہے، شریعت کی تعلیمات کس طرح کا معاشرہ پیدا کرتی ہیں، کس طرح کا اخلاق پیدا کرتی ہیں، جب تک یہ نہ ہو اس وقت تک انسانیت کیا انسانیت کا کوئی چھوٹا سا کنبہ اور عالم انسانی کا ایک چھوٹا سا گوشہ بھی توجہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

آپ کا ملک اسی دعوے اور اسی دلیل پر قائم ہوا تھا کہ آپ دنیا کو اسلامی معاشرہ قائم کرکے دکھائیں گے، اب آپ غور کریں کہ آپ نے اس دعوے کو کہاں تک پورا کیا اور اس امتحان میں کہاں تک پورے اترے؟

صالح اور طاقتور معاشرہ ہی اقتدار اور تہذیب کی بنیاد اور ان کا اصل سرچشمہ ہے

۲۵ مئی کو مؤتمر عالم اسلامی (کراچی) کی طرف سے بہادر یار جنگ اکیڈمی میں استقبالیہ اور عشائیہ کا انتظام کیا گیا تھا، اس کے اصل محرک ہمارے دوست ڈاکٹر انعام اللہ خاں (رکن تاسیسی رابطۂ عالم اسلامی و سکریٹری مؤتمر عالم اسلامی) تھے، اس میں نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان کی سطح پر بھی چیدہ اور برگزیدہ شخصیتیں اور فضلاء و دانشور اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے، اس میں تاریخی واقعات و حقائق کی روشنی اور علم الاجتماع و علم الاخلاق اور سیاست کی تائید و شہادت سے ثابت کیا گیا، کہ صالح اور طاقتور معاشرہ ہی اقتدار اور تہذیب کی بنیاد اور اس کا

اصل سرچشمہ ہے' اس سلسلہ میں تاتاریوں کے قبول اسلام کے نفسیاتی اسباب اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کی روحانی' اخلاقی اور علمی برتری کا حصہ بتایا گیا، اسی طرح ہندوستان کی مسلم سلطنت کے اتنے عرصہ تک اقتدار اور ملک کی قیادت پر فائز رہنے کا حقیقی سبب بتایا گیا، مسلم معاشرہ میں عمومی طور پر زوال نہ آنے میں صوفیائے کرام کا حصہ اور اس سلسلہ میں علماء و مصلحین کے کردار کی طرف اشارہ کیا گیا، اور آخر میں کہا گیا کہ تاریخ بتاتی ہے کہ بہترین جمہوریتوں کے زمانہ میں بھی جب معاشرہ فاسد (CORRUPT) ہو گیا تو اس نے ان جمہوریتوں کے چراغ گل کر دیئے اور ان کے لئے بقا و ترقی کے جتنے امکانات ہو سکتے تھے' سب ختم کر دیئے۔

صحیح اسلامی اقتدار کی ذمّہ داری اور اس کے برکات

۲۷ مئی کو فاران کلب کی جانب سے کراچی کے مشہور میٹروپول ہوٹل میں ایک عظیم جلسہ کا انتظام کیا گیا جس میں اعلیٰ عہدیدار، شہر کے معززین' اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کثیر تعداد میں موجود تھے' اس تقریر کا محور اور مرکزی نقطہ "صحیح اسلامی اقتدار کی ذمہ داری اور اس کے برکات" تھا، اس تقریر میں بھی صحیح اسلامی معاشرہ' حاکم قوم کے افراد کے امتیازی اخلاق' ان کے ایثار و قربانی' اور زہد و اخلاص کی کارفرمائی اور معجزنمائی کی مثالیں دی گئیں' اور کہا گیا کہ "وہ تکبیر مسلسل" جو وسعتِ افلاک میں گونجی تھی' اب دکانوں میں بھی اس کا نغمہ سنا جانے لگا اور مکانوں میں بھی' بلکہ میدانِ جنگ کے رستخیز میں بھی اس کی آواز پہونچی' آج بھی دنیا کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک نمونۂ حیات دنیا کے سامنے ہو "حیات" جس کا نام ہے' اس کے اندر اضطراب بھی ہے'

اہتزاز بھی، ارتعاش بھی ہے اور جوش بھی، جو ملک اس زندگی کا نمونہ ہو اقوام و ملل کی صف میں وہی عزت کا مقام پا سکتا ہے۔

جاہ طلبی اور حصولِ اقتدار کی چاٹ سب سے بڑا خطرہ

پھر صفائی سے کہا گیا کہ مجھے ایک آزاد اور با اقتدار ملک میں جو کچھ خطرہ محسوس ہوتا ہے، وہ جاہ طلبی سے ہے، حکومت اور حصولِ اقتدار کی اس چاٹ سے جو قوموں کو چاٹ چکی ہے، اور ملک کو کھوکھلا بنا کر رکھ چکی ہے آپ جانتے ہیں کہ ہر زمانہ میں اسلامی مملکت کو جو نقصان پہونچا، وہ مفاد پرستوں سے پہونچا ہے، عباسی عہد سے لے کر سلطنت مغلیہ تک اور اس کے بعد بھی ٹیپو سلطان کے وقت تک، انھیں مفاد پرستوں نے ان سلطنتوں کا خاتمہ کیا، اس کے بعد اگر اندیشہ ہے تو صوبائی تعصّب اور لسانی تعصب سے، یہ حقیقی خطرات ہیں جو آپ کے ملک کو درپیش ہیں، اور آپ کو ان سے خبردار ہونا چاہیئے۔

نوجوانوں میں احساس ذمّہ داری اور ضبط نفس مملکت کی اصل دولت ہے

۲۶ مئی کو کراچی یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کے ایک جلسہ کو خطاب کرنے کا موقعہ ملا جس کی صدارت یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر جمیل جالبی کر رہے تھے، کانوں میں جو روایات پڑی تھیں، اور یونیورسٹی جاتے ہوئے اور خود یونیورسٹی کے دیواروں پر غیظ و غضب کے جو نشانات، اور ذمہ دارانِ حکومت کے لئے جو اہانت آمیز فقرے لکھے ہوئے تھے، وہ نظر سے گذرے اور اس کا طبیعت پر قدرتاً اثر ہوا، اس لئے

تقریر کا رُخ طلبہ اور نوجوانوں کی سیرت و کردار کی طرف رہا اور بتایا گیا کہ ان کی وہ کونسی سیرت و کردار ہے جو ملک کی حفاظت و ترقی کی ضامن ہے؟ میں نے کہا کہ اگر مجھ سے کوئی کسی ملک کی تعریف کرے اور بتائے کہ وہ بڑی فوجی طاقت کا مالک ہے، اس کی معاشیات بڑی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، دنیا کی بڑی طاقتوں سے اس کے بڑے اچھے تعلقات ہیں، اور ان کی نظر میں اس کا بڑا احترام ہے، تو مجھے یہ سُن کر اطمینان نہیں ہوگا، میں کہوں گا کہ مجھے یہ بتایئے کہ وہاں کے اسکولوں او کالجوں سے لے کر یونیورسٹیوں کے طلبہ تک نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں کس درجہ کا احساس ذمّہ داری پایا جاتا ہے، ان میں ضبط نفس کی کتنی طاقت ہے، ان میں اپنے تاثّرات کو حدِ اعتدال میں رکھنے کی کتنی صلاحیت اور قانون کے احترام کی کتنی عادت ہے؟ اگر وہ صاحب کہیں گے کہ اس کی طرف سے تو میں اطمینان نہیں دلا سکتا تو میں کہوں گا کہ پھر مجھے اس ملک کے حال و مستقبل کے بارہ میں کوئی اطمینان نہیں ہے۔

میں نے اہل علم کے مجمع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ میں برطانوی تاریخ (ENGLISH HISTORY) کا طالب علم نہیں ہوں، اس لئے پورے وثوق سے اس اخلاقی اور نفسیاتی انقلاب کے سرچشمہ اور اس کے علمبرداروں کا تعیّن نہیں کر سکتا، جنھوں نے اس وقت برطانوی قوم میں ایک نئی روح پیدا کر دی، جب اس کو ایک وسیع مملکت حاصل ہوئی، اور برِّ صغیر ہند اور اس کے پڑوسی ممالک پر اس کا اقتدار قائم ہوا، یہ موضوع آپ حضرات اور تاریخ کے طالب علموں کو مطالعہ و تحقیق کی دعوت دیتا ہے۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز ان صحرا نشین عربوں کا انقلاب حال تھا

جو صدیوں سے اخلاقی، ذہنی و علمی پستی میں پڑے ہوئے تھے لیکن اسلام نے
ان کی ایسی قلبِ ماہیت کر دی کہ جب دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں کے وہ وارث
اور حاکم و فائز ہوئے تو انھوں نے اپنے کو اس کا اہل ثابت کیا، آپ ہی کے یہاں کے
مشہور شاعر مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے خوب کہا ہے ؎

بات کیا تھی کہ نہ روما سے نہ ایران سے دبے
چند بے تربیت اونٹوں کے چرانے والے
جن کو کافور پہ ہوتا تھا نمک کا دھوکا
بن گئے خاک کو اکسیر بنانے والے

میں پوچھتا ہوں کہ اتنی بڑی مملکت ملنے اور اتنی بڑی ذمہ داری عائد ہونے
کے بعد آپ میں انقلاب کیوں نہیں ہوا؟ آخر میں علامہ اقبال کے اس شعر پر ختم کیا
اور اس کی تشریح کی ؎

تو ہُما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مُرغ و ماہی

ایک آزاد ملک میں علماء کی ذمہ داری

ایک تقریر عزیز گرامی مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی کی خواہش پر جامعۃ العلوم
الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے اساتذہ، فضلائے شہر اور طلبہ کے سامنے ہوئی جس میں
ایک آزاد ملک میں علماء کی ذمہ داری اور ان کی مطلوبہ صفات پر تفصیل اور تاریخی
مثالوں کے ساتھ روشنی ڈالی گئی، پھر ان خطروں کی نشاندہی کی گئی جن کو بعض مرتبہ

باہر سے آنے والا زیادہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، ان میں سے ایک اعتقادی اور سیاسی انتشار ہے، دوسرا علماء کے عوام کے ساتھ رابطہ کی کمی، تیسرا علماء میں عام طور پر ہمارے اسلاف کی طرح زُہد کا رجحان، اس توکّل اور استغناء اور زندگی کی سادگی اور ایثار کی کمی ہے جس میں اسی ملک کی تخصیص نہیں، دوسرے اسلامی ممالک بھی شامل ہیں، اس سلسلہ میں قریبی اسلافِ کرام کی کچھ مثالیں بھی دی گئیں۔

چوتھا تہذیبی و لسانی تعصب اس ملک کے لئے سخت خطرناک ہے اور ہمارے علماء کو اس کو ختم کرنے کے لئے پوری جدّوجہد کرنی چاہئے[1]، پھر میں نے تفاخر بالانساب کی طرح تفاخر بالاسلاف میں غلو و مبالغہ پر تنقید کی، اور کہا کہ ہر وقت اسی کی رٹ لگائے جانا، اور ہر وقت اسی کا وظیفہ پڑھنا کچھ مفید نہیں کہ ہمارے اکابر ایسے تھے، ہمارے اسلاف ایسے تھے، کوئی ملت اور کوئی دعوت تاریخ سے نہیں چلتی، تحریک سے چلتی ہے۔

ہر وقت چوکنّا اور ہوشیار رہنے کی ضرورت

ایک تقریر انجمن اشاعت قرآن عظیم کی طرف سے دیئے ہوئے استقبالیہ میں مسجد فرقانیہ حیدر آباد کالونی میں ۲۶ رمئی کو کی گئی، جس کے داعی و منتظم برادر محترم

---

[1] اس تعصب کے خطرناک و شرمناک ہونے کا مظاہرہ ۱۹۸۶ء کے شروع مہینوں میں کراچی میں سندھیوں پٹھانوں اور مہاجرین کی باہمی جنگ اور اس وحشیانہ خوں ریزی کی شکل میں ہوا، جس سے خود ہندوستانی مسلمانوں کے سر شرم سے جھک گئے اور ان کے لئے یہاں کے فرقہ وارانہ فسادات پر تنقید و تبصرہ مشکل ہوگیا۔

سید محمد جمیل صاحب سابق اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان تھے، اس تقریر کا رہنما و مرکزی خیال فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کا وہ حکیمانہ جملہ تھا کہ" انتم فی رباط دائم" اے مصر کے فاتحو اور حکمراں قوم کے افراد! تم مستقل طور پر محاذ جنگ پر ہو! اور جس کی تشریح اور حالات پر منطبق کرنے کی تفصیل تعز (یمن) کی تقریر میں گزر چکی ہے، یہاں اس موقعہ پر آزاد اسلامی ملک میں اہلِ بصیرت اور اصحاب غیرت کی ذمہ داری کو آشکارا کیا گیا، اور بتایا گیا کہ فتنے صرف خارجی نہیں داخلی بھی ہوتے ہیں، اور وہ زیادہ خطرناک اور دور رس نتائج رکھتے ہیں، اندرونی کمزوریاں جب کسی ملک میں پیدا ہو جاتی ہیں تو اس کو گھن کی طرح کھاتی ہیں، جیسے دیمک برگد یا املی کے درخت کو چاٹ جاتی ہے، وہ کھڑے رہتے ہیں اور دور سے مضبوط نظر آتے ہیں پوری پوری باراتیں ان کے نیچے ٹھہرتی ہیں، لیکن ہوا کے ایک جھونکے سے یہ کوہ پیکر درخت زمین پر آجاتے ہیں، آپ" انتم فی رباط دائم" کو دستور العمل بنالیں، اور ہمیشہ چوکنا اور باخبر، بیدار اور سرگرم کار رہیں۔

۲۹ مئی کو ہم لوگ براہ دہلی لکھنؤ آگئے، دو ہی روز کے بعد رمضان شروع ہو رہے تھے، اس وجہ سے رائے بریلی پہونچ کر اس کے انتظامات اور تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔

تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم (تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ)

"کاروانِ زندگی" کے حصۂ اول میں "تاریخ دعوت و عزیمت" کے سلسلہ کے آغاز کا ذکر تفصیل سے آچکا ہے، اس کی ضرورت اس کے محرکات پر بھی روشنی

ڈالی جاچکی ہے[۱]، اس کی چوتھی جلد جو حضرت مجدد الف ثانیؒ، ان کے دور اور ان کے بے مثال اصلاحی و انقلابی کارنامے کے ساتھ مخصوص ہے، ۱۹۸۰ء میں شائع ہو چکی تھی، اس کا عربی ترجمہ بھی دار القلم کویت سے نکل چکا تھا، مسلسل مصروفیتوں اور اسفار کی وجہ سے اس کے پانچویں حصہ کی تالیف میں (جس کو حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف و خلفاء کے ساتھ مخصوص ہونا تھا) طویل وقفہ ہوا، اور ۱۹۸۴ء میں کہیں جاکر اس کی نوبت آئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی شخصیت حقیقت میں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کے بعد کتاب و سنت کے ذخیرہ پر سب سے زیادہ حاوی اور ان کی پرجوش ترجمان، مجتہدانہ فکر و نظر کی حامل اور تاریخ ساز و عہد آفریں شخصیت تھی[۲]، جہاں تک اس برصغیر کا تعلق ہے، اس میں تو بلاشبہ وہ اس دور کے بانی ہیں، جس کی بنیاد مسلک اہلِ سنت، فکر و تحقیق، تدریس و اشاعتِ کتاب و سنت، اصلاحی و مجاہدانہ تحریکات، مدارس کے قیام اور ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے تحفظ و تشخص کی حفاظت پر ہے، وہ دور ابھی تک چل رہا ہے اور بظاہر چلے گا، حیرت کی بات ہے کہ اس دورِ سوانح نگاری و تاریخ نویسی میں کسی کو حضرت شاہ صاحب کی مفصل سیرت و سوانح اور ان کے اصلاحی و علمی کارناموں اور ان کے مقامِ تحقیق اور ممتاز فہم و تفہیم دین کے کام و مقام کی پردہ کشائی کی نوبت نہیں آئی، حالانکہ یہ آپ سے کسی طرح کی نسبت رکھنے والے اہلِ علم و اہلِ قلم کے ذمہ قرض تھا، ممالک عربیہ اور مصر و شام و حجاز تو ایک طرف رہے،

---

[۱] "کاروانِ زندگی" حصہ اول ص ۴۱۱-۴۱۷

[۲] بلکہ بعض حیثیتوں سے امام ابن تیمیہؒ سے زیادہ جامع اور ہمہ گیر شخصیت تھی۔

جہاں ان کی علمی اور تحقیقی شاہ کار کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" بلا کسی مقدمہ مصنف کے تعارف معقول حواشی کے چھپتی رہی خود ہندوستان میں یہ خلا چلا آ رہا تھا، راقم کے خاندان کی کئی پشتوں کا تعلق حضرت شاہ صاحب کے خاندان اور اس کی تعلیم و تربیت اور روحانی سلسلہ سے رہا ہے، اس لئے اس کا تقاضہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ توفیق اس کے حصہ میں آئے بالآخر اس کو توفیق ہوئی کہ وہ اس حصہ کی تکمیل کر کے "تاریخ دعوت و عزیمت" کے سلسلہ کو اپنے اس منصوبہ اور پیمانہ کے مطابق جو اس کے سامنے تھا، ہندوستان کے دور تک مکمل کر دے[1]۔

لیکن یہ کام آسان نہیں تھا، اس کے لئے بارہویں صدی کے عالم اسلام پر علمی، دینی، فکری اور سیاسی حیثیت سے نظر ڈالنی ضروری تھی، اسی طرح اس صدی کے ہندوستان کا بھی مکمل جائزہ لینا تھا، پھر شاہ صاحب کے تجدیدی کارناموں اور ان کی خصوصیات پر نظر ڈالنی تھی، خصوصیت کے ساتھ شریعتِ اسلامی کی مدلّل و مربوط ترجمانی اور اسرار و مقاصد حدیث و سنّت کی نقاب کشائی اور ان کی دو معرکۃ الآراء کتابوں "حجۃ اللہ البالغۃ"

---

[1] حضرت شاہ صاحب کے بعد کے دور کی بھی متعدد اصلاحی و دینی شخصیتوں اور قائدین پر مصنف کے قلم سے پہلے سے کتابیں نکل چکی ہیں، جن میں سب سے اہم اور مفصل "سیرت سید احمد شہیدؒ" (۱-۲) ہے جو ایک ہزار صفحات سے زیادہ میں مکمل ہوئی، اور جس کا مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" لکھنؤ نے حال میں ساتواں ایڈیشن شائع کر کے سلسلہ "تاریخ دعوت و عزیمت" کے سلسلہ کی آخری کڑی بنا دیا ہے، اسی طرح "مولانا محمد الیاس صاحبؒ ان کی دینی دعوت" کے نام سے مصنف کے قلم سے مولانا کی وفات (۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء) کے بعد ہی نکل چکی ہے۔

اور "ازالۃ الخفاء" کا تعارف کرانا تھا، پھر بارھویں صدی ہجری کے سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دور احتضار میں شاہ صاحب کے مجاہدانہ وقائدانہ کردار کی نقاب کشائی، امت کے مختلف طبقات کا انھوں نے جس طرح احتساب کیا، اور ان کو دعوتِ اصلاح وانقلاب دی، ان کا بھی خلاصہ پیش کرنا تھا، آخر میں فرزندانِ گرامی قدر اور خلفاءِ عالی مرتبت کا ذکر کرنا بھی ضروری تھا، جنھوں نے اس دور کی تعمیر میں گرانقدر حصہ لیا، اور انھیں کے اثر سے اشاعت وتبلیغ قرآن، حدیث کی تدریس وترویج، نصرتِ سنّت اور ردِّ بدعت کی تحریک عمل میں آئی اور پھر ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک جہاد اور سعیِ احیاءِ خلافتِ اسلامیہ وجود میں آئی۔

الحمد للہ کتاب ۱۹۸۴ء کے ابتدائی مہینوں میں تکمیل کو پہونچ گئی، اور مئی میں وہ شائع ہوکر باہر آگئی، اس کتاب کی قیمت کو بڑھانے والی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں "حجۃ اللہ البالغۃ" و "ازالۃ الخفاء" (جس کے مکمل وعمیق مطالعہ کی نوبت بہت سے اہل علم کو بھی نہیں آتی اور روز بروز عربی اور فارسی زبانوں سے بُعد اور علمی سطح کے بلند نہ ہونے کی وجہ سے یہ کتابیں ایک مختصر طبقہ میں محدود ہوکر رہ گئی ہیں) کا خلاصہ کتاب میں آگیا ہے، کتاب کا عربی میں عزیزی سید سلمان ندوی کے قلم سے ترجمہ ہوگیا اور دار القلم کویت سے شائع بھی ہوگیا، اس طرح اردو میں (اور ترجمہ کے ذریعہ عربی میں) تاریخ اسلام کی اصلاحی وتجدیدی کوششوں اور ان کی علم بردار شخصیتوں کی ایک مرتّب اور مسلسل روئیداد

آگئی، جو ابھی تک کسی دوسرے اسلامی ملک کی زبان میں مرتب نہیں ہوئی تھی، لیکن افسوس ہے کہ اس تحتی براعظم میں ابھی اس سلسلہ کی اہمیت وافادیت پورے طور پر نہیں سمجھی گئی، اور اس سے وہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا' جس کی اس دور اور اس ملک میں ضرورت ہے۔

باب سوم

ہندو احیائیت کی ہمہ گیر تحریک، مسز اندرا گاندھی کے نام ایک تاریخی خط، اندراجی کا قتل اور سکھوں کے خلاف اس کا ردِ عمل اور میرا موقف، حجازِ مقدس کا ایک سفر، پیامِ انسانیت کا ایک دورہ، انگلستان و بلجیم کا سفر

ہندو احیائیت کا طوفان اور ملّتِ اسلامیہ کے لئے خطرہ

ناظرین کتاب کی دوسری جلد میں پڑھ چکے ہیں کہ اگست ۱۹۷۹ء میں جنتا حکومت جو ۱۹۷۷ء کے انتخاب کے نتیجہ میں قائم ہوئی تھی، ختم ہو گئی، ۱۹۸۰ء کے جنرل الیکشن کے نتیجہ میں اس حکومت کا خاتمہ ہوا، اور کانگریس "آئی" پھر برسرِ اقتدار آگئی، ایک ایسی با اصول جماعت کی حیثیت سے جس کا ایک خاص تاریخی پس منظر، ایک مخصوص طریق کار، ملک کی تعمیر و ترقی کے سلسلہ میں ایک اخلاقی معاہدہ اور فیصلہ اور واضح اعلانات ہیں، حکومت اور خاص طور پر اس کی رہنما اور سربراہ وزیر اعظم اندراجی سے توقع تھی کہ وہ سختی سے کانگریس کے اصولوں اور اس کے اعلانات کی پابندی کریں گی، ملک کے مختلف فرقوں خاص طور پر غیر مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے درمیان باہمی اعتماد اور گہرے اتحاد کی مخلصانہ اور پُرعزم کوشش کریں گی، اور کسی ایسی تحریک اور کوشش کو کامیاب ہونے کا موقعہ نہیں دیں گی، جو باہمی منافرت، تشدّد اور جارحیت کو ہوا دے اور کسی فرقہ

یا اقلیت کی توانائیوں، صلاحیتوں اور جذبۂ عمل کو ملک کے دفاع، اس کی سالمیت کی حفاظت اور اس کو تعمیر و ترقی دینے کے عمل کے بجائے (جس کی ملک کو اس وقت سخت ضرورت تھی، اور اس کے بغیر کوئی جمہوریت پنپ نہیں سکتی) ان توانائیوں اور صلاحیتوں اور قوتِ عمل کو اپنے دفاع، اپنے ملّی تشخّص کی حفاظت اور ان اقدار (VALUES) و عقائد اور شعائر کی حفاظت پر مرکوز کر دے جو اس کو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہیں۔

لیکن موجودہ الیکشنی نظام کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں مقصد کے حصول کے سلسلہ میں وسائل کے جائز و ناجائز، اور صالح و غیر صالح ہونے سے کلّیتہً صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے، اور اس مغربی سیاست اور فلسفۂ اخلاق کے قدیم اصول "مقصد کی صحت ہر طرح کے وسائل کو حق بجانب بنا دیتی ہے" (THE END JUSTIFIES THE MEANS) کو پورے طور پر قبول کر لیا جاتا ہے، پھر جب وسائل مقصد کو کامیاب بنا دیتے ہیں، تو ان سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں ہوتا، اسی طرح حکومت کی بقا کے لئے اصولوں و معیاروں اور ضمیر و اخلاق سے بھی چشم پوشی کرنی پڑتی ہے، اور ہر ایسی چیز سے احتراز کرنا پڑتا ہے، جو حکومت کو نامقبول بننے یا کسی بااثر جماعت کی ناپسندیدگی یا عتاب کا نشانہ بننے کا موقع دے۔

اپنی صنفی کمزوری اور اس کے نتیجہ میں احساس کہتری، یا مشیرانِ کار کے رُجحان اور مختلف ریاستوں کے ذمہ دارانِ حکومت کے عام رجحان اور انگریزی ہندی پریس کے ایک طوفانی مُہم کے نتیجہ میں برسرِ اقتدار پارٹی اور نئی حکومت نے مسلم مخالف پروپیگنڈہ، ہندو احیائیت کی تحریکوں اور تشدّد و جارحیت

(VIOLENCE) کے رجحان کے بارہ میں کانگریس کی قدیم اصول پسندی، اور گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدّد (NON-VIOLENCE) کے پابند رہنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور اس میں اس نے تساہل و تغافل سے کام لینا شروع کیا، اور ہندو احیائیت کی صوبائی و ملک گیر تحریکوں، بالخصوص وِشو ہندو پریشد (ہندوؤں کی عالمی تہذیب) مہاراشٹر کی شیو سینا اور آر۔ ایس۔ ایس کو کام کرنے کی پوری آزادی دے دی۔

اہم اور تاریخی مساجد کو مندروں میں تبدیل کرنے کا مطالبہ

وِشو ہندو پریشد نے ۷، ۸ر اپریل ۱۹۸۴ء کو ایک خفیہ اجلاس منعقد کیا، اس میں ملک بھر کے ہندو انتہا پسند شریک ہوئے، اس میں جہاں مسلمانوں کی اجتماعی و ملی نسل کشی کے لئے تجاویز پیش کی گئیں، جس کے نتیجہ میں مسلمان نام کی کوئی ممیز جماعت اس ملک میں باقی نہ رہے، اس کے ساتھ بنارس کی گیان باپی مسجد، متھرا کی عیدگاہ اور اجودھیا کی بابری مسجد کو (جس کے متعلق ہندو عوام کو باور کرایا گیا کہ یہ رام جنم بھومی تھی[1] بابر نے اس کو منہدم کرا کے مسجد تعمیر کی) کو آزاد کرا کے اول الذکر کو

---

[1] اس افواہ اور پروپیگنڈہ کی تردید میں "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" دار المصنفین اعظم گڑھ اور متعدد مسلمان و ہندو دانشوروں، مؤرخین و انصاف پسندوں کے قلم سے متعدد مضامین و رسائل اور کتابیں نکلی ہیں، جن میں ثابت کیا گیا ہے کہ اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے، کہ بابر نے یہاں کسی مندر کو منہدم کر کے مسجد میں تبدیل کیا، نیز اس کا رام جنم بھومی ہونے کا بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں، اور اگر ہے بھی تو وہ مسجد سے (باقی ص۸۲ پر)

وِشنو ناتھ کا مندر، ثانی الذکر کو کرشن جنم بھومی، ثالث الذکر کو رام جنم بھومی میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا تھا، اور ہندوستان کی پوری انگریزی، ہندی صحافت پورے جوش و خروش کے ساتھ اس کی تائید و اشاعت میں منہمک ہو گئی، یہ ایک بڑے طوفان کی نشانی تھی، جو اُفق سے ابھر رہا تھا، اور پورے ملک پر چھایا چلا جا رہا تھا، اس کی موجودگی میں نہ صرف یہ کہ اس ملک میں کوئی دینی، ملّی، تعلیمی، تصنیفی کام اطمینان سے نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ خود ملّت کا بحیثیت ملّت کے وجود خطرہ میں تھا۔

ناچیز مصنّف کو اللہ تعالیٰ نے اس مخصوص ماحول کی برکت سے جس میں اس کا ذہنی و علمی نشو و نما ہوا، نیز قرآن کے تدبّر اور تاریخ کے مطالعہ سے اتنی عقل عام (COMMON SENSE) اور حقیقت پسندی عطا فرمائی تھی کہ اپنے سارے علمی و ادبی ذوق، مطالعہ کے انہماک، اندرونی و بیرونی دعوتی سرگرمیوں، مشرقِ وسطیٰ اور بلادِ عربیہ کے حالات و مسائل سے گہری دلچسپی اور وابستگی کے ساتھ اُس نے یہ سمجھ لیا کہ اگر ہندوستان میں اس ہندو احیائیت و جارحیت اور ملّت کو درپیش خطرات سے صرفِ نظر کیا گیا تو خاکم بدہن اس ملک کے اسپین دوم بن جانے کا خطرہ ہے، جس کا عرصہ سے ہندو احیائیت پسند عناصر خواب دیکھ رہے ہیں۔[۱]

(باقی ص ۸۱ کا) باہر فاصلہ پر اس سلسلہ میں ناظم دار المصنفین سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم، اے کی محققانہ کتاب "بابری مسجد تاریخی پس منظر اور پیش نظر کی روشنی میں" خاص طور پر قابل مطالعہ ہے، خود متعدد ہندو دانشوروں اور فاضلوں نے اس موضوع پر اخلاقی جرأت اور انصاف پسندی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے، جن میں ڈاکٹر آر۔ ایل شکلا اور چیدا نند داس گپتا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

[۱] مجھے بعض واقف کاروں نے بتایا کہ تقسیم ملک کے وقت کئی لائبریریوں سے وہ کتابیں بکثرت ایشو ہوئیں جو انگریزی میں اسپین اور اس سے مسلمانوں کے تخلیہ کے موضوع پر لکھی گئی تھیں، اور اب بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی مؤثر کوشش خود ایک ایسی شخصیت کو اس خطرہ سے آگاہ کرنا تھا جو بیک وقت ملک کی سب سے بااختیار شخصیت (پرائم منسٹر) اور اسی کے ساتھ حکمران پارٹی اور ملک کو آزاد کرانے والی جماعت کانگریس کی صدر تھی، اس لئے اپنی خاندانی روایات، اُفتادِ طبع اور اپنی حیثیت ("ایاز قدرِ خود را بشناس" کے مقولہ واصول) کو سامنے رکھتے ہوئے بھی اکتوبر ۱۹۸۴ء کے تیسرے ہفتہ میں میں نے مسز اندرا گاندھی کے نام ایک مفصل خط لکھا، اور اس کو قابلِ اعتماد ذریعہ سے پہونچانے کی کوشش کی، لیکن تقدیری بات کہ اس کے پہونچنے سے پہلے (ان واقعات کے نتیجہ میں جو اس حادثہ کا سبب بنے اور جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں[1]) ۳۱ر اکتوبر کو وہ واقعۂ ہائلہ پیش آگیا جو سب کو معلوم ہے۔

اس خط کی افادیت واہمیت ان کے انتقال کے بعد بھی قائم ہے بلکہ پہلے سے بڑھ گئی ہے، اس میں نہ صرف اس احیائیت کے خطرہ سے آگاہ کیا گیا ہے، جو ایک طوفان کی طرح اٹھا تھا، بلکہ اس اخلاقی انارکی اور کرپشن کی ہولناکی کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے، جو ملک کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا، وہ نہ صرف ملک کے قائدین، سربراہانِ حکومت، انتظامیہ کے ذمہ داروں اور ملک کے دانشوروں کے مطالعہ کے لائق ہے، بلکہ خود مسلم جماعتوں کے قائدین اور مسلم دانشوروں اور سیاست کاروں کے پڑھنے اور سامنے رکھنے کے قابل ہے کہ خود ان کا بھی یہی طریقِ فکر اور ذمہ دارانِ حکومت

---

[1] جس کا سب سے زیادہ واضح اور طاقتور محرک سکھوں کے سُنہرے گردوارہ (GOLDEN TEMPLE) اور دربار صاحب پر فوجی کارروائی اور خالصتان کے مطالبہ کے سلسلہ میں سکھ تنظیم کے خلاف (جس نے اس عبادت گاہ کو اپنا مرکز بنایا تھا) فوجی اقدام اور اس کے نتیجہ میں سکھ فرقہ کا ردِ عمل تھا۔

اور ملک کے سچے بہی خواہوں کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا طریقہ (APPROACH) ہونا چاہیئے خط انگریزی میں تھا، اس کا اصل اردو مسوّدہ لفظ بہ لفظ پیش کیا جا رہا ہے کہ اب وہ ایک تاریخی امانت اور دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مسز اندرا گاندھی کے نام تاریخی خط

محترمہ اندرا گاندھی صاحبہ وزیر اعظم ہند، تسلیمات و آداب!

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے تحریری طور پر مجھے ایسے موقعہ پر اپنے معروضات پیش کرنے کا موقعہ دیا ہے، جب ملک ایک اہم اور فیصلہ کن موڑ پر پہونچ رہا ہے، اور اس وقت اس کو جرأت، ذہانت اور خلوص کے ساتھ ایک ایسا رُخ دینے کی ضرورت ہے، جس کے ذریعہ اہلِ ملک کو غیر ضروری مشکلات، بدگمانیوں اور انتشار سے بچایا جا سکے، اور اس کو زیادہ مستحکم اور متحد بنایا جا سکے۔

میں اس وقت آپ کا قیمتی وقت جزئی مسائل، ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت (مسلمانوں) کی شکایات و ضروریات کے تذکرہ میں صرف نہیں کروں گا، جو بارہا آپ کے اور آپ کی مؤقّر حکومت کے سامنے پیش ہو چکی ہیں اور آپ ان سے ناواقف نہیں ہیں، میں اس وقت جو کچھ عرض کروں گا، وہ ہندوستان کے عمومی مفاد میں اور اصولی انداز میں ہوگا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے اس ملک کے بقاء، ترقی، عزّت و استحکام اور اس کا معاصر دنیا اور اس خطرناک و پیچیدہ عالمی صورتِ حال میں اپنا شایانِ شان کردار ادا کرنے کے لئے صحیح، محفوظ، باعزّت اور بے خطر راستہ وہی ہے جو تحریکِ آزادی کے

مخلص دانشور اور بلند قامت وقیمت رہنماؤں (آپ کے والد محترم) پنڈت جواہرلال نہرو، مولانا آزاد اور ان کے ساتھیوں نے تجویز کیا تھا، اور وہ سچے سکولرزم، صحیح جمہوریت اور ہندو مسلم اتحاد کا راستہ ہے خواہ وہ کتنا ہی طویل اور مشکل ہو، اس کے علاوہ جو راستہ تجویز کیا جائے گا، اس سے خواہ عارضی و وقتی طور پر کامیابی حاصل ہو ملک کے لئے تباہ کن اور ان قربانیوں پر پانی پھیرنے والا ہے، جو جنگ آزادی میں عمل میں آئیں، اور ملک کو ایسی مشکلات و مسائل سے دوچار کرنے والا ہے، جن کا کوئی حل نہیں ہے۔

پہلی چیز جس کو میں مذہب، انسانی تاریخ، فلسفہ اور اخلاق کا ایک طالب علم ہونے کے ناتے عرض کرنا چاہتا ہوں اور مجھے اندیشہ ہے کہ شاید دوسرا شخص جس پر سیاسی طرز فکر غالب ہے نہ کہے گا، وہ یہ کہ اس ملک کے لئے دو خطرے بڑے تشویشناک ہیں، اور آپ کی پہلی توجہ کے مستحق، ایک ظلم و تشدّد کا رجحان، انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کی بے قیمتی (خواہ اس کا تعلق کسی فرقہ سے ہو) جس کا ظہور فرقہ وارانہ فسادات طبقاتی اونچ نیچ کی بناء پر پورے پورے خاندانوں اور محلّوں کی صفائی، تھوڑے سے مالی فائدہ کے لئے انسان کی جان لے لینا، سفّاکانہ جرائم اور مظالم کی کثرت اور سب کے آخر میں لیکن سب سے زیادہ شرمناک حقیقت مطلوب و متوقع جہیز نہ لانے پر نئی بیاہی دُلہنوں کو جلا دینا یا زہر دے کر مار دینا اور ان سے پیچھا چھڑانا ہے۔

جو لوگ مذہب پر یقین رکھتے ہیں، ان کے لئے تو یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا جو ماں سے زیادہ محبت

کرنے والا اور مہربان ہے اس عمل سے خوش نہیں ہو سکتا، اور اس کو زیادہ دن برداشت نہیں کرے گا، اور اس کے نتیجہ میں ہزاروں کوششوں اور قابلیتوں کے باوجود کوئی ملک پنپ نہیں سکتا اور وہ معاشرہ زیادہ دن باقی نہیں رہ سکتا، لیکن جو لوگ مذاہب پر اعتقاد نہیں رکھتے، وہ اس تاریخی حقیقت سے واقف ہیں کہ اس سے کم درجہ کے ظلم اور سفاکی کی وجہ سے بڑی بڑی شہنشاہیاں اور وہ تہذیبیں جن کا کسی زمانہ میں ڈنکا بجتا تھا، اور آج بھی تاریخ و ادب کے صفحات پر ان کے روشن نقوش ہیں، زوال کا شکار ہو گئیں، اور داستان پارینہ بن کر رہ گئیں، اس صورتِ حال کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے، سیاسی مسائل اور انتخابی مہم سے زیادہ اس کے خلاف طوفانی مہم چلانے کی ضرورت ہے، اس کے لئے گاؤں گاؤں، محلہ محلہ جانے کی ضرورت ہے، سخت قوانین، عبرتناک سزاؤں، ابلاغِ عامہ (PUBLIC MEDIA) کے ذرائع سے کام لینے اور انتظامیہ (ADMINISTRATION) کو سخت سے سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، ورنہ "نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

اس سلسلہ کی دوسری چیز ہندو احیائیت (HINDU REVIVALISM) کی تحریک، ہندو پریشد، شیوسینا، آر ایس ایس اور فرقہ پرستی اور جارحیت و تشدد کے کھلے رجحانات کے سلسلہ میں ادنیٰ سی رعایت، لچک اور نرمی ہے، جس سے وقتی طور پر خواہ کچھ فائدہ پہونچ جائے یا پریشانی سے بچا جا سکے، ملک کو زمین دوز اور دھماکہ خیز سرنگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ہے، جو بالآخر ملک کو لے ڈوبے گی، گاندھی جی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ فرقہ وارانہ منافرت، تشدد اور جارحیت

پہلے ملک کی آبادی کے دو اہم عنصروں (ہندو مسلم فرقوں) کے درمیان اپنا کام کرے گی، پھر یہی ذیلی مذہبی اختلافات، طبقات اور برادریوں کی صف آرائی اور نسلی، لسانی، صوبائی و علاقائی تعصبات کی شکل میں ظاہر ہوگی، اور جب یہ کام بھی ختم ہو جائے گا، تو وہ آگ کی طرح (جب اس کو جلانے کے لئے ایندھن نہ ملے تو اپنے کو کھانے لگتی ہے) ملک کو اور امن پسند شہریوں کو اپنا لقمہ بنالے گی اور یہ ملک تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

اس لئے اس جارحانہ احیائیت (AGGRESSIVE REVIVALISM) تشدد، ایک ہی فرقہ سے مطالبات اور اس پر تنقید کا سلسلہ، اپنے کو بالکل بدل دینے اور اپنے ملی و تہذیبی و مذہبی تشخصات سے دست بردار ہو جانے کا مسلسل مطالبہ سیکڑوں اور ہزاروں برس کی سوئی ہوئی بلکہ مری ہوئی تاریخ کو دوبارہ جگانا اور زندہ کرنا، جو تبدیلیاں صدیوں پہلے (اچھی یا بری) ہوئیں اور ان کو اس ملک کے حقیقت پسند، فراخ دل اور غیرت مند شہریوں نے صدیوں گوارا کیا، ان کے سفر کو پہلے قدم سے شروع کرنا اور ان کی تلافی کی کوشش، اس ملک کو ان نئے مسائل و مشکلات سے دوچار کرے گی جن کا مقابلہ کرنے کی اس ملک کو نہ فرصت ہے نہ ضرورت، اور اس طرح حکومت، انتظامیہ اور دانشور طبقہ کی توانائی بے محل صرف ہوگی، جس کی ملک کو اپنے تعمیری کاموں، سالمیت و استحکام میں ضرورت ہے، اس لئے اس شگاف کو جبکہ وہ معمولی توجہ اور مسالہ سے بند ہو سکتا ہے، اس سے پیشتر بند کر دیا جائے، جب وہ ہاتھیوں سے بھی بند نہیں ہو سکے گا، ملک کے اس عمومی و بنیادی مفاد کی خاطر کسی کی ناراضگی یا الیکشن کے نتائج پر اثر پڑتے یا کسی ریاستی و مقامی

انتظامیہ کی ناگواری کا خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ملک ان سب چیزوں سے زیادہ عزیز اور اصول، مصالح و فوائد پر مقدم ہے، اور یہ محض اصول پسندی ہی کا تقاضہ نہیں ہے، دوربین، حقیقت پسند اور گہری سیاست کا بھی تقاضہ ہے، آپ کی غیر معمولی ذہانت، معاملہ فہمی اور اشاروں سے پورے مضمون اور مسئلہ کو سمجھ لینے کی خداداد صلاحیت کے پیش نظر میں اس سے زیادہ شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

تیسری چیز جو فوری توجہ کی مستحق اور تشویش کا باعث ہے وہ اخلاقی وانتظامی انتشار (CORRUPTION) ہے جو اس حد تک پہونچ گیا ہے جس کی نظیر کم سے کم مجھے اس ملک کی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملی، آپ اس سلسلہ میں سرکاری رپورٹوں اور ملک کے نظم ونسق کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور ترقی کو نہ دیکھئے، عام شہریوں متوسط درجہ کے آدمیوں، اور ان لوگوں سے پوچھئے جن کا عدالتوں، دفاتر، ریلوے، ہوائی سروس، پولیس، تھانوں، ٹیلیفون، اسپتالوں، سرکاری ٹھیکوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے کام پڑتا رہتا ہے، رشوت کے بغیر ادنیٰ درجہ کا کام نہیں ہوسکتا، پیسہ کے ذریعہ ہر کام کرایا جاسکتا ہے، ہر مجرم کو چھڑایا جاسکتا ہے، ہر شریف انسان کو پھانسا جاسکتا ہے، ہر طرح کا غلط فیصلہ حاصل کیا جاسکتا ہے، ہر جگہ فساد کرایا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ ملک کے راز بھی بیچے جاسکتے ہیں، دواؤں اور غذاؤں میں ملاوٹ ہورہی ہے، طبّی امداد ملنی مشکل ہورہی ہے، مریضوں کے لئے جو انتظامات ہیں، وہ بیکار جارہے ہیں، سنگدلی اپنی انتہا کو پہونچ گئی ہے، ریلوے، ہوائی سروس میں رشوت کی گرم بازاری سے حکومت کو روزانہ لاکھوں

کروروں روپے کا نقصان ہو رہا ہے، اس سب کی جڑ میں پیسہ کی حد سے بڑھی ہوئی محبت، خدا کا خوف دل سے نکل جانا اور انسان سے ہمدردی، ملک سے وفاداری اور اس کے مفاد کو ترجیح دینے اور اس کے نقصان کا خیال رکھنے کے جذبہ کا ختم ہو جانا ہے، ایسی صورت میں ملک صنعتی طور پر، سیاسی طور پر اور خارجی تعلقات کی بنیاد پر، ترقی اور تعلیم کی اشاعت اور خواندگی کا تناسب بڑھ جانے کے باوجود تیزی سے زوال کی طرف جا رہا ہے، لوگ زندگی سے عاجز ہیں، اور آخری شرم و ناکامی کی بات یہ ہے کہ انگریزوں کے دورِ غلامی کو یاد کرتے اور اس کی تمنا کرتے ہیں، جب انتظامیہ چوکس تھی، ریلیں وقت پر چلتی اور پہونچتی تھیں، ہسپتال اطمینان و خوشی اور خدمت و راحت کے ٹھکانے تھے، نوجوان اپنی محنت و لیاقت سے پاس ہوتے تھے، تقرریاں اور ترقیاں قابلیت اور استحقاق کی بناء پر ہوتی تھیں، اب یہ سب چیزیں خواب و خیال ہو گئیں۔

یہ تین چیزیں فوری توجہ کی مستحق ہیں، اور انھیں کی بنیاد پر مستحکم اور دیرپا حکومت قائم ہو سکتی ہے، اس سلسلہ میں اتنا عرض کرتا چلوں کہ اس میں طریقِ انتخاب، ووٹرس کو ہر حال میں خوش رکھنے، حلقہائے انتخاب کے نمائندوں کی ہر بات ماننے، پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبران کو ہر طرح کی ایسی رعایت دینے کو خاص دخل ہے کہ وہ جو غلط کام کرا سکیں ان کو کھلی چھوٹ ہے، اور پارلیمنٹ کی ممبری ایک ایسی سونے کی چڑیا، یا قدیم زمانہ کا افسانوی پرندہ "ہما" ہے کہ جس کے سر پر بیٹھ جائے اس کو بادشاہی مل جائے۔

آخر میں ایک بات ایک مذہبی انسان اور تاریخِ عالم اور سیاسیاتِ قدیم وجدید

کے ایک طالب علم و مصنّف کی حیثیت سے اور کہنا چاہتا ہوں کہ تاریخ و تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ سب سے بڑی سیاست "خلوص" ہے، آخر میں اسی کی فتح اور اسی کے حامل کو کامیابی حاصل ہوتی ہے، اور وہی ہوشیار ہے جو دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو فدائی بناتا ہے، اور بالآخر کامیابی دلاتا ہے، یہی وہ خلوص ہے جس کا ماں کی مامتا میں، پیغمبروں اور بے لوث درویشوں کی شفقت میں، ملکوں کو آزاد کرانے والوں اور اپنے خاندان اور عزیزوں کو بھول کر ملک و قوم کی خاطر بیگانوں کو ترجیح دینے والوں اور ذاتی و خاندانی سربلندی کے بجائے ملک کی طاقت و عزت کو مقدم رکھنے والوں کی بلند نگاہی میں اظہار ہوا ہے، اور اب بھی ہندوستان جیسے عظیم ملک اور مختلف المذاہب اور مختلف الاقوام معاشرہ اور نئے نئے مسائل کا مقابلہ کرنے والے عہد کو یہی "خلوص" بچا سکتا ہے، اور ہمیں آپ سے اسی کی امید اور اسی کی ضرورت ہے۔

اپنی طویل تحریر کے لئے آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ اس کو دردِ دل اور حالات کی سنگینی نے طویل کر دیا۔

آپ کا

ابوالحسن علی

لکھنؤ — ۲۴ر اکتوبر ۱۹۸۴ء

مسز اندرا گاندھی کا قتل اور اس کا ردِ عمل

۳۱ / اکتوبر ۱۹۸۴ء کی تاریخ تھی، اور میں حسب معمول اپنے تصنیف و مطالعہ کے گوشہ میں لکھوانے میں مشغول تھا کہ عزیزی عبدالرحمن بٹ ندوی نے جو میرے خانگی کتب خانہ کے ذمہ دار اور معاون ہیں، دہلی کے ایک ٹیلیفون کے حوالہ سے اطلاع دی کہ وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی پر قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ اس کے نتیجہ میں جانبر نہیں ہو سکیں، اس ناگہانی اطلاع نے دل و دماغ پر شدید اثر ڈالا، اور اعصاب کو ہلا کر رکھ دیا، سب سے پہلے گاندھی جی کے واقعۂ قتل کی طرح اس کی فکر پیدا ہوئی کہ یہ کسی مسلمان کی مجنونانہ حرکت نہ ہو جس کے نتیجہ میں سارے ہندوستان میں مسلم کُشی کی ایک ایسی لہر دوڑ جائے جس پر حکومت کو بھی قابو پانا ناممکن ہو جائے، لیکن عبدالرحمن بٹ نے تھوڑی دیر کے بعد اطلاع دی کہ معلوم ہوا ہے کہ یہ حفاظتی (SECURITY) دستہ کے چند سکھ سپاہیوں کی حرکت ہے، یہ معلوم کر کے میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

اس حادثہ کے ردِ عمل میں سکھ فرقہ کے خلاف بالعموم ایک شدید ردِ عمل اور غم و غصہ کی ایک لہر سارے ملک میں دوڑ گئی، جو دانشمندی، انصاف و اعتدال کے تمام حدود سے تجاوز کر گئی، قدرتی طور پر اس کا سب سے زیادہ ظہور دارالسلطنت دہلی میں ہوا، یہاں کہا جاتا ہے کہ پانچ ہزار کے قریب سکھ مقتول ہوئے، تعداد سے بڑھ کر قتل و انتقامی کارروائی کی نوعیت اور سفاکی و سنگدلی کی لرزہ خیز کیفیت تھی، کتنے مقامات پر سکھوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی، کتنوں کو

اسکوٹر یا کسی ستون سے باندھ کر جلا دیا گیا، پھر ان کی دکانوں کو جا بجا لوٹا گیا، جس میں (عام شہرت کے مطابق بعض مقامات پر پولیس کے اشارہ اور کم سے کم اغماض اور تغافل کو بھی دخل تھا) کئی مقامات و مواقع پر مسلمان بھی اپنی عام بے تربیتی، ناخدا ترسی اور دولت کی ہوس کی بنا پر ان واقعات میں ملوّث پائے گئے، اور انھوں نے بھی لوٹ مار میں حصّہ لیا۔

مجھے جب اس کا علم ہوا تو میں نے اپنا فرض سمجھا کہ اس کے خلاف آواز بلند کروں، کم سے کم مسلمانوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کروں، یہ لٹا ہوا مال ہماری قیام گاہ دائرہ شاہ علم اللہؒ (تکیہ کلاں) کے قریب کے گاؤں اور محلوں تک بھی پہونچا، میں نے اپنی مجلسوں میں کہنا شروع کیا کہ "جن گھروں میں یہ مال آئے گا، ان میں بیماریاں اور آفتیں آئیں گی" میرا یہ فقرہ شہر میں بھی پہونچ گیا اور اس کی شہرت ہوئی، اس کا اتنا نتیجہ نکلا کہ بعض بعض مسلمانوں نے اس پیشین گوئی سے ڈر کر یہ لٹا ہوا مال واپس کر دیا، اور بعض نے اس سے احتراز کیا، سکھوں کو بھی اس کا علم ہوا، اور وہ کئی دن تک انفرادی اور بعض اوقات اجتماعی طور پر میرے پاس آتے رہے، اور بعض میرے پاؤں چھو کر اس کا شکریہ ادا کرتے رہے، باہر سے آنے والے سکھوں نے بھی جب اپنے عزیزوں سے سنا کہ یہاں ایک مولوی صاحب ہیں جنھوں نے اس کو ناپسند کیا، اور لوگوں کو اس سے روکا، تو وہ بھی ملنے آئے اور انھوں نے بھی اپنی عقیدت مندی اور شکر گذاری کا اظہار کیا، میں نے کہا کہ یہ میرا اخلاقی و دینی فرض تھا جو میں نے ادا کیا، واقعہ بھی یہ ہے کہ مسلمانوں کو اسلام اور قرآن نے اسی کی تعلیم دی ہے، اور صاف کہا ہے کہ:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ (المائدہ ـ ۸)

اور کسی جماعت کی دشمنی تمھیں اس پر نہ آمادہ کر دے کہ تم (اس کے ساتھ) انصاف ہی نہ کرو، انصاف کرتے رہو کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے

ایک تاریخی حقیقت کی حیثیت سے میرا اس خاندان سے تعلق ہے، جس کے ایک عظیم فرد (حضرت سید احمد شہیدؒ) نے انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں اُس ظلم کے نتیجہ میں جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت میں پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلمانوں پر ہو رہا تھا، پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف عملی اقدام کیا اور ۶ مئی ۱۸۳۱ء (۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ) میں (تین سو ہمراہیوں کے ساتھ بالاکوٹ (حال واقع پاکستان) میں جام شہادت نوش کیا، ان شہیدوں میں ہمارے مختصر خاندان کے متعدد افراد بھی تھے، جن سے مصنّف کا قریبی رشتہ ہے، لیکن اس سب کے باوجود مصنّف کے نزدیک سیکڑوں کی تعداد میں ان ناکردہ گناہ افراد کو اس کی سزا دینے اور ان کو سفّاکی کے ساتھ قتل کرنے اور ان پُرامن شہریوں کی دکانوں کو لوٹنے کا کوئی اخلاقی اور سیاسی جواز نہ تھا، جن کا صرف اتنا گناہ تھا کہ وہ اس فرقہ سے انتساب اور تعلق رکھتے تھے، جس کے دو چار افراد نے یہ نامعقول حرکت کی، میرے نزدیک مسلمانوں کا ایسے مواقع پر یہی کردار ہونا چاہیئے، اور ان کو اصول و صداقت اور انصاف و اخلاقی جرأت کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے:۔

یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا

اے ایمان والو! اللہ کے لئے

قَوّٰامِینَ لِلّٰہِ شُہَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۝ (المائدہ - ۸)

پوری پابندی کرنے والے (اور) عدل کے ساتھ شہادت دینے والے رہو۔

حجاز مقدس کا ایک سفر اور ایک اہم تقریر اور ایک استقبالیہ

ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ میں رابطۂ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی کا سالانہ اجتماع تھا، میں اوائل ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ (اواخر دسمبر ۱۹۸۴ء) میں مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہوا، اس سفر میں اپنی رفاقت کے لئے میں نے عزیزی محمد واضح ندوی سلمہ کے فرزند سید جعفر مسعود ندوی سلمہ کا انتخاب کیا، اس کو ابھی تک حجاز کے کسی سفر کا موقعہ نہیں ملا تھا، اس میں عربی بولنے لکھنے کی استعداد پیدا ہو گئی تھی، امید تھی کہ اس سفر میں اس سے مدد ملے گی اور اس کو بھی عمرہ وزیارت، علماء و اہم شخصیتوں سے ملنے اور علمی مجلسوں اور اجتماعات میں شرکت سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملے گا، برادر عزیز سید حسن عسکری طارق (ٹیلیفون انجینیر مدینہ منورہ) کو ہمیشہ میری راحت اور سہولت کا خیال رہتا ہے، وہ چھٹی پر ہندوستان آئے ہوئے تھے، انھوں نے واپسی کا ایسا پروگرام بنایا کہ وہ میرے ساتھ اس سفر میں رہیں اور جعفر سلمہ کی (جو پہلی مرتبہ بیرون ملک کا ہوائی سفر کر رہے تھے) مدد کر سکیں۔

رابطہ کے اجلاس سے جو حسب معمول کئی روز تک جاری رہا، فراغت کے بعد مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے قیام کا موقعہ ملا، مدینہ طیبہ میں وہاں کی ایک ادبی تنظیم نادی المدینۃ المنورۃ الادبی کی طرف سے گذشتہ سال بھی تقاضہ تھا کہ میں کسی ادبی موضوع پر تقریر کروں، لیکن اس وقت اس تقاضہ کو

پورا نہیں کرسکا، اس مرتبہ شدید اصرار ہوا کہ میں اس مجلس کو کچھ وقت دوں، انھوں نے تقریر کے لئے خود ہی "دور اقبال فی توجیه الأدب والشعر" (شعر وادب کو نیا رخ دینے میں اقبال کا تاریخی کردار) مقرر کیا، اور اس کے لئے ۲۴ ربیع الثانی (۱۶ جنوری) کو مکتبة الملك عبد العزیز میں بعد مغرب تقریر کا پروگرام طے کیا، مجھے اس وقت یہ خیال نہیں رہا کہ یہ جگہ مسجد نبوی شریف سے چند گز کے فاصلہ پر واقع ہے، اور مغرب عشاء کے درمیان کا وقت عام طور پر مسجد شریف ہی میں گزارنے کا ہوتا ہے، جب سے حرمین شریفین کی حاضری نصیب ہو رہی ہے (سوائے کسی شدید مجبوری کے) مکۂ معظمہ میں یہ وقت ہمیشہ حرم شریف میں اور مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی میں گذرتا ہے، اس میں شاید کبھی تخلف ہوا ہو[1] لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا، اور اعلان ہو چکا تھا، طبیعت پر اس کا بڑا بار تھا کہ مسجد نبوی میں نوافل اور تلاوت میں مشغول ہونے کے بجائے یہ وقت ایک ادبی موضوع پر (اگرچہ وہ خالص ادبی نہ تھا) گفتگو کرنے پر گذرے گا، مغرب و عشاء کے درمیان کا وقت حرمین شریفین میں دو نمازوں کے درمیان کا مختصر ترین (ڈیڑھ گھنٹے کا) وقت ہوتا ہے، اگر تقریر کے درمیان عشاء کی اذان ہو گئی تو نہ عشاء کی جماعت کا چھوڑنا آسان، نہ تقریر کا ناتمام اور ناقص چھوڑنا، لیکن اب اس کا کوئی مداوی نہ تھا، اللہ کے بھروسہ پر اس کو قبول کر لیا گیا، لیکن اس موقعہ پر وقت میں برکت، جلسہ کی کامیابی، ممتاز اصحاب یہاں تک کہ ان حضرات کی (جن کا مسجد میں درس ہوتا ہے، اور وہ

---

[1] مدینہ طیبہ میں اس سے پہلے جو تقریریں ہوئیں، وہ بالعموم نماز عشاء کے بعد طیبہ ثانویہ کے ہال میں یا بعد مغرب جامعہ اسلامیہ میں ہوئیں جو مسجد نبوی سے فاصلہ پر ہے۔

اس کی پوری پابندی کرتے ہیں) شرکت، وقت پر تقریر ختم ہو جانے اور اطمینان وسکون کے ساتھ مسجد شریف میں عشا کی جماعت ہی نہیں نوافل کا وقت مل جانے کا ایسا مشاہدہ ہوا جس میں صاف اللہ تعالٰی کی تائید و نصرت نظر آئی۔

کلام پاک کی تلاوت اور تعارفی و خیر مقدمی تقریر کے بعد میں نے اپنی تقریر کا آغاز اس طرح کیا:۔

"حضرات! میرے لئے اللہ تعالٰی اور حاضرین مجلس کے سامنے شرمندہ اور محجوب ہونے کی بات ہے کہ میں جوارِ رسول (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپؐ کی مبارک و منوّر مسجد (نبوی) کے زیرِ سایہ آپؐ کے علاوہ دنیا کی کسی اور ہستی کا ذکر اور اس کی تعریف کروں، ایک عرب شاعر نے کسی موقعہ پر جو کہا تھا، وہ اس محل و مقام کے زیادہ حسب حال ہے ؎

ولمّا نزلنا منزلاً طلّه النّدی   أنيقاً وبستاناً من النّور حالياً

أجدّ لنا طيبُ المكان وحسنه   مُنىً فتمنّينا، فكنت الأمانيا

(جب ہم ایسی جگہ پر اترے جسے شبنم نے شاداب و سیراب کر رکھا تھا، اور نو دمیدہ غنچوں سے وہ سجا ہوا تھا تو مقام کے حسن و دل آویزی سے ہمارے دل میں خوابیدہ تمنّاؤں اور آرزوؤں نے انگڑائی لی، ہم نے آرزوئیں کیں، لیکن حاصلِ آرزو اور جانِ تمنّا تمھاری ہی ذات تھی)۔

یہی وہ جگہ ہے جسے آخری آسمانی پیغام کی طراوت اور صحبت نبوی کی نکہت نے دل و نگاہ کی جنّت بنا دیا ہے، اس لئے یہاں اس ہستی کا ذکر ہونا چاہئے جس کی ذات بابرکات سے اس شہر کو ہمیشہ کے لئے شرف و اعزاز حاصل ہوا، اور انسانیت نے

نئی زندگی اور حقیقی معنویت پائی۔

مگر میں یہاں ایک ایسے شخص کا ذکر کرنے جا رہا ہوں جس کا تعلق ذاتِ نبوی سے گہرا اور مضبوط تھا، اور یہی بات اس محل و مقام میں (جو قدیم محاورہ کے مطابق مسجد نبوی سے ایک تیر کے فاصلہ پر ہے) اس تذکرہ کا جواز پیدا کرتی ہے۔

ہمارے عظیم شاعر محمد اقبال کا یہ حال تھا (جس کا میں عینی گواہ ہوں اور مسجد نبوی کے جوار میں اس کی گواہی دے سکتا ہوں) کہ ذات نبوی روحی فداہ کا ذکر تو بڑی چیز ہے' آپ کے شہر مدینہ کا نام آنے پر ان کی آنکھیں اشکبار اور ان کا دل بے قرار ہو جاتا تھا۔

یہاں مجھے اجازت دیجئے کہ میں فارسی میں ان کے دو شعر پڑھوں کیونکہ یہاں فارسی جاننے والے بھی موجود ہیں[1]، وہ کہتے ہیں ؎

بایں پیری رہ یثرب گرفتم　　نواخواں از سرورِ عاشقانہ

چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام　　کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

اس کے بعد ادب و شاعری کو نیا رُخ دینے میں اقبال کے قائدانہ و انقلابی کردار اور اس کے اثرات پر روشنی ڈالی، اور بتایا کہ اس سے کم سے کم برِّ صغیر ہند کے افکار و خیالات کے علاوہ زبان و اُسلوب بھی کس طرح متاثر ہوئے۔

حاضرین نے بڑے سکون اور جمعیّت خاطر کے ساتھ یہ تقریر سنی اور اچھے تأثرات کا اظہار کیا[2]۔ اس جلسہ میں "نائب قاضی مدینہ شیخ عطیّہ سالم بھی" اور

---

[1] جلسہ میں متعدد ہندوستانی و پاکستانی حضرات بھی موجود تھے۔

[2] پوری تقریر "نقوش اقبال" طبع ششم میں ملاحظہ ہو ص ۳۲۔ ۳۳۵

بعض دوسرے علمائے حرم نبوی نے شرکت کی۔

مدینہ طیبہ کے زمانہ قیام میں جامعہ اسلامیہ کے ذمہ داروں کی دعوت پر طلبہ کے سامنے بھی خطاب ہوا، جس کا موضوع "عالمگیر ایمانی قحط اور اس کی مسلمان اہل علم واہلِ ایمان پر ذمہ داری" تھا، اس زمانہ میں ایتھوپیا، سوڈان اور صومالیہ میں کے قحط کا بڑا چرچہ تھا، میں نے موضوع کو الٹ کر بتایا کہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک وہ دینی وایمانی قحط ہے، جس میں دنیا کے بیشتر ممالک یہاں تک کہ انتہائی ترقی یافتہ ممالک بھی گرفتار ہیں، لیکن کسی کو اس کی مطلق فکر نہیں، مکہ معظمہ کے قیام میں "نادی مكة الثقافی" میں بھی ایک تقریر ہوئی۔

اس سفر کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ۱۵ ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ ۶ جنوری ۱۹۸۵ء کو جدہ کی ایک مؤقر شخصیت اور ممتاز ومعزز رئیس شیخ عبد المقصود خوجہ کی طرف سے مجھے ایک استقبالیہ دیا گیا، جس میں جدہ و مکہ معظمہ کے اعیان و اہل علم واہلِ قلم اتنی بڑی تعداد میں شریک ہوئے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے، ان میں چار حضرات' داعی ومیزبان شیخ عبد المقصود خوجہ، مشہور ماہر تعلیم عبد اللہ بغدادی (سابق عمید کلیۃ تحضیر البعثات مکہ معظمہ) سید علی حسن فدعق (سابق میئر جدہ) شیخ عبد اللہ بلخیر سابق وزیر اطلاعات نے مہمان خصوصی کا تعارف کرایا، اور اپنے جذبات وتاثرات کا اظہار کیا، اس جلسہ کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں میری دو کتابیں "السيرة النبوية" اور "مختارات من أدب العرب" جو دار الشروق جدہ نے بڑے اہتمام سے شائع کی تھیں، حاضرین جلسہ کو ہدیۃً پیش کی گئیں۔

میں نے اس تقریب کو (جو میری حیثیت سے بہت بلند تھی اور جو میرے لئے

اس پیمانہ و شان کے ساتھ زندگی کا پہلا تجربہ تھا) محض ایک اعزاز اور ایک استقبالیہ جلسہ رہنے دینا اور صرف تشکریہ کی جوابی تقریر کر دینا جائز نہیں سمجھا میں نے کوشش کی کہ اس منتخب مجلس کو جو اس دعوت و پیغام کی سرزمین پر اور حرم کے زیر سایہ ہو رہی ہے کچھ پیغام دیا جائے، اور ع

معمارِ حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز!

کی صدا لگائی جائے، میں نے تشکریہ کے ضروری الفاظ ادا کرنے کے بعد عرض کیا۔

"حضرات! دنیا میں وزن و اعتبار کے دو پیمانے ہیں، ایک قامت، دوسرے قیمت، لیکن اللہ تعالیٰ نے قامت پر قیمت کو ترجیح عطا فرمائی ہے، میں جب بھی سورۂ انفال کی آخری یہ آیت:-

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ	اور جو لوگ کافر ہیں وہ باہم ایک
بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ	دوسرے کے وارث ہیں، اگر یہ
فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِیْرٌ ۝	نہ کرو گے تو زمین میں (بڑا) فتنہ
(الانفال۔۷۳)	اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔

پڑھتا ہوں تو دریائے حیرت میں غرق ہو جاتا ہوں کہ یہ بات آخر کس سے کہی جا رہی ہے؟ اس مٹھی بھر انسانی گروہ سے، اس چھوٹی سی جماعت سے جس کی تشکیل کچھ انصار سے جو اپنے وطن میں تھے، اور کچھ مہاجرین سے جو مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے آئے ہوئے تھے، ہوئی تھی، اور جن کی بڑی سے بڑی تعداد شمار کرنے کے بعد ڈیڑھ ہزار (۱۵۰۰) سے زیادہ نہیں نکلی۔

خدا تعالیٰ ان کو اخوت و بھائی چارہ کی دعوت دے رہا ہے، مہاجرین کا

انصار سے اور انصار کا مہاجرین سے ربط پیدا فرما رہا ہے، اور سچی اُخوت کی روح ان میں بیدار فرما کر یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ ایک نئی اکائی بن جائیں، ایک ایسی اکائی جس کی بنیاد ایمان و یقین، کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کے اتحاد، انسانیت کے لئے ہمدردی و دل سوزی، اصول و عقائد پر پختگی پر قائم ہو۔

خدا تعالےٰ اس مختصر جماعت سے ارشاد فرما رہا ہے، کہ اگر تم نے اس کام میں کوتاہی کی، اس اخوت کے قیام میں تساہلی سے کام لیا، اور اس نئی اکائی کی تشکیل میں جس سے دنیا ناواقف ہے، اور تاریخ نے جس کو سیکڑوں سال سے بھلا دیا ہے، غفلت دکھائی، اگر تم نے اس اخوت میں کمزوری کا مظاہرہ کیا جو ایک عظیم و بلند پیغام سے مربوط ہے، اور اس اتحاد کو ناپائیدار بنایا جو سچی اور مخلصانہ اخوت پر قائم ہے، اگر تم نے ایسا کیا تو روئے زمین پر فتنہ بپا ہو جائے گا، اور زبردست فساد مچے گا۔

ذرا سوچئے کہ اس مختصر سی تعداد کی جو یثرب میں رہتی تھی (جس کو بعد میں مدینۃ الرسول صلے اللہ علیہ وسلم کے نام سے یاد کیا گیا) کیا حقیقت تھی؟ اس کی افرادی قوت کتنی تھی؟ سیاسی میزان میں اس کا کیا وزن تھا؟ بین الاقوامی اسٹیج پر اس کی کیا حیثیت تھی؟ سماجی، اقتصادی حتیٰ کہ علمی دنیا میں وہ کتنا وزن رکھتی تھی؟ تین مرتبہ ان کی مردم شماری کی گئی (جیسا کہ بخاری شریف میں اس کا تذکرہ آتا ہے) آخری بار مردم شماری میں ان کی تعداد ایک ہزار پانچ سو (۱۵۰۰) نکلی۔[1]

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۳۰ باب کتابۃ الامام الناس کتاب الجہاد، بعض صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ الانفال غزوۂ بدر کے زمانہ میں نازل ہوئی، اس وقت مسلمانوں کی تعداد اس سے بھی کم رہی ہوگی جو اس آخری مسلم شماری کے نتیجہ میں نکلی۔

ذرا غور فرمائیے کہ یہ بات کس سے کہی جارہی ہے کیا ان رومیوں سے کہی جارہی ہے، جو آدھی دنیا کے مالک تھے، اور سب سے بڑی حکومت اور اس کے سایہ میں پروان چڑھنے والی تہذیب اور تمدّن، اور سب سے بڑی جنگی، بین الاقوامی اور سیاسی قوت کے مالک تھے؟

کیا یہ ان ایرانیوں سے کہا جارہا ہے، جنھوں نے رومن امپائر کے ساتھ آباد دنیا کو مشترک طور پر تقسیم کرکے اس پر قبضہ جمار کھا تھا؟

یقیناً یہ رومی اور ایرانی ظاہری طور پر اس وقت انسانیت کی قسمت کے مالک بنے بیٹھے تھے، زندگی کی کشتی وہی چلا رہے تھے، تہذیب وتمدّن کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں تھی، قوموں، وسائل، ذرائع اور اسباب معیشت اور دنیا کے حالات پر (اگر یہ کہنا غلط نہ ہو) انھیں مکمل تصرّف حاصل تھا۔

کیا ان سے کہا جارہا ہے:۔

اِلَّا تَفۡعَلُوۡہُ تَکُنۡ فِتۡنَۃٌ	اگر یہ نہ کروگے تو زمین میں
فِی الۡاَرۡضِ وَفَسَادٌ کَبِیۡرٌ ؕ	(بڑا) فتنہ اور بڑا فساد پھیل
(سورۃ الانفال۔۷۳)	جائے گا۔

حضرات! ذرا اندازہ لگائیے اس لفظ "فِتۡنَۃٌ فِی الۡاَرۡضِ" کی ہیبت کا، اس کے حجم کا، اس کے وزن اور وُسعت کا، آیت میں صرف فساد نہیں کہا گیا، بلکہ "فسادِ کبیر" کہا گیا۔

یہ بات اس چھوٹی سی محدود جماعت سے کہی جارہی ہے جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی، اور جن کے کاندھوں پر اسلام کے پیغام کا بوجھ رکھا گیا،

اس چھوٹی سی افرادی قوت سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اسلامی و ایمانی اور انسانی اور عادلانہ اُخوّت قائم کرنے میں کوتاہی دکھائی، اور اگر تم نے آپس میں اتحاد کے قیام میں غفلت کا مظاہرہ کیا، اور اس اتحاد کو، ایمان، اخلاص ایثار و قربانی اور فنائیت پر قائم نہیں کیا، تو زمین میں فتنہ بپا ہو جائے گا، اور زبردست فساد پھیل جائے گا۔

امّت مسلمہ کا اس وقت کیا وزن تھا جب وہ صرف سیکڑوں کی تعداد میں تھی، ہزار دو ہزار کی تعداد میں تھی، اس وقت ان سے یہ کہا جا رہا ہے، ان کو یہ وزن دیا جا رہا ہے، اور یہ قیمت اور دنیا کے نقشہ میں یہ حیثیت عطا کی جا رہی ہے!

اس اعلان سے یہ صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ امّت مسلمہ کی حیثیت اور وزن "قدر و قیمت" ہے، نہ کہ "قدّ و قامت" اس کی حیثیت اور اس کا مقام اپنے پیغام، ایمان، عقائد، مکارم اخلاق، بیدار ضمیر، اور جسم میں سرایت کئے ہوئے شعور و وجدان اور عقل و تدبّر پر اثر ڈالنے والی، اس بیتاب و بے چین روح سے ہے جو اس کو عطا کی گئی۔

امّت اسلامیہ کی قیمت و اہمیت ان خصوصیات و صفات کی بنیاد پر ہے، جن سے اللہ تعالےٰ نے اس کو نوازا ہے، اس کے ہاں تعداد اور ساز و سامان کی کثرت کا اعتبار نہیں، اور نہ اس کی مکانی مسافت کے طول و عرض کا جس پر اس کی حکومت کا سکّہ چلتا ہے، اور نہ اس زمانی مسافت کے طول و امتداد کا جس پر اس نے اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔

میں مسلمانوں کی اس جماعت کو، خواہ وہ کتنی ہی کم تعداد میں ہو اس پیمانے سے

نابینا ہوں، میں اس کو اسلام کی اس خوردبین سے دیکھتا ہوں، جو خدا کی عطا کردہ ہے۔

میں اس اجلاس کے داعیان کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے مجھے آپ حضرات سے خطاب کا موقعہ عنایت فرمایا، آپ تعداد میں زیادہ نہیں لیکن قیمت و وزن میں آپ کی بڑی حیثیت ہے، میں اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، آپ سب کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں، اور آپ سب کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے حقیقت میں میرے اس دینی انتساب کی قدر افزائی فرمائی میں نہیں جانتا کہ یہ انتساب مکمل بھی ہے، یا نہیں، لیکن علم و دین اور دعوت کے میدان میں اس انتساب کو جو شہرت حاصل ہے، آپ نے اس مقدس دیار میں میری عزت افزائی فرما کر حقیقت میں اسی انتساب، علم، دینی دعوت، اسلامی اخوت، اور جذبات کی قدر فرمائی، اس لئے یہ میرا اعزاز نہیں، اس انتساب کا اعزاز ہے ؎

داغِ غلامیت کرد رتبۂ خسرو بلند
میر ولایت شود بندہ کہ سلطاں خرید

حرمین شریفین کے قیام سے فارغ ہو کر ریاض کے راستہ سے ہندوستان واپسی ہوئی، ریاض کا سفر اور چند روزہ قیام جامعۃ الامام محمد بن سعود کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی کی دعوت اور خواہش پر اختیار کیا گیا، انھوں نے اہتمام سے کلیۃ الدعوۃ والاعلام کا معائنہ کرایا، ریاض میں عالی مرتبت الشیخ عبدالعزیز الرفاعی (سابق سکریٹری مجلس الوزراء

مملکت عربیہ سعودیہ) کے (جو خود ایک بڑے ادیب اور اسلامی ادب کے میدان میں کام کرنے والے اہلِ قلم ہیں) دولت کدہ پر ہر ہفتہ ایک ادبی مجلس شب میں منعقد ہوتی ہے، اس میں شرکت اور بولنے کا موقعہ ملا، ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الباشا کے گھر پر رابطۂ ادب اسلامی کے بارہ میں مشورہ ہوا، اس میں طے کیا گیا کہ فروری ۱۹۸۶ء میں رابطہ کا عام اجلاس منعقد ہو، اس سب سے فارغ ہو کر بخیریت و راحت ہندوستان واپسی ہو گئی۔

پیامِ انسانیت کا ایک دورہ

ان دعوتی سرگرمیوں، علمی، ادبی مشغولیتوں اور غیر ملکی سفروں کے ساتھ یہ حقیقت آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی کہ جس ملک میں بظاہر رہنا سہنا مقدر ہے، اس کی صحیح صورتِ حال، بڑھتے ہوئے انتشار انگیز رجحانات، اور مستقبل کے خطرات کو نظر انداز کرنا کسی طرح صحیح اور جائز نہیں، اس لئے رہ رہ کر "پیامِ انسانیت" کے پیغام کو وسیع اور مؤثر بنانے کی طرف خیال جاتا رہتا تھا، اس وقت تک یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور مشرقی پنجاب کے دورے ہو چکے تھے، اور مفید ثابت ہوئے تھے، مارچ ۱۹۸۵ء کے اوائل میں بندیل کھنڈ کے دورہ کا پروگرام بنا، ۱۱ر مارچ ۱۹۸۵ء کو ایک چھوٹا سا قافلہ روانہ ہوا، اس سفر کی منزلوں میں ہنھورہ، باندہ، پنّا، ستنا، ناگود[1]، سیدھی اور

---

[1] ناگود میں میرے حقیقی پردادا مولانا میر عبدالعلی مدفون ہیں، ایک قدیم مسجد کے سامنے جو انھیں کی تحریک سے تعمیر ہوئی تھی، ان کی قبر ہے، آپ ایک درویش سیرت فاضل بزرگ تھے (باقی ص۱۰۵ پر

رلیواں تھے، اس سفر کے رفقاء میں رفیق مکرم ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی محمد حسن انصاری صاحب، قاضی عبدالحمید اندوری، مولانا سید محمد مرتضےٰ (ناظر کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء) اور عزیزی سید اسحاق حسینی تھے، اس سفر کی خصوصیت یہ تھی کہ مولانا قاری حافظ سید صدیق احمد صاحب بانی و ناظم جامعہ عربیہ ہتھورہ (جو اس پورے علاقہ اور نواح کی ایک محبوب اور متفق علیہ شخصیت ہیں) نے اس دورہ میں صرف رفاقت ہی نہیں فرمائی، بلکہ اپنے دینی و اخلاقی اثرات، اور اپنی بے لوث روحانی شخصیت سے اس دورہ کو ہر طرح کامیاب بنانے کی کوشش کی، وہ اکثر پہلے سے اگلی منزل پر تشریف لے جایا کرتے تھے، اور ہم لوگوں کے قیام اور جلسوں کے انتظام کا پروگرام بناتے تھے، پنّا میں مہاراجہ صاحب پنّا نے صدارت کی، اور اچھے تاثرات کا اظہار کیا، ستنا سے اس نواح کے ایک ذی علم اور مؤقر بزرگ پروفیسر اختر حسین صاحب نظامی شریک ہوگئے، سیدھی میں جلسہ کی صدارت ڈاکٹر سون سنگھ جی نے کی جو ارجن سنگھ سابق وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش کے بھائی ہیں، رلیواں سے صدارت ہی کے لئے آئے تھے، ستنا میں صدارت ڈاکٹر راٹھور صدر شعبۂ سائنس نے کی، ۷ ارمارچ کو دورہ اختتام پذیر ہوا۔

(باقی صـ۱۰۴ کا) اور باوجود تحصیلداری کے فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، آپ حضرت سید احمد شہیدؒ کے مرید و مجاز تھے، ۸۴ سال کی عمر میں یہیں ریاست ناگود میں انتقال فرمایا، ۱۲۶۹ھ بمطابق ۱۸۵۳ء تاریخ وفات ہے۔

لندن، آکسفورڈ اور بلجیم برگ میں چند دن

آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک سنٹر کے قیام اور اس سلسلہ کے سفر کا تذکرہ "کاروانِ زندگی" کی دوسری جلد میں تفصیل سے آچکا ہے[۱]، یونیورسٹی نے اسلامک سنٹر کے قیام کی اجازت دے دی تھی، اور اس سے تعاون بھی کیا تھا، لیکن ابھی اس کا باقاعدہ افتتاح کرنا باقی تھا، ادھر لکسم برگ (بلجیم) میں چند عرب فضلاء نے جن میں پیش پیش استاد جمال الدین عطیہ تھے، علوم اسلامیہ پر ایک تحقیقی مجلس قائم کی تھی، جس کا صدر راقم سطور ہی کو چنا تھا، اس کا جلسہ بھی اکتوبر کے وسط میں اسلامک سنٹر کی تقریب کے بعد رکھا تھا، ان دینی و علمی تحریکات کی بنا پر انگلستان و بلجیم کا سفر طے کیا گیا، یہ ۸ اکتوبر سے ۱۵ اکتوبر تک کا زمانہ یورپ میں گذرا، اس عرصہ میں سنٹر کے اصول اور طریقۂ کار کا خاکہ بنا، یونیورسٹی سے تائید و اتفاق حاصل ہو جانے کے بعد اس کی تاسیس کی قانونی کارروائی کرنی تھی۔

۸ اکتوبر ۸۵ء کو انگلستان کا سفر اختیار کیا گیا، سنٹر کا خاکہ طے کیا گیا تھا کہ اس کو ایک وقف کی شکل میں تشکیل دیا جائے گا جو مجلس متولیان پر مشتمل ہے ٹرسٹیوں کی تعداد ۱۴ طے ہوئی جس میں دو ٹرسٹی یونیورسٹی اور سینٹ کراس کالج کے نمائندہ کے طور پر لئے گئے، اور ۱۲ عالم اسلام کے صحیح الفکر مسلمان حضرات میں سے نامزد کئے گئے، اور طے ہوا کہ ۱۴ ٹرسٹیوں میں سے ۱۱ ٹرسٹی مسلمان ہوں، دیگر بنیادی امور پر مشتمل ایک مسودہ قانون (۱۱۱۱) انگلستان کی عدالت کے بموجب رجسٹرڈ

[۱] "کاروانِ زندگی" ج ۲ ص ۳۷۴-۳۸۱

کرانے کے لئے تیار کیا گیا، اس پر کم سے کم ۶ ٹرسٹیوں کے دستخط ضروری تھے، ۹ اکتوبر کو وکیل کی موجودگی میں میں نے اور ٹرسٹیوں نے دستخط کئے، اور اس طرح "آکسفورڈ سینٹر آف اسلامک اسٹڈیز" نام کا یہ ادارہ دو سال کے غور و فکر اور انتظام کے بعد قانونی طور پر وجود میں آ گیا، ۱۱ اکتوبر کو یونیورسٹی کے ذمہ داروں اور دیگر اہم شخصیتوں کے جلسہ میں باقاعدہ اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔

سنٹر کی تشکیل کے اعلان کی نشست اچھی حوصلہ افزا نشست ثابت ہوئی، راقم سطور نے اس کا افتتاح کرتے ہوئے ایک مختصر تقریر کی۔

سنٹر کے چیرمین (راقم سطور) کی طرف سے تقریباً ایک سو منتخب ترین آدمیوں کو ڈنر پر مدعو کیا گیا تھا، جس میں یونیورسٹی کے پروفیسران، عہدیداران، اور برطانیہ میں مقیم دانشور طبقہ کے منتخب افراد تھے، یہ سب افراد دلچسپی سے شریک ہوئے، کھانے کے اختتام پر تقریروں کا پروگرام رہا، جس کو حاضرین نے بڑے سکون سے سنا، میں نے عربی میں تقریر کی، جس کا پہلے سے تیار کردہ ترجمہ ڈاکٹر فرحان نے سنایا، اس نشست میں ڈاکٹر ڈیوڈ براؤننگ، ڈاکٹر فرحان نظامی، ڈاکٹر کے. بی. گریفن، پریسیڈنٹ میگ والن کالج، مسٹر اے سی بورڈ پرنسپل سینٹ کراس کالج اور رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف نے تقریریں کیں، میری تقریر کی روح اور خلاصہ یہ تھا۔

"آکسفورڈ یونیورسٹی میں اس سینٹر کا قیام ایک فال نیک ہے، اس سے دوستی اور مفاہمت کے نئے دروازے کھلیں گے اور علمی تحقیق کی نئی شاہراہیں سامنے آئیں گی، اسلام نے انسانیت کا جو درس دیا ہے، اور جس طرح انسانیت کو

اعلیٰ مقام پر پہونچایا ہے ضروری ہے کہ اس کا صحیح احساس پیدا ہو بعثت نبوی کے وقت انسانیت سکرات موت کی ہچکیاں لے رہی تھی، رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی مردہ رگوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑائی، آنے والی صدیوں میں جو ترقی ممکن ہوئی وہ بقائے انسانیت کے لئے اسی عظیم الشان کوشش کا نتیجہ تھی جو حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے شروع ہوئی تھی، اگر اس وقت حضورؐ وہ کوشش بقاءِ انسانیت کے لئے نہ فرماتے تو نہ یہ یونیورسٹیاں ہوتیں نہ یہ ادارے، ان کے اثرات آج تک انسانیت پر رحمت کی امید بنے ہوئے ہیں، اسی بنا پر اسلامی مرکز کا قیام یونیورسٹی کا احسان نہیں، شکر و اعتراف کا اظہار ہے، اور خراج محبت و شرافت ہے، جو برضا و رغبت اسلام کو پیش کیا جا رہا ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ یورپ میں جس ڈنر میں شراب کا انتظام نہ ہو وہ کامیاب نہیں ہوتا، لیکن یہ ڈنر ایسا کامیاب رہا کہ یونیورسٹی کی تاریخ میں یادگار رہے گا، راقم سطور کی تقریر کے بعد یونیورسٹی کے نمائندہ کے، بی گریفن نے کہا کہ انسانی تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات نہایت گہرے اور پائیدار ہیں، انھوں نے چینی علاقوں بالخصوص سنکیانگ میں (جہاں انھوں نے کچھ عرصہ قیام کیا تھا) مساجد کا ذکر کیا، جو چودھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئی تھیں۔

انھوں نے کہا کہ "حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم ان علاقوں میں ماؤ اور مارکس سے پہلے بھی تھے، اور ان کے ختم ہو جانے کے بعد بھی وہاں باقی رہیں گے، ضرورت تھی کہ اس طرح کا مرکز وجود میں آئے"۔

۱۰½ بجے رات کو یہ ڈنر ختم ہوا اور مہمان اپنی اپنی جگہ گئے۔

١١ر اکتوبر کی شام کو اسلامک سنٹر کا کام ختم ہوگیا، اگلے دن ہم لوگ لندن منتقل ہوگئے، اور پرانی قیام گاہ مسرور احمد صاحب لکھنوی کے مکان پر قیام ہوگیا لندن پہونچکر اسی روز لکسم برگ کا سفر کرنا تھا، جہاں بین الاقوامی مجلس برائے تحقیقات اسلامی کے عاملہ کا جلسہ تھا، راقم سطور کو اس کی صدارت بھی کرنی تھی، اس کی شرکت کے لئے کئی ماہ سے خط وکتابت چل رہی تھی، میں نے اپنی مصروفیات اور صحت کی کمزوری کی بنا پر شرکت سے تقریبًا معذرت کردی تھی لیکن جب آکسفورڈ کا سفر ممکن ہوگیا تو لکسم برگ کے اس جلسہ کی شرکت کا ارادہ کرلیا، کیونکہ لکسم برگ لندن سے صرف ایک گھنٹہ کی فضائی مسافت پر ہے، آکسفورڈ پہونچنے کے بعد ٹیلیفون پر ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کو (جو اس کونسل کے جنرل سکریٹری ہیں) اطلاع کردی، اچانک ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ ہمارے پاس بلجیم کے لئے ویزہ نہیں ہے، اور دفتر کا وقت نہ ہونے کی وجہ سے ویزہ کا حصول ممکن نہیں، ہم کو بروکسلز اترنا تھا، اور وہاں سے لکسم برگ تقریبًا دو سو میل ہے، اور یہ دونوں الگ الگ ملک ہیں، ڈاکٹر جمال الدین عطیہ نے بروکسلز میں ایک رفیق کا انتظام کردیا تھا، جو انٹری میں مدد کرے، ہم نے اپنے میزبان مسرور احمد صاحب کو بھی ساتھ لے لیا تھا، ڈاکٹر عطیہ کے نمائندہ بروکسلز پر موجود تھے، اس لئے ویزہ کی کارروائی ایرپورٹ ہی پر انجام پائی اور انٹری ہوگئی، وہاں سے ہم ١٠ بجے رات کو لکسم برگ کے لئے روانہ ہوئے اور تقریبًا ڈیڑھ بجے وہاں پہونچ گئے۔

لکسم برگ میں صبح ١٠ بجے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کا مقررہ جلسہ ادارہ کے مستقر میں شروع ہوا، اس جلسہ میں پہلی مرتبہ ٹمپل یونیورسٹی فلاڈلفیا کے شعبۂ ادیان

میں اسلامی مطالبات کے صدر ڈاکٹر اسمٰعیل راجی فاروقی سے ملاقات ہوئی اس وقت کیا معلوم تھا کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد کسی دشمنِ اسلام و عرب یہودی کے ہاتھ سے مع اپنے خاندان کے شہادت کی سعادت حاصل کریں گے اس جلسہ میں کمیٹی کی مستقل تشکیل عمل میں آئی نئے عہدیداروں کا انتخاب ہوا، اور تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا گیا، اور آئندہ کے جائزہ کے لئے کام کو مختلف علمی مراکز پر تقسیم کیا گیا، اسی روز لندن واپس ہونا تھا، کچھ دیر آرام کے بعد مغرب کے قریب لکسمبرگ ایرپورٹ روانہ ہوئے لندن میں ہمارے پاس ایک دن اور دو راتیں تھیں، اس عرصہ میں اسلامک ویلفیر اور مسلم ویلفیر سنٹر وغیرہ میں جانے اور اسلامک سنٹر بیکر اسٹریٹ میں تقریر کا پروگرام تھا، وہیں اچانک قدیم عزیز دوست ڈاکٹر سعید رمضان پر نظر پڑی جو جنیوا سے صرف ملنے کے لئے آئے تھے، انھوں نے جنیوا آنے کی دعوت دی تھی لیکن جب اس سے معذرت کی گئی تو وہ خود لندن آگئے، دیر تک لیٹ کر روتے رہے، پھر قیام گاہ پر آ کر ملے اور اگلے دن صبح ایرپورٹ پر آ کر رخصت کیا، ۱۵ اکتوبر کی صبح ۸ بجے (لندن کے وقت سے) دہلی کے لئے پرواز تھی، اس سے ہندوستان کو واپسی ہوئی۔

ایک مخلص ملی کارکن اور رفیقِ کار کی وفات

۵ نومبر ۱۹۸۵ء کو مولانا محمود الحسن صاحب ناظم دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کی وفات کا واقعہ پیش آیا، اور یہ تحریک ایک سرگرم کارکن و نگراں اور ایک مخلص خادمِ ملت سے محروم ہوگئی، تحریک کی ضرورت اور افادیت پر یقین کرنے اس خطرہ کو محسوس کرنے میں جو نئی نسل کے دینی تعلیم سے محروم ہونے سے ملت کو درپیش ہے، قاضی عدیل عباسی صاحب کے بعد انھیں کا نمبر تھا، انھوں نے کونسل کے کام کو اپنا مقصدِ زندگی اور اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا ظفر احمد صاحب صدیقی مرحوم کے بعد یہ دوسرا حادثہ اور خلا تھا جس کا پُر ہونا آسان نہیں تھا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

بابِ چہارم

مسلم پرسنل لا (مسلمانوں کے عائلی قانون) کے تحفّظ کی مہم، ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کے لئے نئی آزمائش، ہندگیر تحریک، اسلامی عائلی قانون میں عدالت عالیہ کی مداخلت، اس کا مقابلہ اور ملّت کی کامیابی

مسلم پرسنل لا (مسلمانوں کے عائلی قانون) کے تحفّظ کی مہم اور تحریک اور اس کی ذمّہ داری

مسلم پرسنل لا کی تحریک، اس کی اہمیت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کا جو ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں عمل میں آئی تھی، تفصیل سے تذکرہ جلد دوم میں آچکا ہے[1]، اس کے صدر بالاتفاق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند منتخب ہوئے تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے ایک دل آویز اور ہمہ گیر شخصیت عطا فرمائی تھی، رانچی کے سالانہ اجلاس ۱۹۸۰ء کے موقعہ پر بعض حلقوں کی طرف سے صدارت میں تبدیلی کا مسئلہ اٹھایا گیا اور میرا نام پیش کیا گیا، لیکن میرے یہ کہنے پر سب خاموش ہو گئے کہ "طوفان میں کشتی نہیں بدلی جاتی" یہ بات آئی گئی ہو گئی، میرے لئے اس کا ایک بڑا محرک یہ بات تھی کہ

---

[1] کاروان زندگی جلد دوم ص ۱۳۶ - ۱۳۹

مولانا قاری محمد طیب صاحب جیسا باوقار اور ہر دل عزیز صدر ملنا مشکل ہے، اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے مشترک ملی ادارہ کی صدارت کے لئے وہی موزوں ہیں۔

لیکن ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی، اور ان کی جگہ خالی ہوگئی، اس سال ۲۷، ۲۸ر دسمبر ۱۹۸۳ء میں مدراس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سالانہ اجلاس کا ہونا طے پایا، میں اپنے بعض بیرونی پروگراموں اور خرابی صحت کی بنا پر اس سے پہلے کے عاملہ کے بعض اجلاسوں میں شرکت نہیں کر سکا تھا، اس اجلاس میں شرکت کا عزم مصمم تھا، اور سفر کے سب انتظامات کر لئے گئے تھے کہ عین موقعہ پر مجھ پر نقرس (GOUT) کی بیماری کا (جس کا میں پرانا مریض ہوں) شدید حملہ ہوا، اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں ایسی شدید تکلیف میں مبتلا ہوا، کہ چارپائی سے اترنا مشکل تھا، مجبوراً سفر کے التواء کا فیصلہ کرنا پڑا، اجلاس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا نام صدر کی جگہ کے لئے پیش کیا گیا، جو لوگ میری طبیعت سے واقف ہیں، انھوں نے یہ کہا کہ وہ صرف اس صورت میں منظور کر سکتے ہیں کہ متفقہ طور پر ان کا انتخاب عمل میں آئے، مجھے معلوم ہوا کہ بغیر کسی اختلاف کے میرا نام منظور ہوا، جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی تو "تنگ آمد وسخت آمد" کا مضمون تھا، یہ فیصلہ میری افتاد طبع، صحت جسمانی، عمر اور دوسری ذمہ داریوں اور مشغولیتوں سے میل نہیں کھاتا تھا، اگر یہ کسی بھی سیاسی، ملی تنظیم اور باعثِ افتخار و اعزاز منصب کے قبول کرنے کا معاملہ ہوتا تو میں بغیر کسی ادنیٰ تردد کے انکار کر دیتا، لیکن ایک تو مسئلہ کی نوعیت واہمیت کی وجہ سے

(جس کو میں اپنے عقیدہ کا جزء اور مسلمانوں کی ملی زندگی کے لئے شہ رگ کا درجہ دیتا ہوں) دوسرے مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کے احترام کی بنا پر (جن کا بانیِ ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے فرزند ہونے کی وجہ سے میں ہمیشہ لحاظ کرتا رہا ہوں) چاروناچار قبول کرنا پڑا، دوستوں کی اس بات کو بھی اس میں دخل تھا، کہ اس وقت بورڈ کو اختلاف و انتشار سے بچانے کے لئے بھی ایسا کرنا ضروری ہے، چنانچہ فارسی کے اس پرانے شعر پر عمل کرنا ہی پڑا ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جا ہا سپر باید انداختن

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے صدارت قبول کرنے کے کچھ عرصہ بعد ہی نہ صرف بورڈ کی تاریخ میں بلکہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی تاریخ میں ایسے سنگین مرحلے پیش آئیں گے جو شاید اس سے پہلے عرصہ سے پیش نہیں آئے، اور جن میں قیادت کے غیر معمولی حزم و عزم، ملت کے نظم و ضبط، علمائے دین و ماہرین قانون کے علم و مطالعہ، ذہانت و تدبّر اور عوام کے انقیاد و اطاعت، صبر و تحمّل، قائدین پر اعتماد اور تفویض و تسلیم کی غیر معمولی صلاحیت کے ثبوت دینے اور ملی شعور کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔

کلکتہ کا اجلاس عام

۶، ۷، ۸ / اپریل ۱۹۸۵ء کو کلکتہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا

اجلاس منعقد ہوا، اس اجلاس میں مسلمانانِ ہند کی تمام دینی وسیاسی جماعتوں مسلم تنظیموں اور مختلف مکاتبِ خیال کے ذمہ داروں، مسلم دانشوروں اور سربرآوردہ علماء اور قانون دانوں کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی، میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اندرونی وبیرونی سفروں، اور مسلسل انہماک ومصروفیت کی وجہ سے خطبۂ صدارت تیار نہیں کرسکا تھا، تحریری ومطبوعہ خطبۂ صدارت کے بجائے زبانی تقریر کی، جو کیسٹ سے نقل کرانے اور میری نظرِ ثانی کے بعد "مسلم پرسنل لا کی صحیح نوعیت واہمیت" کے عنوان سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے آفس خانقاہ رحمانیہ مونگیر، بہار کی طرف سے شائع ہوچکا ہے، اس خطبہ میں مسئلہ کے اصولی وبنیادی پہلو آگئے، اور مسلم پرسنل لا کے متعلق غلط فہمیوں کا پس منظر اور ان کی نفسیات، الٰہی وآسمانی قانون اور دنیوی وانسانی قانون کے درمیان نازک فرق اور یکساں سول کوڈ کے ملکی اتحاد کی راہ میں غیر مؤثر اور غیر منطقی ہونے کی وضاحت ایسے انداز میں آگئی ہے، جس سے نہ صرف حقیقت پسند غیر مسلم حضرات بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اس مسئلہ کے بارہ میں صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل ہوسکتی ہے۔

۷؍اپریل (۱۹۸۵ء) کو شام میں شہید مینار میدان میں ایک عظیم الشان جلسۂ عام ہوا، عام اندازہ تھا کہ ۴۔۵ لاکھ کا مجمع ہوگا[۱]، مضافات واضلاع سے کثرت سے لوگ بسوں پر آئے تھے، یہ مسلمانوں کی وہ عظیم ترین تعداد تھی، جو عرصہ سے کسی جلسہ میں دیکھنے میں نہیں آئی تھی، سارا مجمع گوش برآواز تھا، میں نے یہاں خالص مسلمانوں کو مخاطب کیا، ان کا بیباک اور بے لاگ طریقہ پر احتساب کیا، اور ان کو

---

[۱] اکثر تجربہ کاروں کا کہنا تھا، کہ نصف ملین (پانچ لاکھ) کے قریب حاضرین کی تعداد تھی۔

بتایا کہ ان سے خود اپنے مقدس عائلی قانون پر (جو خدا کا نازل کیا ہوا، خدا کے آخری پیغمبر کا پیش کیا ہوا اور سراسر کتاب وسُنّت پر مبنی ہے) عمل کرنے میں کتنی کوتاہیاں اور قانون شکنیاں ہو رہی ہیں، انھوں نے کتنے ہندوانہ رسوم اور غیر اسلامی قانون ورواج اختیار کر رکھے ہیں، اور وہ اپنے غیر اسلامی ماحول اور معاشرہ سے کتنے متاثر ہوئے ہیں، میں نے خود ان کو اپنا غیر جانب دارانہ احتساب کرنے، بلکہ اپنے گھروں میں خود "عدالتیں" قائم کر کے اپنا خود جائزہ لینے اور اپنے خلاف خود فیصلہ کرنے کی دعوت دی اور بتایا کہ الٰہی قانون پر عمل نہ کرنے اور اپنے خالق ومالک کی بندگی واطاعت میں کوتاہی وسرتابی کرنے کے اثرات کس کس شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، اور اس سے اس ملت کی بے وزنی، بے اثری اور کیسی کیسی مشکلات وجود میں آتی ہیں چونکہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کا اوّلین وبنیادی مقصد خود مسلم معاشرہ کی اصلاح اور معاشرت وتمدّن، اور عائلی زندگی کے الٰہی قوانین پر عمل کی دعوت ہے، اس لئے اس بے لاگ احتساب کی ضرورت تھی، اور الحمد للہ اس کا اچھا اثر پڑا۔

یہ اجلاسِ عام عصر بعد شروع ہوا تھا جس میں متعدد علماء وزعماء نے تقریریں کیں، درمیان میں نماز مغرب کا وقت آ گیا، سارے مجمع نے وہیں مغرب کی نماز ادا کی، لیکن جلسہ میں کوئی انتشار پیدا نہیں ہوا، اور مجمع میں کوئی کمی نہیں آئی، اگلے دن مجھے علی الصباح آسنسول جانا تھا، میں نے اپنے رفیق سفر سے کہا کہ انگریزی کے سب اخبارات خرید کر لے آئیں معلوم ہوا کہ پریس نے حسب عادت اس عظیم جلسہ کو نظر انداز کیا، بعض مقامی اخباروں میں اگر خبر آئی بھی تو ان الفاظ میں کہ "مجمع میں کئی سو مسلمان تھے" HUNDREDS OF MUSLIMS ATTENDED یہ بات جہاں اخبارات کی

غیر ذمہ دارانہ روش کی غماز ہے، وہاں ملک وحکومت کے ساتھ بدخواہی پر بھی دال ہے، جس سے ملک کے حقیقی مسائل، اقلیتی فرقوں کے جذبات واحساسات اور احتجاجی وتعمیری جلسوں کے حجم ورقبہ کو بھی چھپایا جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ صحیح رائے قائم کرنے اور دانشمندانہ اور جرأت مندانہ قدم اٹھانے سے قاصر رہتے ہیں۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ کھلی مداخلت فی الدین اور شریعت اسلامی پر حملہ

اردو کی پرانی مثل ہے "سر منڈاتے ہی اولے پڑے" میرے ساتھ بالکل یہی صورت حال پیش آئی کہ ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۸۳ء کو میرا بحیثیت صدر کے انتخاب ہوا تھا، ۶، ۷ اپریل ۱۹۸۵ء کو کلکتہ میں تاریخی اجلاس ہوا، جس کی صدارت کے فرائض میں نے انجام دیئے، اور ۲۳ اپریل ۱۹۸۵ء ہی کو (کلکتہ کے اجلاس کے دو ہفتہ بعد ہی) سپریم کورٹ نے نفقۂ مطلّقہ کے سلسلہ میں اپنا وہ فیصلہ دیا، جس میں دین میں کھلی مداخلت، قرآن مجید کے الفاظ کی من مانی تشریح وتفسیر، شریعت اسلامی کی توہین اور اس پر کھلا حملہ تھا، اس نے ملّت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس کو اپنے دین وشریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری، اور غیرت وخودداری کے ایک فیصلہ کن مرحلہ پر لا کھڑا کر دیا۔

اس مقدمہ میں جو محمد احمد خاں اپیل کنندہ بنام شاہ بانو بیگم وغیرہ کے سلسلہ میں دائر تھا، فاضل جج چندر چوڑ چیف جسٹس نے جو فیصلہ دیا اس کے چند اقتباسات پیش ہیں:۔

"قانون ساز منو نے کہا تھا: عورتیں آزادی کی مستحق نہیں ہیں،
اور یہ بات مبیّنہ طور پر کہی جاتی ہے کہ اسلام کا تاریک پہلو یہ ہے کہ
اس نے عورتوں کا درجہ گرا دیا ہے" (منتخبات قرآن، ایڈورڈ ولیم لین
۱۸۴۳ء، اشاعت ثانی ۱۹۸۲ء صفحہ x c (تعارف) پیغمبر (صلے اللہ
علیہ وآلہ وسلم) سے یہ قول (توقع ہے کہ غلط طور پر) منسوب ہے کہ
"عورت ٹیڑھی پسلی سے بنائی گئی ہے، اگر تم اسے سیدھا کرنے کی
کوشش کروگے تو یہ ٹوٹ جائیگی، اس لئے اپنی بیویوں کے ساتھ
مہربانی کا سلوک کرو"۔

"اگر کوئی ایسا شخص جسے اس طرح کا کوئی حکم (نان ونفقہ دینے
کا حکم) دیا گیا ہو کسی معقول سبب کے بغیر اس کی تعمیل سے قاصر رہتا
ہے تو اس طرح کا کوئی مجسٹریٹ جرمانے وصول کرنے والے طریقۂ کار
کے تحت متعلقہ رقم کی وصولیابی کے لئے وارنٹ جاری کر سکتا ہے، اور
متعلقہ شخص کو وارنٹ کی تعمیل کے بعد پوری رقم یا ہر ماہ کے الاؤنس
کی باقی ماندہ رقم کے لئے ایک ماہ، یا ادائیگی اگر اس سے قبل کر دی جائے
تو متعلقہ مدت کے لئے سزا دے سکتا ہے"۔

قرآن کی آیات ۲۴۱ اور ۲۴۲ اس بات کی مظہر ہیں کہ پیغمبر
(صلے اللہ علیہ وسلم) کے مطابق ایک مسلم شوہر اپنی مطلقہ کو نان ونفقہ
فراہم کرنے کا پابند ہے، ان آیات کا عربی متن اور ان کا انگریزی ترجمہ
درج ذیل ہے۔

آیت ۲۴۱
وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ ○
(البقرۃ - ۲۴۱)

اور طلاقنوں کے حق میں بھی نفع پہونچانا دستور کے موافق مقرر ہے (یہ) پرہیزگاروں پر واجب ہے۔

ان آیات کے ترجمہ کی صحت متنازعہ نہیں ہے، سوا اس کے کہ اپیل کنندہ کا کہنا ہے کہ آیت ۲۴۱ میں لفظ متاع کے معنی عطا کرنے فراہم کرنے کے ہیں، نہ کہ نان ونفقہ کے، یہ امتیاز کسی فرق کے بغیر ہے۔

محمد ظفر اللہ خاں کی تفسیر "دی قرآن" (ص ۳۸) میں دونوں آیات کا انگریزی ترجمہ اس طرح دیا گیا ہے۔

"مطلقہ عورتوں کو بھی معقول طریقے کے مطابق دیا جائے گا، یہ ایک ایسی ذمہ داری ہے، جو متقی لوگوں پر لازماً عائد ہوتی ہے، اس طرح اللہ اپنے احکام تم پر واضح کرتا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔"

"دی مینگ آف قرآن" (جلد اول، مطبوعہ بورڈ آف اسلامک پبلی کیشنز دہلی) میں آیات ۲۴۰ تا ۲۴۲ کا ترجمہ اس طرح دیا گیا ہے۔

"ڈاکٹر علامہ خادم رحمانی نوری کی" دی رننگ کمنٹری آف دی ہولی قرآن" (۱۹۶۴ء ایڈیشن)

فاضل جج نے اپنے حوالہ میں آیات پیش کرنے کے بعد لکھا۔

ان آیات کے پیش نظر اس بات میں کسی شک وشبہ کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ از روئے قرآن ایک مسلم شوہر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی زوجہ مطلقہ کو نان ونفقہ فراہم کرے یا اس کے

گزارے کا انتظام کرے، اس کے برعکس کہی جاتی والی بات تعلیمات قرآنی کے ساتھ مبنی بر انصاف نہیں۔

یہ بات بھی بہت افسوسناک ہے کہ ہمارے آئین کی دفعہ ۴۴ (مشترکہ سول کوڈ سے متعلق رہنما اصول) ہنوز حرف بے جان کی سی ہے،..... یکساں سول کوڈ متصادم نظریات پر مبنی قوانین کے تئیں بے جوڑ وفاداریوں کو ختم کر کے قومی یکجہتی کے حصول میں مدد دے گا۔

عدالتوں کو ناگزیر طور پر سماجی مصلح کا رول ادا کرنا پڑے گا، کیونکہ حساس ذہن اس طرح کی صریح ناانصافی کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے، لیکن مختلف شخصی قوانین کے درمیان پائی جانے والی اس خلیج کو پُر کرنے کے لئے عدالتوں کی جستہ جستہ کوششیں ایک مشترکہ سول کوڈ کا بدل نہیں بن سکتیں"۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ اور شرعی قانون کا تقابل

سپریم کورٹ کا فیصلہ ۱۲۵ کے ذریعہ مطلقہ کو صرف اسی شکل میں نفقہ دلاتا ہے کہ شوہر باوسائل اور زندہ ہو، ورنہ مطلقہ کو بھیک مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، لیکن اسلامی شریعت پر عمل کرنے کی صورت میں اس کی نوبت نہیں آسکتی، عدت کے بعد مطلقہ اپنے گھر لوٹے گی، اور جن وارثوں پر اسلامی قانون نے اس کا نفقہ واجب کیا ہے، ان سے نفقہ پائے گی، اس فیصلہ میں CR.P.C. کی دفعہ ۱۲۵

کے ذریعہ مطلقہ کو بیوی بنا کر شوہر سے تا نکاح ثانی یا تا حین حیات نفقہ دلانے کی بات کہی گئی ہے، سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ ہندو مذہب کی عکاسی کرتا ہے۔

ہندو مذہب میں شادی کے بعد عورت کا رشتہ اپنے سابق پدری خاندان سے کٹ جاتا ہے، وہ شوہر کی ہو رہتی ہے، لوٹ کر اپنے گھر آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لئے جو کچھ اس کو مل سکتا ہے، شوہر ہی سے مل سکتا ہے، اسی بنیاد پر مطلقہ کو صرف شوہر ہی سے نفقہ دلانے کی بات کی گئی ہے، اسلامی قانون بالکل ہی دوسرا ہے، اسلام شادی کے بعد عورت کا رشتہ اپنے خاندان سے نہیں کاٹتا، اسلامی نقطۂ نگاہ سے لڑکی لڑکی ہے، بہن بہن ہے اور مرتے وقت تک لڑکی اور بہن رہے گی۔

سپریم کورٹ کے فیصلہ میں بعض انگریزی ترجموں کی مدد سے "متاع" کی تفسیر نفقۂ دائمی سے کی گئی ہے جس کے لئے MAINTENANCE کا لفظ بعض انگریزی ترجموں میں استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ اس موقعہ پر تفسیر و حدیث و فقہ کے مطابق عارضی استعمال و انتفاع کے لئے کوئی رقم، یا جوڑہ، یا تحفہ ہوتا ہے۔[1]

---

[1] ایسی عورت جس کا نکاح بغیر تعین مہر کے ہوگیا ہو، اور اسے شوہر نے ملاپ سے پہلے طلاق دے دی ہو، اس عورت کے لئے "متاع" دینے کا حکم ہے مطلب یہ ہے کہ اس بیچاری کو دین مہر بھی نہیں ملتا، اور ایسی صورت میں اس پر عدّت بھی واجب نہیں ہے کہ اس کو عدّت کا خرچہ دلایا جائے، اس لئے اس کو وقتی طور پر دلدہی کے لئے اپنی سکت کے مطابق کچھ نہ کچھ جوڑا وغیرہ دیدینے کا حکم ہے، یہ وقتی اور فوری چیز ہے، سپریم کورٹ نے اپنے حالیہ فیصلہ میں اسی آیت کا حوالہ دے کر زندگی بھر کا نفقہ تمام ہی مطلقہ عورتوں کے لئے عائد کردیا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، "نفقہ مطلقہ کے بارے میں سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ" ص ۱۳-۱۴ از مولانا برہان الدین صاحب استاد تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء)

عدالت کا یہ بھی اپنے حدود سے تجاوز اور خطرناک اقدام تھا، کہ اس نے خود اس مذہب کے ماہرین اور مستند مفسّرین کے متوازی و متبادل ان لوگوں کے ترجمہ پر اپنے فیصلہ کی بنیاد رکھی جن کی قرآن فہمی تو الگ رہی عربی دانی بھی مشکوک ہے۔

ایک خطرناک اقدام

سپریم کورٹ کے فاضل جج صاحب نے "متاع بالمعروف" کا ترجمہ MAINTENANCE (گذارہ) سے کیا ہے، اگرچہ قرآن مجید کے انگریزی میں ترجمہ کرنے والے زیادہ تر فاضل و محتاط مترجمین نے "گذارہ" کے بجائے "شریفانہ اور معقول سامان یا اسباب" کے الفاظ اور مفہوم سے کام لیا ہے[1]، لیکن اصولاً قرآن مجید کے کسی دوسری زبان میں کسی ایک دو تراجم کی مدد اور حوالہ سے کسی قرآنی لفظ یا شرعی اصطلاح کی تشریح کرنا اور اس کی بنیاد پر کسی طے شدہ اور اجماعی مسئلہ کے خلاف عدالت کا فیصلہ دے دینا ایک خطرناک اقدام ہے جو بہت اہم اور دوررس نتائج کا حامل ہے، اور اس سے ایک ملّت کی پوری شریعت اور اس کا مذہبی و معاشرتی نظام خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہوں تراجم قرآن از مارماڈیوک پکتھال، جارج سیل، رچرڈ بیل (RICHARD BELL) آرتھر جے آربری (ARTHUR J. ARBURY) نیز ترجمہ انگریزی مولانا عبدالماجد دریابادی و ترجمہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

حقیقت میں انگریزی عہد کے ماہرین قانون اور عدالت عالیہ کے فاضل ججان زیادہ دور اندیش، باریک بیں اور عدالت کی ذمہ داریوں سے واقف تھے۔

۱۸۹۷ء میں پریوی کونسل لندن کے ایک فیصلے میں جو آغا محمد جعفر ——— بنام کلثوم بی بی کے مقدمے میں کیا گیا تھا، پریوی کونسل کے فاضل جج کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلے:۔

"اس عدالت کے لئے یہ نامناسب ہوگا کہ وہ قدیم زمانے کے مفسرین جن کا پایہ بہت بلند تھا، ان کے مقابلے میں اس آیت کا مطلب خود تلاش کرنے کی کوشش کرے[1]"

اسی طرح ۱۹۰۳ء میں اس وقت کی پریوی کونسل کے فاضل جج نے ایک دوسرے مقدمے میں فیصلہ دیتے ہوئے لکھا:۔

"یہ تسلیم کرلینا اصولی طور پر بہت خطرناک ہوگا کہ موجودہ زمانے کے علماء کسی قدیم متن سے کوئی نیا قانون وضع کرسکتے ہیں، جبکہ قدیم علمائے قانون میں سے کسی نے اس قسم کی رائے کا اظہار نہ کیا ہو[2]"

ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی ہندوستان کی آخری عدالت (سپریم کورٹ) نے بھی اسی اصول پر عمل کیا اور اس کے فیصلوں میں اس کی نظیریں پائی جاتی ہیں، یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

۱۹۸۰ء کے ایک مقدمہ کی اپیل کا فیصلہ کرتے ہوئے، سپریم کورٹ کے فاضل جج

---

[1] ایل۔ آر ج ۲۶ ۱۸۹۷ء ص ۲۰۳۔۲۰۴ [2] باقر علی خاں بنام انجمن آراء بیگم اور صادق علی خاں بنام انجمن آراء بیگم۔ ایل، آر ۱۹۰۳ء ج ۳۰ ص ۱۱۱۔۱۱۲

نے حسب ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا :۔

"ہماری رائے میں فاضل جج نے اس پر دھیان نہیں دیا ہے کہ دستور کا حصہ سوم جانبین کے عائلی قانون سے متعلق نہیں ہے، جانبین کے عائلی قانون کے نفاذ میں انھیں اپنے موجودہ زمانے کے تصوّرات کو داخل نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ہندو قانون کے مستند اور معروف ماخذوں جیسے سمرتی اور اس کی تشریحات میں موجود ہے، اس کا نفاذ کرنا چاہیے"[1]

اس فیصلہ میں یکساں سول کوڈ کی پر زور حمایت کی گئی ہے، اور کہا گیا ہے :۔

"یہ بات بھی بہت افسوسناک ہے کہ ہمارے آئین کی دفعہ ۴۴ (مشترکہ سول کوڈ سے متعلق رہنما اصول) ہنوز حرفِ بے جان کی سی ہے، یکساں سول کوڈ متصادم نظریات پر مبنی قوانین کے تئیں بے جوڑ وفاداریوں کو ختم کر کے قومی یکجہتی کے حصول میں مدد دے گا"

سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف ہمہ گیر مہم اور عظیم الشان جلسوں کا سلسلہ

اس فیصلہ کے خلاف ملّت کے اضطراب و پریشانی کے اظہار، اور عائلی قوانین کے سلسلہ میں صریح اسلامی تعلیمات اور متفقہ اور مسلمہ شرعی احکام و منصوصات پر عمل کرنے کی آزادی بقا و تحفظ کے مطالبہ کی اس سکولر اور جمہوری ملک میں یہی شکل تھی، کہ اس فیصلہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کے ایسے عظیم الشان احتجاجی جلسے سارے ملک میں ہوں جن کا اثر ملک کے انتظامیہ، اس کے ذمہ داروں، وزیر اعظم اور

---

[1] کرشنا سنگھ، بنام متھرا اہیر۔ اے۔ آئی۔ آر ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۲۰۷

صدر جمہوریہ، وزیر قانون، وزیر داخلہ اور ایوان قانون ساز (پارلیمنٹ) پر پڑے، اور پارلیمنٹ میں نئے بل کے ذریعہ اس کو منسوخ کرایا جائے، اس سلسلہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے وزیر اعظم کے نام بڑی تعداد میں احتجاجی تار بھیجے، مساجد میں مسلمانوں کو صورت حال سے آگاہ کرنے، اور ملک کے چپہ چپہ پر عمومی جلسے کرنے کی ہدایت واپیل کی، ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ نے اس کا ایسا اثر لیا اور اس کی تعمیل کی جس کی نظیر تحریک خلافت کے بعد کسی دوسرے ملی مسئلہ کے سلسلہ میں نظر نہیں آتی، لاکھوں کی تعداد میں ملک کے گوشہ گوشہ، شہروں، قصبات اور دیہاتوں سے تار دیئے گئے، مساجد میں تقریریں اور دعائیں ہوئیں، ملک میں پورب سے لے کر پچھم تک، اور اتر سے لے کر دکھن تک عظیم الشان جلسے ہوئے، جن میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی تعداد میں مسلمانوں کا جمع ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں رہی، خود میرے شہر رائے بریلی میں جو کوئی بڑا شہر نہیں ہے، ۹ فروری ۱۹۸۶ء کو کل ہند تحفظ شریعت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں (قومی آواز کی رپورٹ کے مطابق) ریاست کے مختلف اضلاع کے ایک لاکھ سے زیادہ فرزندانِ اسلام نے شرکت کی، مسلمانانِ رائے بریلی کے لئے جنھوں نے ۹ فروری کو اپنا کاروبار بند کر دیا تھا، وہ دن ایک یادگار دن ہے، ان کو یاد نہیں کہ اتنی عظیم الشان کانفرنس کبھی شہر میں ہوئی ہو[1]، انسانوں کا ایک سمندر لہریں مار رہا تھا، پوری سڑک پر ہر گھر میں شہر کی پردہ نشین خواتین کے ہجوم تھے، جو کمروں میں اور چھتوں پر ہزاروں کی تعداد میں موجود تھیں[2]۔"

---

[1] یاد رہے کہ رائے بریلی شہر کی کل آبادی ایک لاکھ سے کچھ متجاوز ہے۔

[2] "قومی آواز" ۱۳ فروری ۱۹۸۶ء۔

اسی طرح یوپی اور بہار کے مرکزی مقامات اور بڑے بڑے شہروں کے علاوہ قصبات تک میں عظیم الشان جلسے ہوئے بعض کارکنوں نے دستخطی مہم بھی چلائی جس پر ہزاروں ہزار کی تعداد میں مسلمانوں نے دستخط کئے نومبر ۱۹۸۶ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایک وفد نے جس میں میں اور مولانا مجاہد الاسلام صاحب تھے جنوبی ہند کا دورہ کیا، جو مدراس سے شروع ہو کر کوچین، کالی کٹ تک جاری رہا، اور منگلور (کرناٹک) کے ایک عظیم الشان اجلاس پر ختم ہوا، اس دورہ میں مسلم لیگ کے صدر (جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب ایم۔پی) بنفس نفیس شریک تھے تامل ناڈو اور کیرالا کی جماعت اسلامی کے امیر حلقہ پورا تعاون کر رہے تھے تعمیر ملت اور دوسری مسلم تنظیموں کے ذمہ دار پورے طور پر شریک تھے، مسلمانوں میں دینی بیداری، اسلام سے وفاداری کی ایک طاقتور لہر آئی ہوئی تھی، مجھے یاد ہے کہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک ٹرین سے جاتے ہوئے آدھی رات کو اسٹیشن پر مسلمانوں کا مجمع نظر آتا جو اپنے دینی رہنماؤں کی زیارت کرنا چاہتا تھا، اور اکثر یہ کہتا کہ "شریعت کی حفاظت کے لئے جان و مال حاضر ہے" یہ دورہ جونپور کے عظیم الشان اجلاس پر ختم ہوا، جو ۱۷ر نومبر کو منعقد ہوا تھا۔

دوسری طرف مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنی کمزوری صحت اور شدید مشغولیتوں کے باوجود مختلف ریاستوں کا طوفانی دورہ کیا جس میں آندھرا پردیش اور کشمیر بھی شامل تھا، بہار اور اڑیسہ کے دوروں اور جلسوں کا تو کچھ شمار نہیں، علاوہ کثرت تعداد کے یہ پہلو بھی قابل لحاظ ہے کہ مسلمان فرقوں، مکاتب خیال

اور مختلف مسلم تنظیموں کی ایسی نمائندگی کم دیکھنے میں آئی ہے مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء ہند، جماعت اسلامی ہند، تعمیر ملت، اتحاد المسلمین، مسلم مجلس کے علاوہ فرقۂ اثنا عشری میں سے جناب مولانا سید کلب عابد صاحب مجتہد نائب صدر بورڈ، جناب شبیر بھائی نورالدین (بوہرہ جماعت) جناب یوسف حاتم مچھالہ صاحب ایڈوکیٹ (بوہرہ جماعت) پرنس انجم قدر صاحب صدر آل انڈیا شیعہ کانفرنس، جناب مولانا محمد اسعد مدنی صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند، مولانا سید مظفر حسین صاحب کچھوچھوی عاملہ کے جلسوں میں شریک ہوتے اور عمومی جلسوں میں خطاب فرماتے۔

اس تحریک کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اگرچہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کو طبقۂ نسواں کے ساتھ انصاف کا عنوان دیا جا رہا تھا، اور اس کو ترقی پسندی بلکہ حقیقت پسندی کی ایک تاریخی علامت قرار دیا جا رہا تھا، اور غیر مسلموں کو چھوڑ کر مسلمانوں میں بھی بہت سے ترقی پسند (دانیال لطیفی اور دلوائی گروہ کے آزاد مسلمان) اس کی تائید میں تھے، مسلمان خواتین کی اکثریت اس فیصلہ کی مخالفت، شریعت اسلامی کی کلی حمایت، اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تائید میں تھی، اور ان میں متعدد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سربرآوردہ اور معزز خواتین تھیں، جن میں جناب نجمہ ہبۃ اللہ صاحبہ نائب صدر راجیہ سبھا اور بیگم صاحبہ فخرالدین علی احمد صاحب مرحوم سابق صدر جمہوریۂ ہند کا خصوصیت سے نام لیا جا سکتا ہے، پرسنل لا بورڈ کی تحریک اور خود اپنے جذبہ سے بہت سے مرکزی مقامات پر خواتین کے جلسے ہوئے متعدد تعلیم یافتہ خواتین نے اردو،

انگریزی اخبارات میں مراسلات شائع کروائے۔

یہاں خواتین کے صرف ایک جلسہ کا جو بوٹ کلب نئی دہلی میں ۱۰ اراپریل ۱۹۸۶ء کو منعقد ہوا تھا مختصر طور پر ایک شریکِ جلسہ معزز خاتون کے قلم سے "آنکھوں دیکھا حال" کے مضمون کی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:۔

"دہلی بوٹ کلب ہاؤس کلب کے میدان میں ۱۰ اراپریل ۱۹۸۶ء کو مسلم خواتین کا ایک عظیم الشان تاریخی جلسہ بیگم عابدہ احمد، ایم، پی کے زیرِ صدارت منعقد ہوا، یہ جلسہ شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف، بہ طور احتجاج کیا گیا تھا، جلسے میں خواتین نے یک زبان ہوکر حکومت ہند سے اپیل کی کہ وہ سپریم کورٹ کے اس غیر شرعی فیصلے کو مسترد کرے۔

اس جلسے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں عام خواتین کے دوش بہ دوش نئی روشنی کی مسلم تعلیم یافتہ خواتین بڑی تعداد میں نہ صرف یہ کہ شریک تھیں بلکہ کارکردگی میں نمایاں حصے لے رہی تھیں۔

جلسہ گاہ کا وسیع پنڈال خواتین سے کھچا کھچ بھرا تھا، دینی جذبے اور ملّی حمیّت سے سرشار ان عورتوں کو موسم کی شدّت اور گرمی کی مطلق پرواہ نہ تھی، جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ نعرۂ تکبیر کی صداؤں سے فضا گونج رہی تھی۔

مقرّرین میں بیگم عابدہ احمد کے علاوہ بیگم ضیا الرحمٰن انصاری بیگم خورشید عالم خاں اور بیگم ساغر نظامی کے نام قابلِ ذکر ہیں، دہلی

اور اس کے گرد و نواح کے علاوہ مراد آباد، علی گڑھ اور میرٹھ وغیرہ کی خواتین بھی جلسہ میں شرکت کے لئے آئی تھیں، لکھنؤ سے بیگم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور بیگم نسیم اقتدار علی شرکت کے لئے گئی تھیں۔

جلسے کے آخر میں اعلان کیا گیا تھا کہ چند منتخب خواتین وزیر اعظم ہند کی خدمت میں ایک میمورنڈم پیش کرینگی۔[1]

انگریزی، ہندی پریس کا ناقابلِ فہم موقف اور زلزلہ انگیز طوفانِ مخالفت

اس کے بالمقابل انگریزی و ہندی پریس نے اس مسئلہ پر ایسی مخالفانہ صف آرائی (OPPOSED TOOTH AND NAIL) کا مظاہرہ کیا جس کی مثال شاید تقسیم ہند اور جداگانہ قومیت کے مسئلہ پر بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی، پریس اور فرقہ پرست جماعتوں کی قیادت نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کی اس شدتِ احساس، اس فیصلہ کو تبدیل کرانے کی کوشش اور ایک جزوی عائلی مسئلہ میں اسلام کے قانون شرعی پر عمل کرنے کی اجازت کو بحال رکھنے کے مطالبہ کو، جس سے ایک فرقہ (مسلمانوں) کے ایک محدود طبقہ (خواتین) کی ایک چھوٹی سی تعداد (مطلقہ خواتین) متاثر ہوتی تھی اس نظر سے دیکھا گویا اس ملک پر کوئی غیر ملکی طاقت حملہ کرنے والی ہے، یا کوئی ہیبت ناک زلزلہ آنے والا ہے یا کوہ آتش فشاں پھٹنے والا ہے، یا کوئی ملک گیر مہلک وبا پھیلنے والی ہے، جیسا کہ میں نے اپنے دہلی کے ڈائلاگ (DIALOGUE) اور پریس کانفرنس ۴ مئی ۱۹۸۶ء میں کہا ہے، انھوں نے اس بارہ میں اصول

---

[1] ایک چشم دید روایت بقلم بیگم اقتدار علی خاں صاحب، سابق چیف انجینیر یو، پی۔

"احساس تناسب" (SENSE OF PROPORTION) کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔

میں نے دہلی کے ڈائلاگ میں جو ۴؍ مئی ۱۹۸۶ء کو انٹرنیشنل سینٹر میں منعقد ہوا تھا، اسی تاثر کو بیان کرتے ہوئے کہا:۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے ہندوستان میں خطرہ کی ایسی گھنٹی بج گئی، جیسی (خدا محفوظ رکھے) ملک پر کسی بیرونی حملہ، یا ملک کے اندر کسی شدید وبا، یا کوہ آتش فشاں پھٹنے کے موقعہ پر بجنی چاہئے، یہ اس احساس تناسب (SENSE OF PROPORTION) کے بھی خلاف ہے، جس پر زندگی کا نظام چل رہا ہے، مسئلہ جس نسبت سے توجہ اور فکر و پریشانی کا مستحق ہے، اس نسبت سے اس کی طرف توجہ اور اس میں توانائی صرف کرنے کی ضرورت ہے، رائی کا پربت بنانا نہ عقل سلیم کا تقاضہ ہے، نہ عقل عملی (PRACTICAL WISDOM) کا۔

گاندھی جی کے اس اعلیٰ اخلاقی و اصولی موقف اور اس عاقلانہ قیادت کو سامنے رکھتے ہوئے کہ انھوں نے ایک ایسے مسئلہ میں (مسئلہ خلافت میں) جس کا تعلق ہندوستان کے مسلمانوں کے اندرونی حالات سے براہ راست نہ تھا، ہندوستان سے ہزاروں میل دور، اور سمندروں پار خلافت کے مسئلہ سے تھا، اور جس کا مرکز ترکی تھا، مسلمانوں کی پوری تائید و حمایت کی، ہمارے ہم وطنوں اور اکثریت کے دانشوروں اور اخبار نویسوں اور مختلف پارٹیوں کے رہنماؤں کا موقف یہ ہونا چاہئے تھا کہ اگر وہ مسلمانوں کے موقف کی تائید نہ کریں تو کم سے کم غیر جانبدار اور خاموش رہیں کہ اس سے ان کے عائلی قانون "پرسنل لا" ان کی قومی زندگی اور ان کے طبقہ خواتین کے حقوق و تحفظ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس سے ملک میں

ایک خوشگوار فضا اور باہمی اعتماد کی کیفیت پیدا ہوتی، اس سے کہیں زیادہ ان کی توجہ کی مستحق خود ان کے فرقہ اور طبقۂ نسواں کی سیکڑوں، ہزاروں نئی بیاہی ہوئی دُلہنوں کے جلائے جانے یا غیر طبعی طور پر ان کو ہلاک کر دینے کے وہ واقعات ہیں جن سے شاید اس لمبے چوڑے ملک میں کوئی دن خالی جاتا ہو، نیشنل پریس کی اطلاع کے مطابق صرف دہلی میں ہر بارہ[۱۲] گھنٹے پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے،[۱]

---

[۱] حیرت ہے کہ جن لوگوں، اور جن انگریزی اور ہندی پریس نے مسلم مطلقہ قانون کے سلسلہ میں ۶ مئی ۱۹۸۶ء کے منظور شدہ بل پر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا، اور اس کو طبقۂ نسواں کے حق میں ظلم عظیم سمجھا تھا، اس نے ستی کی اس ظالمانہ رسم کے خلاف اس ردِ عمل کا ثبوت نہیں دیا جس کی وہ مستحق تھی، دیورالا (سیکر) راجستھان میں ۱۸ سال کی نوجوان خاتون روپ کنور ۴ ستمبر کو اپنے شوہر کے ساتھ تقریباً ۱ لاکھ افراد کی موجودگی میں "جو ستی ماتا کی جے جے" کے نعرے لگا رہے تھے ستی ہو گئی، اور عقیدتمندوں کے سیلاب کے درمیان راجستھان ہائی کورٹ کے حکم اور بعض تنظیموں کی اس کے خلاف رٹ دائر کرنے کے باوجود چندری کی رسم بھی انجام پائی، روپ کنور کے کنبے والے جے پور سے چندری لے کر پہلے ہی پہونچ گئے تھے، اس کے خاندان والے جلوس کی شکل میں اس مقام پر پہونچے، راجپوت نوجوان ہاتھوں میں ننگی تلواریں لے کر ستی کے مقام پر پہرہ دے رہے تھے، گذشتہ تیرہ دنوں میں لاکھوں روپے کے ناریل فروخت ہوئے، ستی کی تصویر کھلے عام ۱۰-۱۰ روپے میں فروخت ہو رہی ہے، دُور دراز کے آنے والوں کا سلسلہ تیزی سے جاری رہا، حیرت ہے کہ اس خلافِ انسانیت فعل پر جس ملک گیر پیمانہ پر اور پریس کی جس طاقت کے ساتھ احتجاج اور مظاہرے ہونے چاہئے تھے، وہ ابھی تک دیکھنے میں نہیں آئے۔ (ماخوذ از "قومی آواز" ۱۸ ستمبر لکھنؤ)

معلوم ہوا ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں تھا اس سے پہلے متعدد واقعات ہو چکے ہیں، اور ان پر وہ برہمی اور بیزاری پیدا نہیں ہوئی جس کا مسلم مطلقہ کے گذر اوقات کی ذمہ داری کے سلسلہ میں (جس کا شریعت اسلامی نے معقول انتظام کیا ہے) اظہار ہوا تھا۔ "ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا"۔

لکھنؤ کی اشاعت ۶ر اپریل ۱۹۸۶ء میں ایک خاتون کا بیان "TIMES OF INDIA" شائع ہوا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ "ہندوستان میں ہر سال غیر قانونی طور پر اسقاط حمل سے چھیاسٹھ ۶۶ لاکھ اموات ہوتی ہیں"[1]۔

وزیر اعظم سے ملاقاتیں اور افہام و تفہیم کی کوشش

عوامی جلسوں کے اس تسلسل کے ساتھ جس کی مثال تقسیم ہند کے بعد ملی مشکل ہے نیز تاروں، تجاویز کی نقلوں اور دستخطی مہم کے ساتھ جو کسی جمہوری حکومت کو مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے کافی ہے، بورڈ کے صدر اور سکریٹری نے وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو گاندھی سے براہ راست ملنے اور ان کو مطمئن کرنے کی ضرورت محسوس کی، اس سلسلہ کی ایک کڑی وہ تھی کہ ۳۰ر جولائی ۱۹۸۵ء کو ایک نمائندہ وفد کے ساتھ وزیر اعظم صاحب سے ملنے کی کوشش کی گئی، اور ان کو یادداشت پیش کی گئی، دوسری شکل ذاتی ملاقاتوں کی تھی جس کی تفصیل آئندہ سطور میں آتی ہے۔

۲ر فروری ۱۹۸۶ء کو دہلی میں مجلس عاملہ اور ایکشن کمیٹی کا اجلاس تھا ۳ر فروری کو اچانک میرے پاس وزیر اعظم کی طرف سے ملاقات کی دعوت آئی ٹیلیفون پر پیغام ملا کہ پرائم منسٹر دیر سے آپ کے منتظر ہیں، آپ ابھی تشریف لے آئیے، میں اپنی جگہ پر طے کئے ہوئے تھا کہ مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر اور اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے کہ مولانا منت اللہ صاحب رحمانی اپنے وسیع تجربات اور مطالعہ کی روشنی میں مسئلہ کے من وعن اور اس کے فقہی و قانونی پہلوؤں پر زیادہ گہری نظر رکھتے ہیں، میں ایسے

---

[1] قومی آواز دہلی ۱۰ر جون ۱۹۸۶ء

موقعوں پر ان کی معیت و رفاقت اور ان کی اعانت و رہنمائی کے بغیر کوئی اہم ملاقات نہیں کروں گا، میں نے ٹیلیفون پر اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے اجازت دی جائے کہ مولانا کو بھی اپنے ساتھ لاؤں، لیکن جواب ملا کہ اس مرتبہ آپ تنہا ہی تشریف لایئے، میں وہاں گیا تو وزیر قانون مسٹر اشوک سین بھی وہاں موجود تھے، محترم ضیاء الرحمن انصاری صاحب وزیر مملکت باہر تشریف رکھتے تھے، ان کو دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا، میں اپنی شخصیت کی بے وزنی اور ایسے نازک موقعوں پر طاقتور وکالت کی نااہلی سے خوب واقف تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور دعا و انابت کے سوا کوئی زاد راہ نہ تھا، الحمد للہ کہ ان کوششوں سے میرا مقصد کسی شخصی یا سیاسی مفاد کی تکمیل، اور حصول جاہ و منصب نہیں تھا، میں نے ہر ملاقات میں اس کا صاف اثر دیکھا۔

میں نے راجیو جی سے کہا کہ راجیو جی! جس طرح رسم الخط SCRIPT کا ایک شارٹ ہینڈ ہوتا ہے، سیاست پالیٹکس کا بھی ایک شارٹ ہینڈ یا شارٹ کٹ ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جن کا مسئلہ ہے، اس کو ان کے مخلص و مستند لوگوں سے سمجھ لیا جائے، قبل اس کے کہ وہ سیاسی پالیٹشینز کے ہاتھوں جانے پائے اور وہ اپنے سیاسی مقاصد اور مفادات کے لئے اس کو طوالت دیں، اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجیو جی کے یہ بات سمجھ میں آگئی، انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ شخص پیشہ ور سیاسی، اور کوئی گھاگھ لیڈر نہیں ہے، جب پارلیمنٹ میں ایسے بل پیش کرنے کا ذکر آیا جس سے سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ (جس کے اوپر ہندوستان میں کوئی عدالت نہیں) کالعدم ہو سکتا ہو تو راجیو جی نے معذرت کے انداز میں کہا کہ

بعض قانونی مجبوریوں کے باعث آرڈیننس نہیں آسکا، اب بل پارلیمنٹ میں آجائیگا۔

۱۷ر فروری کو وزیراعظم سے پھر ملاقات ہوئی، اس موقعہ پر مولانا سید منت اللہ صاحب بھی موجود تھے، انتظار والے کمرہ میں مسٹر اشوک سین وزیر قانون پہلے سے موجود تھے، انھوں نے مجھے دیکھ کر کہا کہ "مولانا صاحب بعض ایسے مسلم ججوں اور ماہرین قانون کے خطوط آئے ہیں جنھوں نے سپریم کورٹ کے فیصلہ کی تائید کی ہے لیکن مسلمانوں کی مجاریٹی (MAJORITY) آپ ہی کے ساتھ ہے" میں اپنے ساتھ اپنا وہ رسالہ بھی لے گیا تھا جس کا عنوان "انسانی تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات" ہے، اس میں طبقۂ نسواں کے حقوق کے بارہ میں مذاہب کا موازنہ اور تاریخ کی روشنی میں تقابلی مطالعہ ہے، مسٹر اشوک سین نے اس پر ایک نظر ڈالی، وزیراعظم خود آکر ہم لوگوں کو ملاقات کے کمرہ میں لے گئے، ان کی فرمائش پر وزیر قانون نے تین ورق کا مسودہ نکالا اور دفعہ وار پڑھنا شروع کیا، سوا گھنٹہ میں اس تین ورق کی خواندگی ختم ہوئی، یہ دیکھ کر اطمینان ہوا اور مسرت بھی کہ ہر دفعہ پر وزیراعظم کچھ سوال کرتے ہیں، اور بتلاتے ہیں کہ اس طرح نہیں اس طرح لکھا جائے، ہم نے اس انداز سے بل سے متعلق ان کی غیر معمولی دلچسپی محسوس کی، اور یہ بھی اندازہ ہوا کہ اس مسئلہ پر انھوں نے کچھ تیاری بھی کی ہے، ہر دفعہ پر وہ ہم لوگوں سے پوچھتے اور ہمارا جواب سن کر لکھواتے۔[1]

اچانک ایک دن وزیراعظم صاحب نے ۱۷-۱۸ آدمیوں کو جن میں مسلم لیڈران اور ممتاز مسلم ممبران پارلیمنٹ تھے پارلیمنٹ کے ایک ہال میں بلایا، مجھ سے جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ یہ کہہ چکے تھے کہ راجیو جی سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس بل کے پیش ہونے

---

[1] منقول از رپورٹ مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی۔

اور پاس ہونے سے پہلے مختلف مسلم ممالک کا طرز عمل بھی معلوم کر لیا جائے کہ انھوں نے اپنے یہاں کے مسلم پرسنل لا میں کوئی ترمیم کی ہے یا نہیں؟ اگر انھوں نے کی ہے تو پھر ایک سیکولر اسٹیٹ کو اس میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے، میں نے سمجھ لیا کہ اگر انھوں نے اس مشورہ کو قبول کر لیا تو مسئلہ کھٹائی میں پڑجائیگا، میرے ذہن میں خدا نے ایک بات ڈالی اور وہ تیر اپنے نشانہ پر بیٹھا، ہم لوگ جب جمع ہوئے تو وہ میرے سامنے ہی بیٹھے تھے، میں نے کہا کہ راجیو جی! اگر آپ سے کوئی کہے کہ دوسرے مسلم ممالک بھی تو ہیں، وہاں سے معلوم کرنا چاہئے کہ انھوں نے اپنے عائلی قانون (PERSONAL LAW) میں کوئی ترمیم کی ہے یا نہیں؟ پھر آپ ان کی تقلید کر سکتے ہیں، تو آپ کو یہ پوزیشن ہرگز قبول نہیں کرنا چاہئے، ہم ایک مرتبہ اگر انکار کریں تو آپ کو چار مرتبہ انکار کرنا چاہئے، اس لئے کہ جہاں تک ہندوستان کی رہنمائی کرنے کا تعلق ہے آپ کی یہ تیسری پشت ہے، ہندوستان علمی و مذہبی حیثیت سے (جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے) کسی مسلم یا عرب ملک سے کم نہیں ہے، وہ اپنا خود مقام رکھتا ہے، مجھے کہنا نہیں چاہئے لیکن کہتا ہوں کہ عالم اسلام کی سب سے بڑی ماہرین قانون شریعت اسلامی کی مجلس (اکیڈمی) رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ کی "المجمع الفقھی" ہے جس کا ہندوستان سے میں تنہا ممبر ہوں بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ سارے ممبران ایک طرف تھے، میرا ایک طرف تھا، اور فیصلہ میری رائے پر ہوا، یہاں اسی مجلس میں ایسے علماء موجود ہیں کہ اگر ان کا نام جامع ازہر مصر میں لیا جائے تو لوگ احترام سے گردن جھکا لیں، یہ بات جو نفسیاتی اثر رکھتی تھی اپنا اثر کر گئی اور راجیو جی نے پھر دوسرے ممالک کا حوالہ نہیں دیا۔

راجیو جی کے ایماء پر مسز نجمہ ہبۃ اللہ صاحبہ ایک روز مجھ سے ملنے لکھنؤ بھی آئیں،

تاکہ مسئلہ سے متعلق بعض پہلوؤں پر معلومات حاصل کریں، مولانا منت اللہ صاحب بھی اس گفتگو میں شریک تھے۔

اس وقت یہ بات بھی ہوئی کہ وزیر قانون صاحب اصلاح شدہ بل تیار کرلیں گے، اور ہم لوگ پھر ملاقات کریں گے، میں نے خواہش کی کہ اس مرتبہ ہم اپنے ساتھ کوئی قانون داں رفیق بھی لیتے آئیں، وزیر اعظم صاحب نے فرمایا کہ ضرور مگر وہ نرا پالیٹیشین نہ ہو، ۱۸ر کو ہماری ملاقات سوا سات بجے وزیر اعظم کے دفتر میں ہوئی، رحیم قریشی صاحب سکریٹری بورڈ بھی ساتھ تھے، ہم لوگوں نے بل دوبارہ سنا اور اس سے اتفاق ظاہر کیا، ایک دن وزیر اعظم صاحب کے ایماء پر مسز نجمہ ہبتہ اللہ صاحبہ نائب صدر راجیہ سبھا کے مکان پر مخصوص مسلم ممبران پارلیمنٹ، وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور نائب وزیر قانون برائے ریاست مسٹر بردواج اور ہم لوگ جمع ہوئے اور مجوّزہ بل کے نفاذ کی صورت میں ان مشکلات کا جائزہ لیا گیا، جو پیش آسکتی ہیں، اس میں ایک سوال یہ تھا کہ اگر مطلّقہ کے خونی رشتہ داروں میں کوئی ایسا باقی نہیں ہے، جو اس کی خبر گیری کر سکے تو اس کی کفالت کا کیا انتظام ہوگا؟ ہم لوگوں نے کہا کہ اس کی ذمہ داری صوبوں کے مسلم وقف بورڈ پر ڈالی جاسکتی ہے، اس پر وہ مطمئن ہوئے۔

ایک نازک مرحلہ

درمیان میں قبل اس کے کہ بل پر پارلیمنٹ میں بحث ہو ایک اور نازک مرحلہ پیش آگیا۔ بل کے پیش ہوجانے کے بعد مخالفین نے ایک قانونی نکتہ اٹھایا، اور جسٹس آئر نے صاف کہا کہ اس بل کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائے گا، اور چونکہ یہ بل دستور کی

دفعہ ۱۴ اور ۱۵ کے خلاف ہے' اور دستور میں دی گئی ذاتی آزادی (جو شخص جس مذہب اور جس تہذیب کو چاہے اختیار کرے) سے ٹکراتا ہے' اور ہندوستان کے باشندوں میں ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتا ہے' اس لئے سپریم کورٹ بہر حال اس بل کو مسترد کر دے گا، کہ ایسی قانون سازی جو دستور ہند کی دفعات کے خلاف ہو' اسے مسترد کرنا سپریم کورٹ کی ذمہ داری ہے' ان حالات میں بل میں ایک دفعہ کا اضافہ کیا گیا ہے' جس کا مفاد یہ ہے کہ اگر کوئی بد نصیب مطلقہ اس بل سے مطمئن نہ ہو، اسلامی قانون کے تحت نفقہ حاصل کرنا نہ چاہتی ہو' بلکہ وہ دفعہ ۱۲۵ ہی کے ذریعہ نفقہ حاصل کرنا اپنے لئے صحیح سمجھتی ہو تو ایسی درخواست دے سکتی ہے' اور پھر مجسٹریٹ دفعہ ۱۲۵ ہی کے تحت اس کا فیصلہ کرے گا۔

ترمیم میں یہ کہا گیا کہ صرف مطلقہ کا درخواست دینا اور دفعہ ۱۲۵ کے ذریعہ فیصلہ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کرنا قطعاً کافی نہ ہوگا، بلکہ مطلقہ اور اس کے سابق شوہر دونوں کی رضامندی ضروری ہوگی' اور دونوں کی مشترکہ درخواست کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکے گا جس کی توثیق حلف نامہ کے ذریعہ کی گئی ہو اور اگر تنہا مطلقہ نے درخواست کی تو پھر اس کا فیصلہ بل کے مطابق ہی ہوگا، دفعہ ۱۲۵ کے مطابق نہیں، دوسری شرط یہ لگائی گئی کہ یہ درخواست اور رضامندی مقدمہ کی سماعت سے پہلے ہی دن ہونی چاہیئے ورنہ قابلِ قبول نہ ہوگی۔

یہ گفتگو ۱۹ اپریل کو ہوئی، ہم لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ کسی ہوشیار اور باریک بیں مخالف قانون داں نے وزیر قانون یا راجیو جی کے کسی اہم مشیر کار کو سمجھایا ہے' اب اگر ہم اس کو مسترد کر دیتے ہیں تو پھر جہاں سے چلے تھے وہیں آجائیں گے، اور عنقریب

پیش ہونے والا بل تعویق میں پڑجائیگا، یا تعطل کا شکار ہوجائیگا، راجیوجی کے قریب ترین مشیرکار نے اس کا بھی اشارہ کیا کہ اگر آپ نے یہ اضافہ مان لیا تو گورنمنٹ خود بل کی حفاظت اور اس کے لئے قانونی چارہ جوئی کرے گی، ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس اضافہ میں دوٗ شرطیں لگا کر دفعہ ۱۲۵ کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں، اور عملاً اس کو بیکار کردیا گیا، دفعہ ۱۲۵ کے ذریعہ شوہر کو نا نکاح ثانی یا حین حیات نفقہ دینا پڑتا ہے' کوئی نادان شوہر ہوگا جو دفعہ ۱۲۵ کے ذریعہ نفقہ کا فیصلہ کرانا چاہے گا اور مطلقہ کی دی ہوئی درخواست پر اپنی رضامندی ظاہر کرے گا، اور اس پر دستخط ثبت کرے گا، اور کوئی ناخدا ترس اور ناسمجھ مطلقہ ہی ایسی ہوگی جو اسلامی قانون کو چھوڑکر جس میں اسے ہر مرحلہ میں نفقہ کی ضمانت ہے' ایسے غیر شرعی قانون کو ترجیح دے گی جس میں اس کے نفقہ کا انحصار شوہر کی خوش حالی اور زندگی پر ہے' اگر شوہر مفلس ہے' یا اس کا انتقال ہوجائے تو پھر مطلقہ کے لئے پریشانی اور حیرانی کے سوا کچھ نہیں۔

میں نے مولانا سید منت اللہ صاحب سے عرض کیا کہ چونکہ اس اضافہ کا قبول کرنا ایک نازک اور جرأت مندانہ فیصلہ ہے' اور وہ نہ صرف مخالفین بلکہ بہت سے مؤیّدین اور حامیوں کو بھی امتحان تزلزل میں ڈال دے گا، اس لئے اس کے ردّ وقبول کا فیصلہ متفقہ اور اجماعی طور پر ہونا چاہئے، مولانا نے اس سے اتفاق کیا اور مجلس عاملہ کے تمام ارکان سے کسی نہ کسی طرح رابطہ قائم کرکے ان کو اگلے دن میری قیام گاہ حافظ کرامت اللہ صاحب کی کوٹھی ۳۰ ویسٹ نظام الدین میں تشریف لانے کی دعوت دی گئی، یہ اللہ تعالٰی کی مدد تھی کہ اتنے شارٹ نوٹس پر ایک دو ارکان کو چھوڑکر سبھی ارکان ۲۱ اپریل ۱۹۸۶ء کو جمع ہوگئے، جن میں لکھنؤ، حیدرآباد، بمبئی اور ناگپور تک کے

ارکان تھے، مولانا سید کلب عابد صاحب بھی لکھنؤ سے تشریف لے آئے، شبیر بھائی نورالدین، اور یوسف حاتم مچھالہ صاحب بمبئی سے، رحیم قریشی صاحب حیدرآباد سے، مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب ناگپور سے اور ممبران پارلیمنٹ تو خود دہلی میں موجود تھے، مسئلہ جب ان کے سامنے پیش کیا گیا تو سب سے پہلے جناب محمود بنات والا صاحب سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے (جنھوں نے فیصلہ اور پیش کردہ بل کے خلاف سب سے پہلے آواز بلند کی تھی، اور جو اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بہت سے مسلم ممبران اور قانون دانوں سے زیادہ حاوی تھے) سنتے ہی یہ کہا کہ یہ تو ہمارے حق میں مفید ہے، اور یہ تو اس دفعہ میں جس سے کبھی نہ کبھی سہارا لیا جاتا، بیڑی ڈال دینے کے مرادف ہے، اس کا قبول کرنا مفید ہے، پھر تھوڑی بحث تمحیص کے بعد تقریباً تمام ارکان نے اس سے اتفاق کیا، اور اس کا فیصلہ ہوگیا کہ اس کے مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ حکومت کے ذمہ داروں کو بتادیا گیا کہ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

اسی شب میں بعض فاضل ارکان بورڈ اور قانون داں ممبران پارلیمنٹ نے بل میں کچھ لفظی ترمیمات پیش کیں، میں نے اس کا اہم اور بنیادی حصہ ڈرافٹ اور ٹائپ کراکر اگلے روز راجیو جی کو خود پیش کیا، اور ان سے درخواست کی کہ اس کی روشنی میں بل کو اور زیادہ مکمل ومنضبط بنا کر پیش کیا جائے، معلوم ہوتا ہے کہ عجلت میں ایسا نہیں ہوسکا۔

بابری مسجد

یہاں یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ اس زمانہ میں بابری مسجد کا معاملہ سامنے آچکا تھا، میں نے اس ملاقات سے فائدہ اٹھا کر اخیر میں بابری مسجد کے معاملہ کی طرف

وزیراعظم کو توجہ دلائی، وزیراعظم نے شری این ڈی تیواری سے جو اس وقت مجلس میں موجود تھے، کہا کہ آپ دونوں حضرات کے ساتھ نوتہ دار صاحب سے مل کر بات کر لیجئے، ہم نے ان سے ملاقات کی ان کے حوالہ ایک بیان کیا، اور کہا کہ یہ بیان من جانب حکومت ہند فوراً شائع ہونا چاہیئے اور یہ کہا کہ حقیّت اور ملکیت کا فیصلہ تو کورٹ سے ہوگا، بلا تاخیر حکومت کی طرف سے یہ اعلان کر دیا جائے کہ عبادت گاہیں اپنی اصلی شکل میں رہیں گی کسی دوسرے فرقہ کو زبردستی ان میں کسی قسم کی تبدیلی لانے کی اجازت نہیں دی جائیگی، مگر افسوس ہے کہ یہ اعلان جو اس وقت بہت سے فتنوں کا سدِّباب ہو سکتا تھا نہیں کیا گیا۔

مسٹر راجیو کے بِل کی حمایت میں بیانات

۲۸ رفروری ۱۹۸۶ء کو وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی نے پارلیمنٹ میں کانگریس (ا) پارٹی کی ایک میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے جو مطلقہ مسلم خواتین کے حقوق کے تحفظ سے متعلق پارلیمنٹ میں پیش ہونے والے بِل پر بحث کے لئے طلب کی تھی، کہا کہ لوک سبھا میں جو بِل لایا گیا ہے' اس کا دائرہ زیادہ وسیع ہے' وہ مطلقہ مسلم خواتین کے لئے زیادہ تحفظ مہیا کرتا ہے' اور خاصے فائدے پہونچاتا ہے۔

وزیراعظم نے جلسہ میں یکساں سول کوڈ کی اہمیت بتائی مگر کہا کہ حکومت عوام پر یکساں سول کوڈ تھوپ نہیں سکتی' اور پھر ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔

پریس کو جلسہ کی کارروائی سے باخبر کرتے ہوئے کانگریس (آئی) پارلیمانی پارٹی کے

سکریٹری مسٹر کے کے تیواری نے بتایا کہ وزیر اعظم نے کہا ہے کہ ضابطۂ فوجداری کی دفعات ۱۲۵ ـ ۱۲۷ کے برخلاف نئے بل کی روشنی میں مسلم خواتین سے متعلق طلاق کے مقدمات کے فیصلے صرف ۳۰ دنوں کے اندر ہو جایا کریں گے، اور اب ایک مسلم مطلقہ کو پوری امداد ملے گی، جبکہ اس سے قبل ان دونوں دفعات کے تحت جو امداد دی جاتی ہے، وہ عارضی نوعیت کی تھی، جب تک مسلم پرسنل لا سے متعلق مختلف ادارے فیصلہ نہ کریں اور اس مرحلہ میں کافی تاخیر ہوتی تھی۔

وزیر اعظم نے مزید کہا کہ سابقہ ضوابط کے برخلاف اس بل کا تمام مطلقہ مسلم خواتین پر اطلاق ہوگا، اور کسی بھی حالت میں ان کے حقوق کو سلب نہ کرے گا، نئے اقدام سے انھیں پہلے سے زیادہ تحفظ مل سکے گا، اور خاص راحت بھی مل سکے گی۔[1]

مدراس کے پندرہ روزہ تامل اخبار "تغلق" کے ایڈیٹر چو رانہ سوامی کو جنوری ۱۹۸۶ء میں انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:۔

"اسلامی قانون ہمارے قانون سے بڑھ کر عورتوں کے حقوق و مفادات کا ضامن ہے، انھوں نے کہا کہ مسلم ماہرین قانون، دانشوروں، علماء اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے تبادلۂ خیال کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مسلم پرسنل لا کے حدود میں رہتے ہوئے عورتوں کے حقوق کی کافی ضمانت دی جاسکتی ہے، انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کا احساس ہے کہ عدالتیں مسلم پرسنل لا کی غلط تعبیر و تشریح کر رہی ہیں، اگر عدالتیں اسلامی قانون کی صحیح تشریح کریں تو انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"[2]

---

[1] اخبار "قومی آواز" لکھنؤ یکم مارچ ۱۹۸۶ء [2] بحوالہ سہ روزہ "دعوت" دہلی ۲۵ جنوری ۱۹۸۶ء

بِل کی پارلیمنٹ سے منظوری

بِل کے پارلیمنٹ میں پیش ہونے کا وقت جتنا قریب آتا جا رہا تھا، انگریزی، ہندی پریس اور فرقہ پرست ہندو جماعتوں کی طرف سے مخالفت کا طوفان شدت اختیار کرتا جا رہا تھا معلوم ہو رہا تھا کہ ہندوستان میں ایک زلزلہ آیا ہوا ہے لیکن وزیر اعظم ہند راجیو جی نے طے کر رکھا تھا کہ اس بل کو پاس ہونا ہے، ۲۷ فروری کو انھوں نے اعلان کیا کہ یہ بِل پارلیمنٹ میں ضرور پیش ہوگا اور پاس کیا جائیگا، انگریزی اخباروں میں ۲۸ کو یہ سرخیاں تھیں۔

GOVT. DETERMINED TO PASS MUSLIM WOMEN BILL. P. M.

وزیر اعظم نے وہپ جاری کر دیا کہ پارٹی کے ہر ممبر کو اس کی تائید کرنی ہے، مخالفت کی صورت میں وہ پارٹی سے نکال دیا جائیگا، اگر بلا عذر کوئی ممبر اُس دن شریک اجلاس نہیں ہوا تو وہ بھی خارج کر دیا جائیگا، ۵ مئی ۱۹۸۶ء کو یہ بِل پارلیمنٹ میں پیش ہوا، ۵ اور ۶ مئی کی درمیانی شب مسلمانوں کے لئے عجیب رات تھی، کتنے مسلمانوں نے رات جاگتے اور دعا کرتے ہوئے گذاری، گھروں میں دعائیں ہو رہی تھیں اور ختم پڑھے جا رہے تھے، اس لئے کہ یہ ملّت کے وقار کا مسئلہ اور اس سوال کا جواب تھا کہ مسلمان اپنے دین و شریعت پر آزادی سے عمل کرتے ہوئے اور اللہ اور رسول کی مرضی و حکم کے مطابق عائلی زندگی (جو مستقل عبادت اور ناقابل شمار عبادتوں کا مجموعہ اور سبب ہے) اور نکاح و طلاق اور تقسیم میراث کر سکیں گے یا نہیں؟ راقم سطور اور مولانا منت اللہ صاحب بھی اس دن وہیں دہلی میں تھے، دہلی کے

ایک اخبار نے اجلاس کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے اس کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے، تاکہ اس ذہنیت کا کچھ اندازہ ہوسکے جو اس وقت عام طور پر پائی جاتی تھی :۔

"کانگریس نے اپنے تمام ممبران کے لئے اس بل کی حمایت میں ووٹ ڈالنے کا وہپ (حکم) جاری کر دیا تھا، اس لئے آج پارلیمنٹ میں کانگریسی ممبران کا غیر معمولی ہجوم تھا، اپوزیشن پارٹیوں کے ممبران بھی روزمرہ سے کہیں زیادہ تعداد میں نظر آرہے تھے، کیونکہ اس بل کی مخالفت ان کا عین ایمان تھا، خصوصی طور پر بنوائے گئے پاس کو دسیوں جگہ حفاظتی عملہ کو دکھا کر لوک سبھا کے اس عظیم ہال کی گیلری میں داخل ہوا جہاں ہندوستان کی تقدیر بنائی اور سنواری جاتی ہے۔

۱۲ بج کر ۳۵ منٹ پر وزیر قانون مسٹر اشوک سین جیسے ہی اس تاریخی بل کو پیش کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو اپوزیشن جماعتوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا، لوک سبھا کے اسپیکر جناب بلرام جاکھڑ اور اپوزیشن بالخصوص کمیونسٹ جماعتوں اور تلیگو دیشم کے ممبروں کے درمیان سوال وجواب کا ایسا میچ کھیلا جانے لگا جس میں اپوزیشن کے ہر اعتراض کو فاضل اسپیکر بڑی سختی کے ساتھ مسترد کر کے واپس ان کی طرف لوٹا دیتے تھے اپوزیشن مسلسل پوائینٹ آف آرڈر (پارلیمانی اعتراضات) اٹھاتی رہی اسپیکر صاحب اسے رد کرتے رہے، غرض اپوزیشن نے اس بل کو پیش ہونے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انجام کار انھیں اسپیکر کے حکم کے آگے تھک کر بیٹھ جانے کے لئے مجبور ہونا پڑا، اور وزیر قانون مسٹر سین نے

اپوزیشن کے "شرم شرم" کے نعروں کے درمیان بل کو ایوان کے سامنے مباحثہ کے لئے پیش کیا، انھوں نے اپنی تقریر میں اس بل کا پس منظر بیان کیا، اس بل کو پیش کرنے کی ضرورت پر روشنی ڈالی، انھوں نے کہا کہ حکومت ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے جذبات و احساسات کو نظر انداز نہیں کر سکتی، چند مسلم ممالک کے سوا بقیہ تمام مسلم ممالک میں اس سلسلہ میں جو قانون رائج ہے، موجودہ بل انھیں خطوط پر تشکیل دیا گیا ہے، مسٹر سین کا بل کا دفاع بہت عمدہ تھا، مگر جو چیز مجھے سب سے زیادہ اہم لگی وہ یہ کہ انھوں نے پارلیمنٹ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد ۱۴ کروڑ بتائی اور کہا کہ اتنے بڑے فرقہ کی رائے عامہ کو نظر انداز کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس سے قبل سرکاری طور پر مسلمانوں کی تعداد ہمیشہ دس ۱۰ یا گیارہ ۱۱ کروڑ بتائی جاتی رہی ہے۔

ٹھیک ایک گھنٹہ بعد ایوان کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی اور تیلگو دیشم کے پارٹی لیڈر ایچ۔ اے ڈورا کی تقریر سے بل پر مباحثہ کا آغاز ہوا، انھوں نے بل کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ یہ بل نہیں ہے، بلکہ بیل (BULL) یعنی بیل ہے جو مسلمان خواتین اور بچوں کو روند ڈالے گا، انھوں نے کہا کہ پاکستان اور انڈونیشیا وغیرہ میں نان نفقہ کے سلسلہ میں بہت تفصیلی اصلاحات کی گئی ہیں، ان کے خیال کے مطابق یہ بل نہ صرف مسلمان مطلّقہ کے حقوق میں مداخلت کر رہا ہے، بلکہ خود مسلم پرسنل لا میں مداخلت کر رہا ہے۔

کانگریس کے ایڈورڈ وفلیرو بل کی حمایت میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے انھوں نے کہاکہ اپوزیشن اس بل کے سلسلہ میں غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی شکار ہے، جس کی وجہ لاعلمی ہے انھوں نے وزیر اعظم راجیو گاندھی کو مبارکباد پیش کی کہ انھوں نے اس قدر پروگریسو بل ایوان میں پیش کرایا جب اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے مسٹر فلیرو نے یہ کہاکہ انھیں یقین ہے کہ آج کے مباحثہ کے خاتمہ کے وقت تک اپوزیشن والوں کے بند دماغ بھی کھُل جائیں گے اور وہ بھی بل کی حمایت پر آمادہ ہوجائیں گے تو آسام گن پریشید کے دنیش گو سوامی نے ان کی خوب خبر لی اور کہاکہ اپوزیشن کا دماغ تو پہلے سے ہی کھلا ہوا ہے البتہ کانگریسی اپنا دماغ کھولیں اس بات پر کانگریس پارٹی کے ممبر پروفیسر تیواری اور اپوزیشن کے درمیان زبردست نوک جھونک ہوئی۔

بعد میں پرفیسر تیواری بولنے کھڑے ہوئے اور انھوں نے بل کی حمایت کرتے ہوئے تمام اپوزیشن نام نہاد دانشوروں اور اخبارات پر الزام لگایا کہ ان سب نے بل کی مخالفت پر سمجھوتہ کرلیا ہے، انھوں نے کہاکہ اس ملی بھگت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انھوں نے اس سے قبل کبھی اس طرح ملک کے مختلف فرقوں کو فرقہ وارانہ خطوط پر اکٹھے ہوتے نہیں دیکھا، یہ صریحاً ملک کو عدم استحکام کی طرف ڈھکیلنے کی سازش ہے، جس تقریر کو سارے ایوان نے بڑی خاموشی اور توجہ کے ساتھ سنا وہ مسٹر بنت کی تقریر تھی، انھوں نے کہاکہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہم اس بل کو صحیح یا غلط سمجھتے ہیں بلکہ اہم بات

یہ ہے کہ مسلم فرقہ اس بل کو کس نظر سے دیکھتا ہے، ہمیں سوچ سمجھ کر چلنا چاہیئے، مسلم پرسنل لا کا تعلق ان کے مذہب سے ہے، ہمیں یہ چیز اس نظریہ سے دیکھنی ہوگی، ہم نے اس ملک میں سکولرزم اور جمہوریت کو اپنایا ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام اقلیتوں میں اس بات کا احساس قائم رہے کہ وہ اپنے طرزِ حیات کے مطابق یہاں زندگی بسر کر سکتے ہیں، کسی بھی فرقہ میں اصلاحات کی آواز اس کے اندر سے اُٹھنی چاہیئے، ہندو سماج نے اپنے اندر بہت سی اصلاحات کی ہیں، ہم تمام سماجوں سے اس بات کی توقع کرتے ہیں، لیکن یہ سب خود ان کی طرف سے اور رضاکارانہ بنیاد پر ہونا چاہیئے۔

گیارہ گھنٹے کی اس طویل گرما گرم بحث کے بعد بل رائے شماری کے لئے پیش ہوا اور اکثریت سے پاس ہوا۔

کانگریس پارٹی میں تو وہپ جاری ہونے کے بعد بل کی مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، البتہ نیشنل کانفرنس کے سیف الدین سوز نے جب عارف محمد خاں[1] کا نام لے کر اس بل کے سلسلہ میں ان کے نظریہ کو چیلنج کیا تو عارف محمد خاں ضبط نہ کر سکے، اور انھوں نے تقریر کے دوران ہی اُٹھ کر اعلان کیا کہ وہ آج بھی اس بل کے خلاف ہیں، اور اسے غیر اسلامی سمجھتے ہیں، مگر چونکہ پارٹی کا حکم ہے اس لئے وہ اپنا ووٹ بل کی حمایت ہی میں دیں گے۔

---

[1] موصوف بل کی مخالفت کی بنا پر وزیر اعظم کے اشارہ و رضامندی سے وزارت سے مستعفی ہو گئے تھے۔

رات کو ۱۲ بجے وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی نے لوک سبھا میں آکر اپنی سیٹ سنبھالی، ان کی آمد سے قبل ہی لوک سبھا پوری طرح بھر چکی تھی، ان کے آتے ہی ایوان میں برقی رَو دوڑ گئی، ہر شخص بڑا مستعد نظر آنے لگا، آخر میں وزیر قانون مسٹر اشوک سین ایک بار پھر کھڑے ہو گئے، اور اس بحث کا جواب دینے اور اسے اختتام کی سمت لے جانے کے لئے سرکاری نقطۂ نظر پیش کیا جس کے بعد صرف ووٹنگ کا مرحلہ طے ہونا تھا، مسٹر سین نے اختتامیہ طور پر کہا کہ اس بل کا پیش ہونا سکولرزم کے نقطۂ نظر سے بہت ضروری ہے کیونکہ سکولرزم کی تشریح ہی مختلف مذاہب اور مختلف کلچروں کے وجود کا اعتراف ہے۔

رات گزرتی جا رہی تھی، اپوزیشن کے حملوں میں شدت آگئی تھی، ایک یا دو بجے بل میں ترمیمات پیش ہونی شروع ہوئیں اور ووٹنگ کے بعد مسترد ہوتی رہیں، صرف ایک سرکاری ترمیم منظور کی گئی جس کے تحت اگر دونوں فریقین یہ چاہیں کہ ان کا فیصلہ سیکشن ۱۲۵ کے تحت ہو تو وہ تحریری طور پر مجسٹریٹ کو دے کر اس بل سے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں، اپوزیشن نے کئی ترمیمات پیش کی تھیں جن کا مقصد یہ تھا کہ یا تو اس بل کو غور و فکر کے لئے پارلیمنٹ کی جوائنٹ کمیٹی کے حوالہ کر دیا جائے، یا پھر اس پر عوام کی رائے جاننے کے لئے ان کی عوامی تشہیر کی جائے، مگر ان ترمیمات کو جن کا واحد مقصد بل کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا تھا، مسترد کر دیا گیا۔

رات پونے تین ۳ بجے بِل پر ووٹنگ عمل میں آئی اور بِل کی مخالفت میں آنے والے ۵۴ ووٹوں کے مقابلہ میں بِل کی حمایت میں ۳۷۲ ووٹ آئے، بِل کی کامیابی پر نہکتے ہوئے کانگریسی ممبران پارلیمنٹ نے اپنی خوشی کا اظہار کیا، دوسری طرف اپوزیشن کے بِل مخالف ممبران تھکے تھکائے ہال سے باہر جارہے تھے"[1]

اس سلسلہ میں ناسپاسی ہوگی اگر میں ان خاص شخصیتوں کا نام نہ لوں، جنھوں نے پارلیمنٹ کے اندر اور پارلیمنٹ سے باہر پوری طاقت اور لیاقت کے ساتھ مسئلہ کی وکالت اور مسلمانوں کے جذبات کی نمائندگی کی، ان میں ارکانِ حکومت میں سے جناب ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب اور ممبران پارلیمنٹ میں سے جناب محمود بنات والا صاحب خاص طور پر ملّت کے شکریہ کے مستحق ہیں، بنات والا صاحب نے اپنے بِل پر اصرار نہ کرنے اور بورڈ کا ساتھ دینے کے ذریعہ قابلِ تعریف ایثار کا مظاہرہ کیا، خواتین میں سے محترمہ نجمہ ہبۃ اللہ صاحبہ اور بیگم فخر الدین علی احمد صاحبہ اور بعض دوسری اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین نے اپنی دینی حمیّت اور اسلامی مسائل سے دلچسپی کا ثبوت دیا، اور اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ صرف مردوں کا طبقہ ہی اس جدوجہد میں شریک اور اسلام کے عائلی قانون سے مطمئن نہیں، بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بھی اسلامی قانون سے مسرور و مطمئن اور اس کی برتری و بہتری کی قائل ہیں، اس سلسلہ میں ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے دہلی کے میزبان حافظ کرامت اللہ صاحب اور ان کے صاحبزادہ سلامت اللہ صاحب

---

[1] ہفتہ وار "اخبارِ نو" دہلی (باختصار) ۱۶ – ۲۲ مئی ۱۹۸۶ء

کا شکریہ نہ ادا کروں جن کی وجہ سے ——— ذمہ دارانِ حکومت سے رابطہ قائم کرنے میں بیش قیمت مدد ملی اور قیام و مواصلات میں بڑی سہولت حاصل ہوئی۔

ہندوستان میں عام طور پر اس پر مسلمانوں کے حلقے میں خوشی منائی گئی، اور اس کو مسلمانوں کے اتحاد، اپنے قائدین پر اعتماد، تعمیری و مثبت طرزِ عمل، آزادانہ اظہارِ خیال لیکن اس کے ساتھ افہام و تفہیم کی کوششوں کی کامیابی کا ایک نشانِ عظیم سمجھا گیا، "وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرِ اللَّهِ" کا ایک ظہور ہوا۔

راجیو جی کے نام ایک اہم خط

میں نے مناسب سمجھا کہ مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں راجیو جی سے جو بے تکلف ملاقاتیں ہوئیں، انھوں نے جس طرح اس مسئلہ سے دل چسپی لی اور عزم و ہمت اور اخلاقی جرأت کے ساتھ وہ اس کی حمایت پر ثابت قدم رہے اور بالآخر اس کو پارلیمنٹ سے پاس کروایا، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ایسے مسلمان کی حیثیت سے جس میں شکر گزاری کا مادّہ اور اعتراف بالحق کا جذبہ ہے شکریہ اور اعتراف کا ایک خط لکھوں جس میں ان کو ایک حقیقت پسند، بے غرض انسان، سچے محبِ وطن ہندوستانی اور ایک داعی اور عالمِ دین کی حیثیت سے اس ملک کی قیادت و رہنمائی اور انتظامیہ کے سلسلہ میں مخلصانہ مشورے دوں جس پر اس ملک کی بقا و سالمیت کا انحصار ہے، اور جس میں ان کی سیاسی بازی گروں اور "صد باراں دیدہ" رہنماؤں اور قیادت و حکومت کی چاٹ رکھنے والے

لیڈروں کی موجودگی میں ان کی کامیابی کا راز اور ان کی انفرادیت اور تفوق کا واحد راستہ ہے، میں نے یہ خط غالباً جون یا جولائی ۱۹۸۶ء میں لکھا، اور وہ ان کو پہونچا، اور انھوں نے پڑھا، ایک اہم تاریخی دستاویز اور آئندہ کے ذمہ دارانِ حکومت کے فائدے کے لئے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مائی ڈیر راجیو جی!

آداب و تسلیمات

مسلم مطلقہ بل کی منظوری پر اپنے جذبہ شکریہ، اعتراف کا اظہار کرنے کے ساتھ اور کچھ اس سے زائد میں (اس رابطہ و اعتماد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو اس سلسلہ کی ملاقاتوں کے ذریعہ پیدا ہوا) آپ سے اپنے اس یقین، مطالعہ اور عقیدہ کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ملک کی قیادت بلکہ اس کی حفاظت کا راستہ حقیقت پسندی واقعات و حقائق کو تسلیم کرنے، اصول پسندی اور اخلاقی جرأت، وسیع النظری اور فراخ دلی میں منحصر ہے، اور یہ وہی راستہ ہے جو ہندوستان کی تحریک آزادی کے قائدین اور ملک کے صفِ اول کے رہنماؤں نے دکھایا تھا، اور اس پر چل کر ملک کو آزاد کرایا تھا، اس ملک کے لئے جس کے لئے شروع سے مختلف مذاہب، تہذیبوں، زبانوں اور ثقافتوں کا مرکز ہونا مقدر ہو چکا ہے، صحیح جمہوریت، سکولرزم، ہر ایک کا احترام اور اس کو ترقی کرنے اور ملک کی تعمیر و ترقی میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لینے کا موقعہ دینا ہی صحیح طریق عمل ہے، تعصب، تشدد (VIOLENCE) تنگ نظری، جذباتیت، اور سوئی ہوئی تاریخ کو جگانا، سوئے ہوئے شیر کے جگانے کے مرادف ہے جو کسی پر

رحم نہیں کھائیگا۔

اس ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ تشدّد کا وہ رجحان ہے جو ادھر چند برسوں (اور چند مہینوں سے خاص طور پر) ابھر کر سامنے آگیا ہے، اور جس کے گاندھی جی سخت مخالف تھے، اور اس سے شدید خطرہ محسوس کرتے تھے، اس لئے کہ آگ کو جب باہر کی کوئی چیز کھانے کو نہیں ملتی تو وہ اپنے کو کھانے لگتی ہے، فرقہ وارانہ منافرت اور تشدّد، فرقوں سے آگے بڑھ کر ذاتوں، طبقوں اور پھر خاندانوں اور افراد تک منتقل ہو جائیگا اور پھر ملک کو تباہی سے کوئی بچا نہیں سکتا۔

میں آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا کہ وہ ملک و قوم کی ملکیت ہے، مگر آپ سے بے تکلفی اور خلوص سے کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس وقت آپ کو ملک کے لئے ضروری سمجھتا ہوں، اس لئے خلوص کے ساتھ آپ کی عمر و صحت کے لئے دعا بھی کرتا ہوں، اور بے لاگ مشورہ بھی دیتا ہوں کہ لیڈر شپ کی اس ریس اور سیاسی جوڑ توڑ کے اس اکھاڑہ میں آپ کی خصوصیت جس سے آپ اس سب پر فتح پا سکتے ہیں، اور اہلِ ملک کا دل جیت سکتے ہیں وہ آپ کا خلوص، سچائی، اخلاقی جرءت اور سادگی اور عملیت ہے جس کی ان سیاسی بازیگروں کے ہاں صرف کمی نہیں فقدان ہے، مذہبی کتابیں اور تاریخ بتاتی ہے کہ آخر میں سچائی ہی کی جیت ہوتی ہے، اور سازشیں، ذہانتیں، خطابتیں اور شورش اس کے سامنے ناکام رہی ہیں، میرا مخلصانہ مشورہ اور استدعا ہے کہ آپ اسی راستہ پر چلتے رہیں، ملک اس وقت ایک ایسے بحران (CRISIS) اور ایسے خطرہ سے دوچار ہے، جس کی مثال پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی، اس وقت ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ

ظلم و تشدد، فرقہ وارانہ اور ذات برادری کا اونچ نیچ، اخلاقی و انتظامی انتشار (CORRUPTION) اور فرقہ وارانہ احیائیت (REVIVALISM) ہے، اس کے مقابلہ میں صف آرا بلکہ سربکف ہو کر کھڑے ہونے کی ضرورت ہے، اور میری واقفیت اور قدرت کے اشارے بتاتے ہیں کہ اس کے لئے موزوں ترین آدمی آپ ہی ہیں، پورے ملک میں کسی سیاسی پارٹی، کسی تنظیم اور کسی مکتبِ خیال میں کوئی آدمی اس کلیبر کا نظر نہیں آتا، آپ کو خدا نے ملک کا وسیع پیمانہ پر اعتماد اور عوام کی محبت کی دولت بھی عطا کی ہے، اور وزارت عظمیٰ اور کانگریس کی صدارت پر فائز کر کے اس کا قریبی موقعہ بھی دیا ہے، میری دردمندانہ استدعا ہے کہ آپ اس موقعہ سے پورا فائدہ اٹھائیں، اور تاریخ میں اپنے لئے جگہ اور دلوں میں اپنے لئے غیر محدود محبت و عظمت کے مالک بن جائیں۔ خدا آپ کی مدد کرے

ابوالحسن علی ندوی

مشترک عائلی قانون کا خطرہ

نفقۂ مطلقہ کے سلسلہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف عوامی جمہوری جنگ کامیاب ہوئی اور پارلیمنٹ نے وہ بل بھاری اکثریت سے پاس کر دیا جو اس فیصلہ کے اثر کو ختم کرتا ہے، اور اس طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لا کی جدوجہد ایک منزل پر کامیاب ہوئی۔

لیکن یہ جزوی و محدود کامیابی تھی، مسلمانوں کے سروں پر یونیفارم سول کوڈ کی تلوار اب بھی لٹک رہی ہے، اور اس کے نفاذ کے بعد یہ بل بھی غیر مفید و غیر مؤثر

ہو جائیگا، اور مسلم پرسنل لا میں مداخلت کے بیسیوں دروازے کھل جائیں گے، دستورِ ہند میں دفعہ ۴۴ کی شکل میں یکساں مدنی قانون (UNIFORM CIVIL CODE) کی دفعہ شامل کی گئی ہے، اور اس کو دستورِ ہند کے رہنما اصول (DIRECTIVE PRINCIPLES) کا درجہ دیا گیا، اس دستور کا متن حسب ذیل ہے:۔

"مملکت ہندوستان کے پورے قلمرو میں شہریوں کے لئے یکساں مدنی ضابطہ (UNIFORM CIVIL CODE) کے حصول کی سعی کرے گی۔"

جس وقت دستور کی ترتیب عمل میں آئی تھی، اس وقت مسلم زعماء کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ دستورِ ہند کے بنیادی حقوق (FUNDAMENTAL RIGHTS) کی دفعات کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو محفوظ کر دیا گیا ہے، اور بنیادی حقوق کی دفعات رہنما اصول سے زیادہ اہم ہیں لیکن دوربیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ جہاں تک مسلمانوں کے عائلی قوانین اور نظامِ معاشرت کا تعلق ہے (جو ان کے مذہب کا جزو لاینفک (INSEPARABLE PART) ہے) دستورِ ہند کے اس تار و پود میں ایک آتش گیر (EXPLOSIVE MATTER) مادّہ رکھ دیا گیا ہے، جو کسی وقت بھی کسی ادنی تحریک یا باہر کی گرم ہواؤں کے اثر سے آگ پکڑ سکتا ہے، اور ان مذہبی و قانونی تحفظات کو جلا کر فنا کر سکتا ہے، جن کی دستور نے ضمانت دی تھی، چنانچہ واقعات کی قدرتی رفتار، اور ان مختلف عوامل و محرکات (FACTORS) کے ماتحت جن کا تعلق مسلمانوں کے عائلی قانون (PERSONAL LAW) کی صحیح نوعیت اور اس کے ان کے مذہب سے تعلق اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے عقائد و جذبات اور نفسیات سے ناواقفیت، فکر و نظر کی سطحیت سے بھی ہے، اور ہندو احیائیت (HINDU REVIVALISM) کے جذبہ

اور سیاسی و انتخابی مصالح اور اکثریت کو خوش کرنے کے جذبہ سے بھی ہوسکتا ہے،
یہ خطرہ سامنے آگیا، اور ایک عرصہ کی خاموشی کے بعد ۱۹۷۲ء میں مختلف اسباب
ومحرکات کی بنا پر ہندوستان میں مختلف فرقوں کے عائلی قانون (PERSONAL LAW)
کی وحدت اور مسلم پرسنل لا کی اصلاح و ترمیم کی پھر ایک بار بلند آہنگی کے ساتھ آواز
بلند ہوئی، یہ آواز تھوڑے وقفوں کے ساتھ مختلف وقفوں میں مجلس
قانون ساز کے اندر اور مجلس قانون ساز کے باہر بلند ہوتی رہی، لیکن مختلف
سیاسی مصلحتوں سے اور مسلم رائے عامہ کی برہمی کے خوف سے (جس کا الیکشن پر بھی
اثر پڑنے کا خطرہ تھا) دبائی جاتی رہی، اور حکومت ہند نے کئی بار اپنے اعلیٰ ذمہ داروں
کی زبان سے اس کا اعلان کیا کہ ایسا کرنے کی اس کی کوئی نیت نہیں ہے، اور
جب تک متعلق فرقے خود اس خواہش کا اظہار اور اس کا مطالبہ نہ کریں اس کو
اس مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ خود ان فرقوں کے متعدد افراد پارلیمنٹ کے اندر اور
پارلیمنٹ کے باہر یہ آواز اٹھاتے رہے، اور بعض دوربیں نگاہوں نے یہ محسوس کیا کہ
یہ محض ان کے ضمیر کی آواز نہیں ہے، بلکہ ان کی زبان حال کہتی ہے کہ ؎

از پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت ہمہ می گویم

سطحی و عامیانہ خیال

یہ خیال کہ مشترک عائلی قانون کے نفاذ سے ملک کے مختلف فرقوں اور اقلیتوں

کے درمیان وحدت اور یکسانی پیدا ہوگی، اور ان میں محبت و اعتماد بڑھے گا، ایک نہایت سطحی اور عامیانہ خیال ہے، یورپ میں یکمل مذہبی، تہذیبی، اور عائلی قانون کی وحدت کے باوجود، دو، دو خوں آشام جنگیں ہو چکیں، جن کے شعلوں سے مشرق اور ایشیا کا دامن بھی نہیں بچ سکا، پہلی جنگ عظیم اصلاً وابتداءً برطانیہ اور جرمن کے درمیان ہوئی تھی، جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں، بلکہ پروٹسٹنٹ بھی ہیں، اور ان کا عائلی قانون اور معاشرہ تقریباً ایک ہے، پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اب اگر یونیفارم سول کوڈ جنگ کو روک سکتا ہے اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے، تو اس کو وہاں روکنا چاہیئے تھا، پھر دوسری جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ وہ دونوں ملک اس طرح سے لڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، آپ کسی دن عدالتوں میں بھی جاکر دیکھ آیئے کہ مسلمان مدعی ہے اور مسلمان ہی مدعا علیہ، مسلمان مسلمان کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے، ان دونوں کا عائلی قانون بھی ایک ہے، بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل، ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یہی حال ہندو فرقہ کا بھی ہے کہ اس میں بھی عائلی قانون (PERSONAL LAW) کی یکسانی اور اشتراک کے باوجود مقدمہ بازی، خانہ جنگی، اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا، درحقیقت اختلاف اور دشمنی کا تعلق نفسانیت اور دولت پرستی کے جنون اور حد سے بڑھی ہوئی مادیت سے ہے، اس غلط نظام و نصاب تعلیم سے ہے جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کر دیا، اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے۔[۱]

---

[۱] ماخوذ از خطبۂ صدارت بمبئی منعقدہ ۱۵، ۱۶ر دسمبر ۱۹۸۶ء

حقیقت جو کچھ بھی ہو اتنا اندازہ ہو گیا کہ ملک کے قانون سازوں اور اربابِ اختیار کے ذہن اس معاملہ میں صاف نہیں ہیں، اور کسی وقت بھی خاکستر کے نیچے کی یہ چنگاریاں شعلہ بن کر بھڑک سکتی ہیں۔

جمہوری ملک میں حقوق کی حفاظت کا طریقہ

ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم ایسے ملک میں ہیں جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، وہ جمہوری ملک ہے، اور وہاں قانون ساز مجلسیں قانون بناتی ہیں، جب یہ ملک جمہوری ہے تو پارلیمنٹ ہی قانون بنائے گی، اور جمہوریت کا یہ قاعدہ ہے کہ اکثریت کی رائے اور تائید سے قانون بنتا ہے، اس لئے ہر وقت اس کا خطرہ ہے کہ ایسے قوانین بنیں جو ہمارے بنیادی عقائد، مسلّمات، ہمارے جذبات اور ہماری ضرورتوں کے خلاف (بدنیتی سے کم اور ناواقفیت سے زیادہ) بنیں، یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ وہاں مذہبی، تہذیبی اور لسانی بنیادوں پر جارحانہ احیائیت (AGGRESSIVE REVIVALISM) اور کلّیت پسندی (TOTALITARIANISM) کی تحریکیں بھی زور شور سے چل رہی ہیں، اب ہمارا کام یہ ہے کہ ایسے سیکولر اور جمہوری ملک میں اپنے ملّی تشخّص کی حفاظت آئینی طریقہ پر کریں، ہم ہندوستان کے وفادار، مفید، کارآمد اور اس کے ضروری جزء ہونے کی حیثیت سے اپنی افادیت واہمیت ثابت کریں، اور مطالبہ کریں کہ کوئی قانون ہماری شریعت، آسمانی کتاب اور ہمارے عقائد کے خلاف نہیں بننا چاہئے، اسی کے ساتھ یہ بھی ثابت کریں کہ خلاف شریعت

قانون بننے سے ہم کو اس سے زیادہ اذیت ہوتی ہے اور ہمارا ملی وجود اس سے زیادہ خطرہ میں پڑ جاتا ہے، جتنا کھانا روکنے سے، کوئی جمہوری حکومت، کسی اقلیت اور کسی فرقہ کی غذائی ضرورتوں کو نہیں روک سکتی، کوئی حکومت چاہے کتنی ہی طاقتور ہو، یہ قانون نہیں بنا سکتی کہ فلاں فرقہ کو غلہ کی فراہمی روک دی جائے، یا بازار میں اس کو دکان کھولنے کی اجازت نہ دی جائے، یا اس کے بچوں پر تعلیم اور تعلیم گاہوں کے دروازے بند کر دیئے جائیں، ایسا اگر ہونے لگے تو لوگ قیامت برپا کر سکتے ہیں، ہم ثابت کر دیں کہ اس قانون اور اس نئے نظامِ تعلیم سے ہم کو ایسی گھٹن ہو رہی ہے، جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر باہر رکھنے سے ہوتی ہے، ہمارے چہروں کے اتار چڑھاؤ، حرکات و سکنات سے معلوم ہو جائے کہ ہماری صحت اور توانائی اور کارکردگی پر اثر پڑ رہا ہے، اور یہ محسوس کر لیا جائے کہ یہ ایک مغموم قوم کے افراد ہیں، اس نئے قانون سے ان کا دم گھٹ رہا ہے، اور یہ ان کی آئندہ نسل کے قتل کے مرادف ہے۔

حقیقت میں ایک جمہوری ملک میں جو اکثریت کے ذریعہ (جس کے جذبات، خواہشات و مقاصد بدلتے رہتے ہیں) آئین سازی کا دائمی و کلی حق رکھتا ہے، کسی فرقہ و اقلیت کو (جو اپنا مستقل دین، عائلی قانون اور ملی تشخص رکھتی ہے، اور وہ اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے) کسی وقت بھی مطمئن ہو کر بیٹھنے اور حالات و حقائق سے آنکھیں بند کر لینے کی گنجائش نہیں، اس کے متعلق فاتح مصر عمرو بن العاص کی وہ آگاہی اور انتباہ بالکل حسبِ حال ہے، جو انھوں نے مصر کے فاتح و نئے حاکم عرب مسلمانوں کو دیا تھا۔ استم

فی رباط دائم" (تم مستقل محاذ جنگ پر ہو) تمھیں ہر وقت چوکنّا اور خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔

بابری مسجد

سپریم کورٹ کے فیصلہ اور نفقۂ مطلّقہ کے سلسلہ میں (جو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا اصلاً موضوع تھا) وزیر اعظم اور ان کے مشیرانِ کار سے ملاقاتوں کے درمیان بابری مسجد کے مسئلہ کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی رہی، راقم سطور نے دو مرتبہ بابری مسجد سے متعلق اپنی تجاویز اور مسئلہ کا حل راجیو جی کو معتبر ذریعہ اور ڈاک سے بھیجا، اور متعدد ملاقاتوں میں ان سے اس مسئلہ پر مستقل گفتگو کرنے کے لئے وقت مانگا لیکن کوئی نہ کوئی مانع پیش آتا رہا، مجھے یہ بھی خطرہ ہوا کہ اکثریت خاص طور پر ہندو ویشو پریشد اور اس کے پیدا کئے ہوئے جذبات، پھر اس خیال سے کہ یہ مسئلہ ایک ریاست کے انتظامیہ سے تعلق رکھتا ہے، اس میں وہ اس قوت فیصلہ، عزم اور ملک کے مفاد میں جرأت، مہم جوئی سے کام نہ لے سکے، جس سے انھوں نے مسلم مطلّقہ کے نفقہ کے سلسلہ میں پارلیمنٹ سے بل پاس کرانے میں لیا تھا، اور اس نے ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کے اعتماد کو (ایک حد تک) بحال کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مسئلہ پیچیدگی اختیار کرتا گیا، اس نے فضا میں اشتعال و اضطراب پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا، یہاں پر میں اپنا وہ بیان نقل کرتا ہوں جو اس سلسلہ میں پریس کو برائے اشاعت دیا گیا، یہ بیان فروری ۱۹۸۶ء کے تیسرے ہفتہ میں جاری کیا گیا تھا جب نفقۂ مطلّقہ

کے سلسلہ کی جدوجہد جاری تھی، راقم سطور اب بھی اس بیان کی روح سے متفق اور اس کا ترجمان ہے۔

"اجودھیا کی بابری مسجد کے سلسلہ میں یک طرفہ فیصلہ سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو غیر معمولی صدمہ ہوا ہے' ایسے حالات میں جبکہ مسلمانوں کے جذبات پرسنل لا کے مسئلہ پر مجروح ہیں' اور ان کی تمام تر جدوجہد اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھنے اور دینی شعائر کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے ہو رہی ہے' بابری مسجد پر پڑے ہوئے تالے کو کھول کر اسے دوسرے فرقہ کو پوجا اور درشن کی کھلی اجازت دینا، اور اس مسجد پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کا حکم دینا کسی طرح دانشمندانہ اقدام سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ اس اقدام سے خطرہ ہے کہ مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو جائیں' اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں کہ اس ملک پر صرف ایک فرقہ کی حکومت ہے' اور طاقت کے بل بوتے پر یک طرفہ فیصلہ کر کے دوسروں کے حقوق کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

بابری مسجد کے بارہ میں یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وہ مسلمانوں کی ملکیت اور ان کی مسجد ہے جس میں وہ ساڑھے چار سو (۴۵۰) سال سے زائد سے نمازیں ادا کرتے رہے ہیں' مسلمانوں میں اس اقدام سے اشتعال کا ہونا فطری بات ہے' اور یہ ان کی دینی غیرت و حمیت کی دلیل ہے' البتہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ فرقہ پرست عناصر کے اشتعال انگیز نعروں سے متاثر نہ ہوں، اس سے حالات مزید بگڑ جائیں گے' انھیں چاہیئے کہ اپنی صفوں کو متحد رکھیں اور جس طرح انھوں نے مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں اپنے بے مثال اتحاد کا مظاہرہ کیا ہے' اسی طرح انھیں ان جیسے

نازک مسائل کے بارے میں اپنے اتحاد کے مظاہرہ کے ساتھ دانشمندانہ اور ٹھوس قدم اٹھانا چاہیئے اور حکومت وانتظامیہ کو وہ یہ باور کرا دیں کہ اقلیتوں پر ظلم وزیادتی اور خاص طور سے ان کی عبادت گاہوں پر قبضہ برداشت نہیں کیا جائیگا۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اگر حکومت نے مسلمانوں کے جذبات کا احترام نہ کیا اور بابری مسجد کے سلسلہ میں کئے گئے حالیہ اقدامات واپس نہ لئے تو اس کے نتائج بڑے سنگین اور خطرناک ہو سکتے ہیں۔

اس مسئلہ پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بھی اپنے حالیہ اجلاس دہلی میں ایک تجویز منظور کر کے اخبارات کو اشاعت کے لئے ارسال کی ہے"۔

چند اہم اجتماعات

اس سال کے اہم اجتماعات اور مصروفیات میں دینی تعلیمی کونسل کی چھٹی صوبائی کانفرنس قابلِ ذکر ہے جو ۲۲، ۲۳ نومبر ۱۹۸۶ء کو بنارس میں منعقد ہوئی، جس میں پانچ صوبوں کے مندوبین کے علاوہ ریاست اتر پردیش کے اضلاع سے آئے ہوئے علماء، دانشور، ماہرینِ تعلیم، سیاسی وسماجی کارکن، مرد وخواتین ہزاروں کی تعداد میں شریک تھے[۱]۔

دوسرا قابلِ ذکر اجتماع آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا آٹھواں اجلاس تھا، جو ۱۵ ردسمبر ۱۹۸۶ء کو ممبئی میں منعقد ہوا، اس میں پورے ہندوستان کے ارکان بورڈ قائدین وعمائدین اور ملی ودینی کارکن شریک تھے، راقم سطور کے خطبۂ صدارت میں

---

[۱] اس کا خطبۂ صدارت چھپا ہوا دفتر دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش لکھنؤ سے حاصل ہو سکتا ہے۔

(جوار دو اور انگریزی میں چھپ گیا ہے) پارلیمنٹ سے بل کے پاس ہونے کے بعد کے حالات کا جائزہ لیا گیا، اور مشترک عائلی قانون، یونیفارم سول کوڈ مجوزہ بحث و نفاذ کے خطرہ سے آگاہ اور اس کے محرکات اور پھر خطرات سے خبردار کیا گیا، پھر ملت کو ایک نئی اور طویل جد و جہد اور جمہوری و دستوری جنگ کے لئے آمادہ کیا گیا ہے جس کے مقابلہ میں نفقہ مطلقہ کے بارہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف عوامی تحریک و ہنگامہ اور اس کی کامیابی کی حیثیت جزوی اور محدود رہ جاتی ہے، اور ان دونوں کوششوں کا مقابلہ کرتے ہوئے قولِ ماثور کا اعادہ صحیح اور برمحل معلوم ہوتا ہے کہ "رجعنا من الجهاد الأصغر الى الجهاد الاكبر" یہ خطبۂ صدارت بعض حیثیتوں سے حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ اور ملت کے لئے ایک فکر انگیز اور ولولہ خیز پیغام ہے۔[1]

اسی کے ساتھ مسلم مطلقہ بل کے ضمن میں جو چند قانونی و لفظی خامیاں رہ گئی ہیں (جن کے بارہ میں ترمیمات کا مسودہ راقم سطور نے خود راجیوجی کو براہ راست پہونچایا تھا) ان کو دور کرنے نیز اس بل کو عدالتوں کے قانون کا ایک جزء بنانے اور اس کے مطابق فیصلہ کرانے کی جد و جہد کی ضرورت ہے، تاکہ فریق مخالف اور عدالتوں کو سپریم کورٹ کے منسوخ فیصلے کے مطابق مسلمان مطلقہ کو دوسری شادی تک یا حینِ حیات طلاق دینے والے شوہر سے نان و نفقہ اور گذارہ دلانے کا قانونی جواز حاصل نہ ہو، یہ بات سامنے آچکی ہے کہ بہت سی عدالتیں اب بھی پارلیمنٹ کے پاس کئے ہوئے بل سے "تجاہل عارفانہ" برتتی ہیں، اور سپریم کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں مطلقہ کو گذارہ دینے کا فیصلہ کرتی ہیں، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس سلسلہ میں ممتاز قانون داں ارکان کی مدد سے ترمیم و اصلاح اور قانونی چارہ جوئی کا مسودہ بھی تیار کروایا ہے، جو بورڈ کے پیش نظر اور اس کے پروگرام میں شامل ہے۔

---

[1] یہ خطبہ کیمپ آفس آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ لکھنؤ کی طرف سے شائع ہو گیا ہے۔

بابِ پنجم

استنبول (ترکی) میں رابطۂ ادبِ اسلامی کا جلسہ
کراچی کا چند روزہ قیام اور اس کی اہم تقریریں

ترکی میں رابطۂ ادب اسلامی کا جلسہ

رابطۂ ادب اسلامی کی مجلس عاملہ کا پہلا مشاورتی اجتماع ندوۃ العلماء لکھنؤ میں منعقد ہوا، اس میں اگلے جلسہ کے انعقاد کے لئے استنبول (ترکی) کا تعیّن ہوا، اور اس کی تاریخیں بھی متعیّن ہوگئیں، استنبول کے انتخاب میں دو مصلحتیں کارفرما تھیں، ایک ترکی کی اہمیت، اسلامی عظمت اور وہاں اسلامی بیداری کی نئی علامتیں دوسرے یہ کہ سعودی جامعات کے اساتذہ اور عرب ادباء وفضلاء پہلے گرما گزارنے کے لئے عام طور پر بیروت کا رُخ کیا کرتے تھے، لیکن نئے حالات نے بیروت کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہاں سکون واطمینان کے ساتھ تعطیلات کا زمانہ گزارا جائے اور علمی کام کیا جائے، ترکی کو دو خصوصیتیں حاصل تھیں، ایک حالات کا استقرار، دوسرے اسلامی فضا، ترکوں کا عربوں کا احترام، عام ارزانی، رابطۂ ادب کے اکثر عرب ارکان گرمیوں میں ترکی کا قصد رکھتے تھے، اور بعض وہاں پہلے سے مقیم تھے۔

ہم کو استنبول کے لئے وہ پرواز ملی جو کراچی ہوکر استنبول جاتی تھی، اور کراچی میں ایک شب اور دن کے چند گھنٹے عزیزوں سے ملنے کے لئے مل جاتے تھے ۱۹ر جون ۱۹۸۶ء

کو عزیزی محمد رابع سلمہ کی معیت میں دہلی سے روانہ ہوکر ۲۰ رجون کی دوپہر کو استنبول پہونچنا ہوا، یہ جمعہ کا دن تھا، اور وہاں پہونچنے کا وقت عین جمعہ کی نماز کا وقت تھا، پھر بھی ایرپورٹ پر متعدد عرب و ترک دوست (جمعہ کی نماز سے فارغ ہوکر) عجلت کے ساتھ آگئے، ان میں متعدد ارکان مجلس عاملہ، اور ایک ترک فاضل اور قدیم دوست شیخ امین سراج (خطیب مسجد فاتح) تھے، جن سے ۱۹۵۱ء کے زمانۂ قیام مصر میں گہرے روابط پیدا ہوگئے تھے، وہ اس وقت جامع ازہر میں پڑھتے تھے، قیام کے لئے ترک اور عرب میزبانوں نے ایک عمارت کے کشادہ فلیٹ کا جس کے ساتھ ضروری کمرے بھی تھے، اور جلسوں کی نشست کی بھی آسانی تھی، انتخاب کیا تھا، یہ فلیٹ محلہ فندی زادہ کی گلستان نامی عمارت میں واقع ہے، میزبانی کے لئے ایک عرب فاضل ڈاکٹر مصطفےٰ جو استنبول کے میڈیکل کالج میں M.D کر رہے تھے، مقرر ہوئے۔

شنبہ کی صبح دس بجے سے رابطۂ ادب اسلامی کی نشست افتتاحی اور صدارتی تقریر کے بعد صدر دفتر لکھنؤ اور بلاد عربیہ کے دفتر کی طرف سے اسلامی ادب کے سلسلہ میں کارگزاری کی رپورٹیں پیش ہوئیں، مختلف تجاویز پر غور کیا گیا، نشست دوپہر تک جاری رہی پھر دوسرے روز کے لئے ملتوی ہوگئی۔

شام کو شیخ امین سراج استنبول کے ایک اسلامی الفکر اور ذی علم تاجر عثمان نوری آفندی کے مکان پر لے گئے، یہاں اسلامی ادباء کی ایک نشست تھی، اس مجلس میں مشہور عرب اہل قلم و مفکر محمد قطب (برادر حقیقی سید قطب شہید) بھی موجود تھے، انھوں نے اور متعدد عرب ادباء نے مضامین پڑھے۔

میں نے اپنی تقریر میں ترکی کے اسلامی ادب میں انقلابی اور قائدانہ کردار

ادا کرنے کے سلسلہ میں مولانا جلال الدین رومی کا تذکرہ کیا کہ ان کی مثنوی کا اثر نہ صرف شعر و ادب، بلکہ فکر اسلامی اور علم کلام پر اتنے طویل عرصہ تک باقی رہا جس کی مثال کسی دوسرے ادیب و شاعر کے یہاں نہیں ملتی، کتنے فلسفی الفکر اور ملحد و آزاد خیال ادباء و شعراء ان کی وجہ سے ازسرِ نو اسلام پر ایمان لائے، بلکہ اس کے داعی اور ترجمان بن گئے، آخری دور میں عالم اسلام کے سب سے بڑے شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنے کو ان کا خوشہ چین اور زلّہ رُبا سمجھتے تھے، وہ کہتے ہیں ؎

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

وہ جا بجا ان کا حوالہ دیتے ہیں، ایک اردو شعر میں کہتے ہیں ؎

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبُو میں ہے جیحون

ترکی اب بھی ایسے لوگ پیدا کر سکتا ہے، کسی نے عالم اسلام کی اتنی طویل مدّت تک حفاظت و نمائندگی نہیں کی جتنی ترکوں نے کی، اس کو اب بھی قیادت کے لئے سامنے آنا چاہیئے۔

بعض ترک ادباء نے شکایت کی کہ ہم ترک دوسری زبانوں کا لٹریچر اپنی زبان میں منتقل کرتے ہیں، لیکن دوسری زبان کے لوگ ترک ادباء کا لٹریچر اپنی زبانوں میں منتقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے، اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا اور اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت پر اتفاق کیا گیا، اس مجلس میں معلوم ہوا کہ اس وقت ترکی میں اسلام کے جاننے، اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ طاقت پکڑتا جا رہا ہے، اسلامی الفکر

مصنفین کی کتابیں تیزی کے ساتھ ترکی زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہو رہی ہیں، اور شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں، خود راقم سطور کی اکثر اہم کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، میری کتاب "دستورِ حیات" کے بارہ میں جو عربی میں "العقیدۃ والعبادۃ والسلوك" کے نام سے ہے معلوم ہوا کہ اس کا پہلا ایڈیشن پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوا تھا، اور ایک ماہ میں ختم ہو گیا بعض کتابوں کا دو مختلف مترجمین نے ترجمہ کیا، ایک کو دوسرے کا علم نہ تھا، استاد محمد قطب نے کہا کہ بعض اوقات میری تصنیف جو اصلاً عربی میں ہوتی ہے، عربی میں شائع ہونے سے قبل ترکی میں ترجمہ ہو کر شائع ہو جاتی ہے، معلوم ہوا کہ فوج اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی اسلام سے تعلق رکھنے والے افراد پیدا ہو گئے ہیں، اور اس کی وجہ سے اب حکومتِ وقت کو اس کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔

شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی نطق اعرابی

یکشنبہ کو ۱۰ ایجے ترک ادباء و اہلِ علم کی ایک وسیع نشست ایک وسیع ہال میں رکھی گئی تھی، اس نشست میں جو ادباء اور اہلِ علم شریک ہوئے، اندازہ ہے کہ ان کی تعداد ۵۔۶ سو سے کم نہیں تھی، اس میں صحافیوں، اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندے بھی شریک ہوئے، اس سے اندازہ ہوا کہ حکومت نے بھی اس اجتماع کی اہمیت محسوس کی اور اپنی سطح پر تعاون کیا، حکومت کے اس رویّہ کو اسلام پسند حضرات نے اسلامی ادب اور اسلامیت کی ایک کامیابی تصور کیا، راقم سطور نے اس نشست کے لئے "روائع اقبال" کا وہ حصہ پڑھنے کے لئے انتخاب کیا تھا جس میں ان کی

معرکۃ الآراء اور ولولہ انگیز نظم "طلوع اسلام" کا ترجمہ عربی[1] میں پیش کیا گیا تھا، اور جس کا محرک اور مرکزی مضمون مغربی طاقتوں کا ترکی کے خلاف صف آرا ہو جانا اور ترکی کا اس "اتحاد" کے خلاف اپنی اسلام سے وفاداری، شجاعت اور استقامت اور جذبۂ قربانی کا مظاہرہ کرنا تھا، میرے ایک طرف ایک ممتاز ترک ادیب و اہلِ قلم بیٹھے تھے، دوسری طرف مشہور عرب مصنّف اور اسلامی مفکّر محمد قطب رونق افروز تھے، میں جب اس شعر کے ترجمہ پر پہونچا کہ ؎

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

تو میں نے شکوہ ترکمانی کہتے ہوئے ترک ادیب کی طرف، اور نطق اعرابی کہتے ہوئے محمد قطب کی طرف اشارہ کیا اور ذہن ہندی کہتے ہوئے یہ عرض کیا کہ میں خود نہیں لیکن اس قوم کا نمائندہ ہوں جس کو خدا نے خاص ذہن سے نوازا اور اس نے اس سے اسلام کی خدمت کا کام لیا، اس عربی مضمون کا ترکی ترجمہ تیار تھا وہ پڑھ کر سنایا گیا۔

اس مجلس میں رابطہ کے ایک ذمہ دار اور رکن انتظامی شیخ محمد حسن بریغش نے رابطۂ ادب کے قیام اور مقاصد کا تعارف کرایا، ان کے خطاب کے ترجمہ کے بعد استاد محمد قطب نے تقریر کی، جلسہ میں دو ترک فاضلوں نے بھی ترکی زبان میں خطاب کیا، ان میں سے ایک مقرر ترک فاضل عزت ازود نے اپنا خطاب اس مؤثر جملہ سے شروع کیا کہ آج سے کچھ عرصہ قبل میں نے اپنا خطاب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا تھا، تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا، لیکن آج کی صورت حال

---

[1] یہ ترجمہ عزیزی مولوی سید سلمان ندوی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء کے قلم سے ہے۔

بالکل مختلف ہے، اور میں اطمینان کے ساتھ اپنی تقریر بسم اللہ سے شروع کرتا ہوں،
ملک کے ذرائع ابلاغ نے اس جلسہ کی تشہیر کی، اور بعض ترک دوستوں نے بتایا کہ
پہلی مرتبہ حکومت نے ایک ایسے خالص اسلامی پروگرام اور جلسہ کو ریڈیو اور
ٹیلی ویژن کے ذریعہ نشر کرنے کی اجازت دی، اس طرح یہ جلسہ ملکا ور اسلامی
بیداری کے لئے فال نیک سمجھا گیا۔

حیات بعد الموت کی وسعت

سہ شنبہ سے جمعہ تک کے اوقات میں اس کی گنجائش تھی کہ ایک تفریحی اور
معلوماتی سفر کر لیا جائے، اس کے لئے ترکی کے ایک اہم قریبی شہر برصہ کا انتخاب
کیا گیا جو عثمانی حکمرانوں کا پہلا پایۂ تخت ہے، وہاں ان کے تعمیری آثار اب بھی
موجود ہیں، اور وہاں کی آبادی اپنی دینداری میں امتیاز رکھتی ہے اس سے قبل
سہ شنبہ کو آبنائے باس فورس کے ایشیائی کنارہ پر ایک نشست کا انتظام کیا گیا تھا
ہم لوگ دس بجے وہاں کے لئے روانہ ہوئے سواحل کی ایک سرسری سیر کے بعد
سلطان عبد العزیز کا مشہور تاریخی قصر دولمہ باغچہ دیکھا یہ سلاطین عثمانی کا آخری
مستقر رہا ہے، اب وہ ایک قیمتی اور اعلیٰ عجائب خانہ اور زیارت گاہ کی حیثیت
رکھتا ہے، اسی قصر میں منظمہ مؤتمر اسلامی قدس کراچی کے مبحث الابحاث میں
جانا ہوا، پھر ہم نے قصر یلدز دیکھا، جو آخری عثمانی خلیفہ سلطان عبد الحمید خاں کا
قصر تھا۔

وہاں کچھ وقت گذار کر ہم ابنائے باس فورس کے ایشیائی کنارہ تک روانہ ہوئے

ہم نے آبنائے باسفورس کو اس کے بلند و عظیم پل کے ذریعہ پار کیا، سمندر کے اسی ایشیائی کنارہ پر ایک جگہ رکے، وہاں ترک فضلا کی ایک تعداد موجود تھی، جن میں یونیورسٹی کے پروفیسران، سابق وزیر داخلہ، شہر کے چند ممتاز حضرات اور عرب فضلاء بھی تھے، حاضرین نے مجھ سے اور استاد محمد قطب سے خطاب کی فرمائش کی، استاد محمد قطب نے کہا کہ آج شیخ ہی خطاب کریں گے، اور میں صرف سنوں گا، میں نے اپنی تقریر اس طرح شروع کی کہ میں جب یہاں آ رہا تھا تو اچانک میرا خیال قرآن مجید کی اس آیت کی طرف چلا گیا:۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ	کیا تو نے اس شخص کو نہ دیکھا جس کا
وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا	گذر ایک شہر پر ہوا جو اپنی چھتوں پر
قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ	گر پڑا تھا، اس نے کہا کہ مرنے کے بعد
مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ	اللہ تعالیٰ اس کو کیسے زندہ کرے گا
عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ	پھر اللہ نے اس شخص کو سو سال
لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا	تک مردہ رکھا، پھر اٹھایا (اور اس سے)
أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَل لَّبِثْتَ	کہا کہ تو کتنی دیر یہاں رہا اس نے کہا کہ
مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ	ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم رہا،
طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ	اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تو سو
وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ	برس رہا، اب اپنا کھانا اور پینا
وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ	دیکھ (جو اب تک) سڑا نہیں ہے،
وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ	اور اپنے گدھے کو دیکھ، اور ہم نے

نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝
(البقرۃ۔ ۲۵۹)

تم کو لوگوں کے لئے نمونہ بنانا چاہا، اور ہڈیوں کو دیکھ کہ ہم ان کو کس طرح اُبھار کر جوڑ دیتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں، پھر جب اس پر یہ حال ظاہر ہوا تو کہہ اٹھا کہ مجھ کو معلوم ہے کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

میں نے کہا کہ میں قرآن مجید کا طالب علم ہوں، اور اس کے معانی و اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں، قرآن مجید کی آیات کے معانی و مضامین اس سے کہیں زیادہ گہرے اور وسیع ہیں جتنے کہ تفسیر کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں یا عام مطالعہ و غور سے سمجھ میں آتے ہیں، مذکورہ بالا آیت میں اگرچہ ایک معیّن واقعہ بتایا گیا ہے جس میں اللہ تعالٰے نے اپنی قدرت دکھائی کہ سو سال[1] ایک شخص کو مردہ رکھنے کے بعد حسب سابق زندہ اور تر و تازہ اٹھایا، اور یہ قدرت بھی دکھائی کہ کھانا چند گھنٹے ہی کھلی فضا میں رہنے پر خراب اور بگڑ جاتا ہے، سو سال[1] رکھا رہا اور خراب نہیں ہوا، میرے خیال میں اس واقعہ کے اندر ایک گہرا اشارہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالٰے اپنے دین و پیغام کو بھی کبھی سو سال[1] تک مردہ ہو جانے کے بعد اور اس قوم و ملک کے اس کے ساتھ ربط و تعلق اور حمیّت و حمایت کے طویل عرصہ تک کمزور ہو جانے کے بعد دوبارہ دونوں کو حیات و تازگی دے سکتا ہے، اور دنیا[1]

---

[1] بعض ترک دوستوں نے بتایا کہ ترکی میں اسلام کے لئے دورِ ابتلاء کی مدّت بھی ایک صدی کی مدّت کو پہونچ رہی ہے۔

جب کھانا ایسی معمولی چیز کو سُو سُو سال تک بغیر بگڑے قائم رکھ سکتا ہے تو اپنے دین کو سُو سُو سال کی ناسازگار حالات رکھنے والی مدت گذرنے پر بھی صحیح اور تر و تازہ رکھ سکتا ہے، میرے نزدیک قرآن مجید کی یہ آیت ہم کو یہ بشارت سناتی ہے کہ کہ وہ قوم اور ملک (جس نے مغرب کی چھاتی پر صدیوں کو دوں دلی اور اسلام کا جھنڈا بلند رکھا) پھر زندہ و تابندہ ہو جائیگا" تُولِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَتُولِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ"[1]

اندازہ ہے کہ یہ تقریر جو بالکل برجستہ اور اتفاقی تھی، دلچسپی اور توجہ سے سُنی گئی، اور اقبال کی یہ پیشین گوئی کانوں میں گونجنے لگی کہ ؎

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

بورصہ میں

چہار شنبہ ۱۵ ر کو ہم بورصہ کے لئے روانہ ہوئے، یہ شہر استنبول کے جنوب میں واقع ہے لیکن بحر مرمرہ کا ایک مشرقی کونہ دونوں شہروں کے درمیان ہونے کی وجہ سے برّی راستہ گھوم کر جاتا ہے، اس کی وجہ سے موٹر سے بورصہ کا سفر ۳-۴ گھنٹوں کا بن جاتا ہے، بتایا گیا کہ اگر اسٹیمر سے راستہ طے کیا جائے تو مختصر ہو جاتا ہے، عثمان نوری آفندی کی رائے ہوئی کہ جانے میں برّی راستہ سے سفر کیا جائے تاکہ راستے کے پہاڑ و ساحل کا مشاہدہ ہو سکے، اور واپسی میں اسٹیمر سے سفر کیا جائے، اس پر عمل کیا گیا۔

---

[1] آل عمران - ۲۷

بورصہ قریب آیا تو بڑا دل فریب منظر سامنے آیا، بہت دور تک شہر پھیلا ہوا تھا، جگہ جگہ مسجدوں کے مینارے نکیلی پنسلوں کے مانند نظر آئے، یہ ایک رومی شہر تھا جس کو عثمانی فرمانروا بانی سلطنت عثمانیہ سلطان عثمان خاں اول نے فتح کیا، یہ ایک فتح عظیم تھی، جب سلطان محمد فاتح نے استنبول فتح کیا تو پایۂ تخت بورصہ سے منتقل ہو کر استنبول چلا گیا، ہم لوگ ۱۲½ بجے بورصہ پہونچ گئے تھے، عصر کے بعد شہر اور پہاڑ کی سیر کی، پھر شہر کے مضافات دیکھے، بورصہ میں مدرسۃ الوعاظ والخطباء قائم ہے حفظ قرآن کے مدارس و مکاتب بھی اچھی تعداد میں ہیں، معلوم ہوا کہ ان مکاتب و مدارس میں (تنہا بورصہ میں) ایک ہزار طلبہ حفظ قرآن کر رہے ہیں، اس شہر میں بلغاری مجاہدین کی بڑی تعداد ہے، جو بلغاریہ کی اسلام دشمنی اور معنوی نسل کشی سے بھاگ کر یہاں پناہ گزیں ہیں، ہمارا قیام بھی ایک بلغاری دوست کے مکان پر تھا، ان بلغاری مہاجرین کے بارہ میں ہمارے تاثرات اور ہمدردی کو ہمارے بلغاری میزبان نے ٹیپ کر لیا، تاکہ وہ اپنے دوسرے ہم وطنوں کو سنا سکیں۔

اگلے دن صبح ۹ بجے استنبول واپسی کے لئے ہم لوگ بورصہ سے نکلے اور گھنٹہ بھر کے کار کے سفر کے بعد یلووا پہونچے، وہاں اسٹیمر تیار ملا، یہ سفر بہت خوشگوار اور تفریح کا باعث تھا، اسٹیمر ڈیڑھ گھنٹہ کے سفر کے بعد استنبول کے ساحل پر لگ گیا، اور ہم لوگ اپنی موٹر پر جو اسی جہاز پر تھی بیٹھ کر براہ راست سڑک پر آ گئے، شام کا پروگرام یوسف کاراجہ کے مکان پر تھا، جو کچھ عرصہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں رہ چکے ہیں، اور اردو سے واقف ہیں، انھوں نے متعدد اردو کتابوں کا ترکی میں ترجمہ بھی کیا ہے، اس کے بعد عرب طلبہ کے ایک نشست میں شرکت کا پروگرام طے تھا، اگرچہ بہت تاخیر

ہوگئی تھی، لیکن وہ سب فرط اشتیاق میں منتظر تھے، ان سے مختصر خطاب ہوا۔

کراچی کے ڈھائی دن

اگلے دن جمعہ کا دن واپسی کی تیاری کا دن تھا، پاکستان کے لئے ویزہ ملنے میں بڑا وقت صرف ہوا، جمعہ کی نماز مسجد فاتح میں پڑھنے کا پروگرام تھا، کھانا بھی تھا، اور ایک پریس کانفرنس میں شرکت بھی کرنی تھی، لیکن ویزہ کے حصول میں اتنی تاخیر ہوئی، جمعہ بھی سفارت خانہ کے قریب کی ایک مسجد میں پڑھنا پڑا کہ مسجد فاتح کا پروگرام رہ گیا، عشا کے تھوڑی دیر بعد ہوائی اڈہ روانگی ہوئی، جہاز کو اصلاً ڈھائی بجے شب میں روانہ ہونا تھا لیکن وہ لیٹ ہوا اور صبح ۴ بجے روانہ ہوسکا، دوپہر کے قریب کراچی پہونچنا ہوا، وہاں سے دہلی سے جوڑنے والی پرواز بروقت نہ ملنے کی وجہ سے ڈھائی دن کراچی ٹھہرنا پڑا[1]، اس کی مختصر روئیداد آئندہ سطروں میں آتی ہے۔

۲۸؍جون کو ظہر کے قریب کراچی پہونچنا ہوا، اور حسب معمول علامہ بنوری ٹاؤن کی جامع مسجد کے امام وخطیب عزیز گرامی قاری سید رشید الحسن کے یہاں ٹھہرنا ہوا، کراچی جیسے عظیم شہر کے لئے جس میں ہمارے خاندان کا تقریباً دو تہائی حصہ مقیم ہے اور بزرگوں، احباب اور دوستوں کی ایک بڑی تعداد اور اہم مدارس دینیہ اور دینی مرکزوں اور اداروں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے، ڈھائی تین دن

---

[1] ملخص از مقالہ "ترکی میں ایک ہفتہ" ۱-۲-۳ از قلم مولوی محمد رابع ندوی "تعمیر حیات" ۲۵؍جولائی ۱۹۸۶ء، ۱۰؍اگست ۱۹۸۶ء، ۲۵؍اگست ۱۹۸۶ء۔

کا قیام اپنے اور اہلِ تعلق کے لئے پیاس بجھانے والا نہیں، پیاس پیدا کرنے والا تھا، لیکن مجبوری تھی، اس مختصر مدت قیام میں بھی اسلام آباد سے بعض اہم ذمہ دار حضرات مخلص احباب اور کرم فرما ملنے کے لئے تشریف لے آئے، دو اہم تقریریں بھی ہوئیں، ان میں سے ایک وہ تھی، جو ۲۹ رجون کی شام کو کراچی میں فاران کلب کی جانب سے دیئے گئے عصرانہ کے موقعہ پر ہوٹل میٹروپول میں ہوئی، جلسہ کی صدارت کراچی کے میئر عبدالستار صاحب افغانی نے کی، دوسری وہ تقریر تھی، جو ۳۰ رجون ۱۹۸۶ء کو علامہ بنوری ٹاؤن کی وسیع اور عظیم مسجد میں بعد مغرب ہوئی۔

اسلامی معاشرہ کے لئے حقیقی خطرات

میٹروپول کی تقریر کا عنوان "اسلامی معاشرہ کو درپیش حقیقی خطرات اور اوران کا سدِ باب" تھا، یہ تقریر ان تاثرات و مشاہدات پر مبنی تھی جو پاکستان کے مختصر اور طویل قیام کے دوران بار بار سامنے آتے رہے، اور اس مرتبہ زیادہ وضاحت اور چونکا دینے والے انداز میں سامنے آئے، اتفاق (اور شاید تقدیری بات تھی) کہ اسی زمانہ میں بے نظیر بھٹو پاکستان آئی ہوئی تھیں، اور پاکستان کے تعلیم یافتہ اور سیاست دانوں اور اس طبقہ کی بڑی تعداد جو موجودہ حکومت کا شروع سے مخالف رہا ہے، یا اب غیر مطمئن ہے، ان کی آمد کا ایسا استقبال کر رہی تھی جیسے آسمان سے کوئی نجات دہندہ فرشتہ نازل ہوا ہے، اس بارہ میں وہ حجابات بھی اٹھ گئے تھے، جو شریعت یا تہذیب کے عائد کئے ہوئے ہیں، مقرر کی طبیعت پر جس کے فکر و دانش کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآن مجید اور دلچسپی و مطالعہ کا سب سے بڑا موضوع ادیان وملل

واخلاق، قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ، اور معاشرۂ انسانی کی نفسیات کا مطالعہ رہا ہے، اس سے دل پر بڑی چوٹ لگی، میں نے اسی کی روشنی میں ایک مؤثر اور مبسوط تقریر کی اور اس میں بتایا کہ قرآن مجید صحیح اسلامی معاشرہ کا معیار یہ پیش کرتا ہے کہ اس کے ضمیر و خمیر میں صالح اخلاق و اقدار کی محبت رچ بس گئی ہو، اور وہ اس کا مزاج بن گئی ہو، اس میں کوئی ایسی دعوت جس میں سرکشی، ہوا وہوس، انسانوں کے حقوق کی پامالی، انسانی طبیعت کو بے مہار چھوڑ دینے کی دعوت ہو، جس میں تفریح طبع یا نفس کی خواہشات و جذبات کی تسکین کے لئے بڑے سے بڑے ملی اور اجتماعی مفاد کو قربان کر دینے کی صلاحیت ہو، اس دعوت و تحریک سے یہ معاشرہ ابا و انکار کرتا ہو، اور اس کو اس سے ایسی نفرت ہو، جس کو اردو میں گھن آنا کہتے ہیں، اس سلسلہ میں میں نے قرآن مجید کی متعدد آیات پڑھیں اور ان کو حالات پر منطبق کیا، اور کہا کہ جس معاشرہ کا حال یہ ہو کہ کوئی سریلی صدا لگا دے، کوئی بازیگر آکر سبز باغ دکھائے، کوئی شخص بھی قیادت کا جھنڈا بلند کر دے تو اس کا ایسا استقبال کیا جائے کہ جیسے دیر سے اس کا انتظار تھا، اور یہی ایک خلا تھا، جو پُر نہیں ہوا تھا، وہ آواز لگائے تو یہ معلوم ہو کہ جیسے دل سینوں سے نکل پڑیں گے اور سارے حدود و قیود پیچھے رہ جائیں گے، سیدنا علی مرتضیٰ رضؓ نے اہلِ کوفہ کو مخاطب کر کے کہا تھا انتم اتباع کل ناعق "تم ہر آواز لگانے والے اور زور سے بولنے والے کے پیچھے لگ جاتے ہو" پھر میں نے بتایا کہ قرآن شریف میں عہد موسوی کا ایک بڑا عبرت انگیز قصہ آتا ہے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ — اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے

الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ○ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

(اعراف - ۱۳۸-۱۳۹)

پار اتار دیا پھر وہ ایسے لوگوں پر گذرے جو اپنے بتوں کو لئے بیٹھے تھے (اس پر بنی اسرائیل) کہنے لگے! اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایک دیوتا ایسا ہی بنا دیجئے جیسے ان کے (یہ) دیوتا ہیں (موسیٰ نے) کہا واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے، یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں یہ تباہ ہو کر رہے گا اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں، ہے بھی (بالکل) باطل۔

اس کا خلاصہ اور پس منظر یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو سمندر پار کر کے لئے جا رہے تھے، بنی اسرائیل نے دیکھا کہ ایک جگہ میلہ لگا ہوا ہے، دکانیں سجی ہوئی ہیں، ہر طبقہ کے لوگ موجود ہیں، معلوم ہوا کہ یہ سب جشن اس لئے ہے کہ وہاں کچھ بت رکھے ہوئے ہیں، اور ان کی عبادت ہو رہی ہے، تفریح بھی ہے اور عبادت بھی، اس رونق اور "بہار" کو دیکھ کر بنی اسرائیل کے منہ میں پانی بھر آیا اور بے اختیار ان کی زبان سے نکلا کہ موسیٰ جیسے ان لوگوں کے مجسّم اور چشم دید معبود ہیں ہمارے لئے بھی ایک ایسے ہی معبود کا انتظام کر دیجئے (جو ہمیں آنکھوں سے نظر آتا ہو اور ہم اس کے نام پر میلہ اور جشن کر سکیں) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس پر پیغمبرانہ جلال آیا، اور فرمایا کہ تم پرلے درجے کے جاہل اور ناقدرے ہو، یہ جس شغل میں مست ہیں، وہ برباد

ہونے والا ہے، اور جو کام یہ کرتے ہیں، وہ سب بیہودہ ہے۔

ہمارے لئے اس قصہ میں بڑی عبرت ہے، پھر میں نے ان دو چیزوں کا مثالاً ذکر کیا جو کسی معاشرہ و مملکت کے لئے بڑی خطرناک ہیں، ایک فکری انتشار، دوسرے معاشرہ میں دولت پیدا کرنے کی ریس اور اس کے مظاہر کی نمائش، میں نے عرض کیا کہ معاشرہ کی فلاح سے آپ کی فلاح وابستہ ہے، فرد کی فلاح معاشرہ کی فلاح کے بغیر ممکن نہیں ہے، قائدین، ناشرین، مصنّفین، مفکّرین، اور ابلاغ عامّہ کے ذرائع کو ان سب کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

نعمتوں پر شکر، اور ہوشمندانہ تقابل

بنّوری ٹاؤن کی جامع مسجد میں ایک تقریر ہوئی، وہ شُکر کے موضوع پر تھی، میں نے کہا کہ شُکر محض حمد و شکر کے الفاظ زبان سے ادا کر دینے کا نام نہیں، شکر مستقل ایک طرزِ عمل، زندگی کا ایک دائمی رویّہ اور ایک نفسیاتی کیفیت کا نام ہے، پھر میں نے اہلِ پاکستان بالخصوص ہندوستان سے آئے ہوئے بھائیوں کو توجہ دلائی کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے کن نعمتوں سے نوازا ہے، امن و امان، ایک خالص مسلم معاشرہ اور مسلم مملکت میں زندگی گذارنے اور اپنی صلاحیتوں کو کام میں لانے کا موقعہ دیا ہے، آپ میں سے کتنے لوگوں کو یہ یاد رہتا ہے کہ ہم کس حال میں تھے، یہاں آ کر اللہ نے ہمیں کہاں تک پہونچا دیا، ہمارا معیارِ زندگی کہاں سے کہاں تک پہونچ گیا، آپ کو دینی اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے، اور اپنے اسلامی وملّی تشخّص کے ساتھ زندگی گذارنے کی یہاں کیسی سہولت حاصل ہے، یہاں

آپ کتنی دشواریوں، نگرانیوں، بدگمانیوں، خوردہ گیریوں اور کسی دوسرے فرقہ یا اکثریت کے منافرت و مخالفت سے محفوظ ہیں، حدیث میں نسوانی فطرت کی یہ کمزوری بیان کی گئی ہے اس سے آپ کو دور رہنا چاہیئے، حدیث میں کہا گیا ہے کہ عورت کی فطری کمزوری یہ ہے کہ عمر بھر شوہر اس پر احسان کرے پھر کسی وقت اس کی کسی خواہش یا فرمائش کی تعمیل میں تھوڑی سی کمی رہ جائے تو کہے کہ ہم نے تو اس گھر میں آکر کبھی آرام کا منہ نہیں دیکھا، ہم نے اس گھر میں کبھی سکھ نہیں پایا، ھل من مزید کا نعرہ تو خیر ایک معنویت رکھتا ہے لیکن ھل من جدید کا نعرہ خطرناک ہے، جو بہت سے مسلم معاشروں اور آزاد مسلم حکومتوں کا شعار بن گیا ہے، پھر میں نے بتایا کہ کتنے مسلم و عرب ممالک میں اسلام اور دینداری، اسلامی قوانین کے نفاذ کے مطالبہ اور اسلامی تحریکوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جا رہا ہے، آپ کا طریقۂ فکر اور طرز عمل حقیقت پسندانہ، ایجابی و تعمیری ہونا چاہیئے، اپنے ملک کے حالات کا دوسرے ملکوں کے حالات سے تقابل کرنا چاہیئے پھر جو کچھ حاصل ہے، اس پر ثبات و دوام اور اس کی دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ مزید توفیق عطا فرمائے، جلد ہر چیز کا جواب مایوسی اور محاذ آرائی سے نہیں دینا چاہیئے، ذمہ دارانِ حکومت کے خلاف پہلے ہی لمحہ پر صف آرائی کے بجائے افہام و تفہیم سے کام لینا اور ان کو اس مسئلہ میں مطمئن کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے، پھر میں نے بتایا کہ ہندوستان جیسے سکولر اور جمہوری ملک میں، جس کی غالب اکثریت نہ صرف یہ کہ غیر مسلم ہے، بلکہ ایک خاص تاریخی مرحلہ (بلکہ مرحلوں) اور خاص حالات و واقعات سے گذرنے کے نتیجہ میں اس میں ایک خاص طرح کی حس بیدار ہوگئی،

جو خالی الذہن ہو کر حقیقت پسندانہ طریقہ پر اقلیت کے کسی مسئلہ احساس، یا مذہبی ضرورت کے سمجھنے میں بشدّت مانع ہے، پھر سارا انگریزی ہندی پریس مسلمانوں کے اس مسئلہ میں دانت پیس رہا تھا، ملک کے سب سے بڑے ذمہ دار (وزیر اعظم) کے ساتھ افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کرنے اور مسئلہ کو غیر سیاسی رنگ میں پیش کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ صرف اس مسئلہ سے مطمئن اور اس سے متفق ہوئے، بلکہ وہ اس کے علانیہ علمبردار، حامی اور وکیل بن گئے، اور انھوں نے اس کو پارلیمنٹ سے بھاری اکثریت کے ساتھ منظور کرا کے دم لیا[1]، کیا یہ بات ایک خالص مسلم ملک میں نہیں ہو سکتی؟

پھر میں نے بتایا کہ اصلاح و انقلاب کا سب سے کامیاب تجربہ وہ ہے، جو حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے اختیار کیا کہ انھوں نے (ایک یمنی عالم کے الفاظ میں) ایمان والوں کے خود کرسی اِقتدار پر پہونچنے پر اصرار نہیں کیا، اقتدار کے کرسی نشینوں تک ایمان پہونچانے، ان کو ایمانی و دینی دعوت اور سعی کا علمبردار بنانے، اور ان کے ہاتھوں سے وہ کام کرانے کا عزم کر لیا، جن کو وہ خود انجام دینا چاہتے تھے۔

ان دو تقریروں کے علاوہ دو اہم عربی مدارس اور مرکزوں اور چھوٹے اجتماعات میں بھی تقریریں ہوئیں، جن میں میں نے صفائی سے کہا کہ مدرسے اور دینی دعوتیں تاریخ سے نہیں چلتیں، تحریک سے چلتی ہیں، ہر وقت اسلاف و اکابر کا نام لینا اور ان پر فخر کرنا اور "پدرم سلطان بود" کا نعرہ لگانا سننے والوں کو بھی

---

[1] میرا اشارہ نفقۂ مطلقہ کے مسئلہ، اور ہندوستانی پارلیمنٹ کے مسلمان مطلقہ کے قانون سے ہے، جس کا تفصیل سے باب چہارم میں ذکر آچکا ہے۔

ملول ومتوحش کردیتا ہے، پھر میں نے لسانی علاقائی، اورنسلی عصبیت کے خطرہ کے خلاف آگاہی دی، اوران علاقوں اورقوموں میں دعوت واصلاح اورتعلیم وتربیت کی ضرورت کی طرف متوجہ کیا۔

۳۰ رجون کو ہم لوگ بخیریت دہلی پہونچے اور وہاں سے اپنے مستقرپر آگئے۔

بابِ ششم

انگلستان، الجزائر اور حجاز کے سفر، آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر اور الجزائر کے ملتقی الفکر الاسلامی کے سیمنار میں شرکت، حجاز میں چند روزہ قیام، چند اہم واقعات

اسلامک سنٹر آکسفورڈ میں

اسلامک سنٹر آکسفورڈ میں ۲۷ اگست ۱۹۸۶ء سے مجلس انتظامی کا جلسہ تھا، اور یکم ستمبر کو قاہرہ میں مجلس البحوث الاسلامیۃ العالمیۃ (لکسمبرگ) کا جلسہ تھا، ان دونوں سے میرا ذمہ دارانہ تعلق تھا، اس لئے ان دونوں جلسوں میں شرکت کی نیت کرلی گئی، شیخ الازہر شیخ جاد الحق علی جاد الحق کی پُراصرار دعوت پر واپسی میں مصر ہوتے ہوئے ہندوستان آنے کا قصد تھا، اب جب مجلس البحوث الاسلامیہ نے (جس کے اکثر ارکان مصر میں تھے) اپنا جلسہ قاہرہ میں رکھا، تو ہم نے شیخ الازہر کو اطلاع دی کہ ستمبر کے پہلے ہفتہ میں لندن سے واپسی پر ہم ازہر کی دعوت پر مصر آسکتے ہیں، ۲۶ اگست ۱۹۸۶ء کی صبح کو عزیزی محمد رابع ندوی کی معیت میں لندن اور دوپہر تک آکسفورڈ پہونچنا ہوا، ۲۷ سے ۲۹ تک آکسفورڈ قیام رہا، وہاں سے فارغ ہو کر لندن جانا ہوا، ۳۰، ۳۱ لندن قیام رہا، قاہرہ سے شیخ الازہر کی طرف سے مجوّزہ تاریخ کی معذرت آگئی،

اس سے ذہن نے یہ نتیجہ نکالا کہ شاید وہاں کے بدلے ہوئے سیاسی حالات اور عمومی انتخابات کے پیش نظر ہمارا مصر کا سفر اس وقت مناسب نہیں سمجھا گیا، ایسی حالت میں محض مجلس البحوث الاسلامیہ کے جلسے (منعقدہ یکم ستمبر) کے لئے قاہرہ جانا اور حکومت و ازہر کے علی الرغم وہاں کا قیام اور وہاں کی مجالس میں شرکت اور ملاقاتیں مناسب نہیں سمجھی گئیں، اور مصر کے سفر کا خیال ذہن سے نکال دیا گیا، اس کے بجائے الجزائر میں ستمبر کے پہلے ہفتہ میں ہونے والے عالمی سیمینار ملتقی الفکر الاسلامی میں (جس میں ایک مرتبہ جولائی ۱۹۸۲ء میں شرکت ہو چکی تھی[۱]) اس مرتبہ محض ازہر کی دعوت اور مصر کے سفر کی بناء پر اس میں شرکت سے معذرت کر دی گئی تھی، اب اس میں شرکت کی نیت کر لی گئی کہ اس کی گنجائش پیدا ہو گئی تھی، عالم اسلام اور ممالک عربیہ میں جو سیمینار حکومتوں اور تنظیموں کی طرف سے منعقد کئے جاتے ہیں، ان میں الجزائر کا یہ سیمینار خاص امتیاز اور اہمیت رکھتا ہے۔

الجزائر کے سیمینار میں

اُس مرتبہ الجزائر کے ملتقی الفکر الاسلامی کا عنوان "الاسلام والعلوم الانسانیۃ" تھا، میں نے اس پر ایک مبسوط مقالہ "دور الإسلام الثوری البنّاء فی مجال العلوم الإنسانیۃ" (انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار) کے عنوان سے تیار کر لیا تھا، اور اس کی ایک نقل سیمینار کے سکریٹری کو بھیج دی تھی

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "کاروان زندگی" جلد دوم ص ۳۵۲-۳۵۷

اس مرتبہ یہ سیمینار الجزائر کے ایک مرکزی شہر "سطیف" میں ہو رہا تھا جو دار السلطنت الجزائر سے سمت مشرق تین سو کلو میٹر پر ہے، یہ شہر رومی عہد سے آباد ہے اور نام بھی رومی عہد کا رکھا ہوا ہے، اس شہر کو الجزائر کی تحریک آزادی اور احیائے اسلامی کے جلیل القدر رہنما شیخ بشیر الابراہیمی کا وطن ہونے کی سعادت بھی حاصل ہے، وہ اپنی ولایت کا صدر مقام بھی ہے، پہلے جب اس ملتقیٰ میں شرکت ہوئی تھی تو اس وقت وہ تلمسان میں منعقد ہوا تھا، کوشش کی جاتی ہے کہ ہر سال یہ ملتقیٰ ملک کے کسی اہم مرکزی مقام پر ہو تاکہ ہر بڑے شہر کے لوگوں کو اس سے فائدہ اٹھانے اور مندوبین کو ملک کے مختلف شہروں کے دیکھنے اور وہاں کے اہل علم سے ملنے میں آسانی ہو۔

ہم یکم ستمبر دوشنبہ کو ظہر کے وقت لندن سے الجزائر کے لئے روانہ ہوئے اور مغرب کے وقت الجزائر کے ہوائی اڈہ پہونچ گئے۔

اس مرتبہ پہلے سال کے برخلاف (جب ہم ڈیڑھ دن کی تاخیر سے پہونچے تھے) مطار پر استقبال کرنے والے موجود تھے، جو ہمیں ایک بڑے ہوٹل میں لے گئے، اگلے روز ۲ ستمبر یوم سہ شنبہ صبح کو بذریعہ کار مقام جلسہ سطیف روانہ ہوئے، یہاں افتتاحی جلسہ ہی میں پہونچنا ہو گیا تھا، جو ۲ ستمبر سہ شنبہ کو ۱۱ بجے صبح سے شروع ہو رہا تھا، مجھے جلسہ کے ابتدائی پروگراموں ہی میں ایک پروگرام میں اپنا مقالہ پڑھنے کا موقعہ دے دیا گیا، جو وہاں سائکلو اسٹائل ہو کر پہلے سے مندوبین میں تقسیم ہو چکا تھا، اُس کا انگریزی ترجمہ بھی ہمارے پاس تیار تھا، مقالہ کے بارہ میں سوالات کے لئے بھی وقت رکھا گیا تھا، وہ پروگرام بھی پورا ہوا، جمعہ کی نماز والی (گورنر) کے ساتھ جا کر شہر کی نو تعمیر مسجد میں ادا کی جو شیخ بشیر الابراہیمی کے نام سے موسوم کی گئی اور وزارت اوقاف نے بنوائی ہے،

اس کا افتتاح اسی نماز جمعہ سے ہوا، اس سیمنار میں ۲۷-۲۸ اہم مقالے تھے، جو مختلف جامعات کے ممتاز ترین اساتذہ اور مفکرین نے اس سیمنار کے لئے بڑے اہتمام سے تیار کئے تھے۔

ملتقیٰ کا مقالہ

اس مقالہ میں ثابت کیا گیا تھا کہ اسلام نے انسانی علوم کے میدان میں بالکل انقلابی، بنیادی اور تعمیری کردار انجام دیا ہے اس سلسلہ میں پہلے یونان، ایران، اور ہندوستان کے (جنھوں نے اپنے اپنے وقت پر معاصر دنیا کی علمی، فکری اور تہذیبی قیادت کی ہے) کے دور عروج واقتدار کا حقیقت پسندانہ اور غیر جانبدارانہ جائزہ لیا گیا، اور مغربی مصنفین ومورخین کے بیانات کی روشنی میں دکھایا گیا کہ ان ملکوں میں اپنے اپنے وقت میں علوم عقلیہ (فلسفہ ومنطق) ریاضیات اور ادب وشاعری کس نقطۂ عروج تک پہونچ چکے تھے، اور ان ملکوں کے ذہین ترین افراد اور فضلاء کس طرح آسمان کے تارے توڑ کر لاتے تھے، کس طرح انھوں نے بال کی کھال نکالی تھی، اور کس طرح ان ملکوں میں علمی، ادبی، تہذیبی افکار کا تبادلہ اور استفادہ وافادہ کا سلسلہ جاری رہا۔

پھر مستند مغربی مؤرخین ہی کی کتابوں کے حوالہ سے بتایا گیا کہ علم، ذکاوت، تدقیق وتعمق اور علمی وذہنی بلند پروازیوں کے ساتھ (جن سے زیادہ بلند پروازی کی مثال موجود ومحفوظ تاریخ میں ملنی مشکل ہے) ان تینوں ملکوں (یونان وایران اور ہندوستان) کی زندگی میں کیسے تضادات اور لُوا لعجبیاں پائی جاتی تھیں، وہاں کا

علم الاصنام، دیومالا (MYTHOLOGY) کس مضحکہ خیز حد، کس پستی، عجائب پرستی، اور علمی عقلی دیوالیہ پن کے کس نقطہ پر پہونچ گیا تھا، اور ان کا علمی عروج اور عقلی ارتقاء اس سے ذرا بھی مانع نہ تھا، اور اس میں کسی ملک کا قدم بھی دوسرے ملک سے پیچھے نہ تھا، پھر اسی کے ساتھ اخلاقی بے راہ روی، اجتماعی و معاشرتی انتشار اور جنسی انارکی اس درجہ کو پہونچ گئی تھی جس کا تصور بھی اس وقت مشکل ہے' اس سلسلہ میں مغربی مؤرخین کی شہادتیں یونان کے بارہ میں اور ہندوستانی و ایرانی مؤرخین کے ایسے بیانات ان دونوں ملکوں کے بارہ میں پیش کئے گئے ہیں، جن کو پڑھ کر حیا کی آنکھیں نیچی اور تہذیب کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے' پھر اس صورتِ حال کے خلاف ردِ عمل کی جو تحریکیں پیدا ہوئیں' ان کی انتہا پسندی' حیرانی و بے اثری کو بھی دکھایا گیا، پھر اس معمہ کو حل کرنے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے' کہ اس کا اصل سبب کیا تھا؟ اور علم و حقائق کی روشنی میں بتایا گیا کہ اصل سبب یہ تھا کہ ان تینوں ملکوں کا اپنے دور عروج وارتقاء میں آسمانی رہنمائی اور نبوتوں کے سلسلہ سے ربط و تعلق ٹوٹ چکا تھا، بلکہ جہاں تک یونان اور بعض دوسرے ترقی یافتہ ممالک کا تعلق تھا، وہ اپنے علم و عقل پر نازاں تھے، اور انبیائے کرام کو استخفاف و حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے' اور فخریہ کہتے تھے کہ وہ ہمیں کیا تعلیم دیں گے' اور ہماری معلومات میں کیا اضافہ کریں گے؟ قرآن شریف نے اپنی اس آیت میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَٰتِ	غرض جب ان کے پیمبر ان کے پاس
فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ	کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے

فَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۔ (المؤمن ۔ ۸۳)	تو وہ لوگ اُس علم پر (بڑے) نازاں ہوئے جو انھیں حاصل تھا اور ان پر وہ (عذاب) آپڑا جس پر وہ تمسخر کرتے تھے۔

پھر بتایا گیا ہے کہ نبوت کی کیا ضرورت ہے اور انبیاء کیا عطا کرتے ہیں، وہ عقائد، اعمال، اخلاق و تہذیب کی کیا بنیاد فراہم کرتے ہیں؟ پھر بتایا گیا کہ ان ملکوں میں علوم و عقلیات، معاشرہ اور عام زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈال رہے تھے، بلکہ علم و اخلاق میں ایک تضاد، اہل علم اور عوام میں ایک بیگانگی اور دوری، وحداتِ علمیہ (علمی اکائیوں میں) نہ صرف انتشار بلکہ اکثر تصادم کی صورت حال تھی، علم و عمل میں کوئی رشتہ، اہلِ علم اور فلاسفہ میں معاشرہ کی اصلاح کا کوئی جذبہ اور اپنی ذمہ داری کا کوئی احساس نہیں تھا، ہر ایک اپنے حال میں مگن اور اپنی خیالی دنیا میں مست و مدہوش تھا، اسلام نے آکر اس صورت حال کو بالکل تبدیل کر دیا، علوم انسانی میں ایک نئی روح پھونک دی، ان کا رخ درست کیا، ان میں مقصدیت پیدا کی، خالق کائنات سے، پھر کائنات اور حیات انسانی سے ان کا رشتہ اُستوار کر دیا، علم کی منتشر اکائیوں میں ایک وحدت اور تعاون کی کیفیت پیدا کی، اہل علم اور اہلِ شعور کو معاشرہ کا پاسبان اور مُحتسب، اور بے علم و ناخواندہ افراد کا مُعلّم و مُربّی بنا دیا اور ان کے اندر اس سب کے بارے میں خدا کے سامنے جوابدہ ہونے کا شعور و احساس نہیں، خوف اور یقین پیدا کر دیا، اس نے تعلیم و تعلم کے سلسلہ، حقائق اشیاء کی دریافت، علمی سرگرمیوں اور تعلیمی تحریک کو خدا کے نام سے شروع کرنے اور

خدا ہی کی رہنمائی میں اس سفر کو طے کرنے کی ہدایت کی کہ علم کی وادی ایسی پُرخار اور ناہموار اور رہزنوں سے اس طرح گھری ہوئی ہے کہ یہاں دن دہاڑے قافلے لٹتے اور راہرو راستہ بھٹکتے ہیں، اس نے اپنی پہلی وحی کی ابتدا اہی ان الفاظ سے کی۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ — پڑھو اپنے رب کے نام سے
خَلَقَ ۚ (سورہ العلق - ۱) — جس نے پیدا کیا۔

پھر اس سلسلہ میں اسلام کی عالمگیر علمی تحریک اور اس کے پیشواؤں اور نمائندوں کی خصوصیات اور ان میں سے بعض کے نمونے پیش کئے گئے، آخر میں (کانوں کا ذائقہ بدلنے اور ایک طویل علمی مقالہ کی اکتاہٹ کو دور کرنے کے لئے) نوجوانوں کی اُس پارٹی کا قصہ سنایا گیا، جو ایک کشتی پر دریا کی سیر کے لئے نکلے تھے، اور انھوں نے ناخواندہ ملاح کو اپنی تفریح کا ذریعہ بنا کر اس سے ایک ایک علم و مضمون کا نام لے کر پوچھتے رہے کہ تم نے یہ پڑھا ہے؟ تم نے یہ پڑھا ہے؟ تم اس علم کو جانتے ہو؟ اور وہ ہر سوال پر اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا رہا، انھوں نے اس کی عمر پوچھ کر کہا کہ جاؤ تم نے اپنی آدھی عمر کھودی! خدا کا کرنا کہ تھوڑی دیر کے بعد دریا میں طوفان آیا، اس وقت اس جاہل ملّاح کی بن آئی اور اس نے کہا کہ صاحبزادو! تم نے پیرنا بھی سیکھا ہے؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا، اس نے کہا جاؤ میں نے اپنی آدھی عمر کھوئی تم نے اپنی پوری عمر ڈبوئی، اور کہا گیا کہ یہی وہ علم نجات یا زندگی کا دریا کامیابی سے عبور کرنے اور ساحل نجات پر پہونچنے کا فن ہے جو صرف انبیاء کے ذریعہ ملتا ہے۔[1]

---

[1] یہ مقالہ علیحدہ رسالہ کی شکل میں طبع ہو چکا ہے۔

سطیف میں قیام ۲ ستمبر سے ۵ ستمبر عصر کے وقت جلسہ کے اختتام تک رہا، مختلف عرب ممالک سے فضلاء کی بڑی اچھی تعداد آئی ہوئی تھی، ان میں متعدد قدیم احباب تھے، ان سے ملاقاتیں رہیں، وہیں مصر کے کثیر الاشاعت روزنامہ الاھرام کے نمائندہ نے مفصل انٹرویو بھی لیا جس میں وقت کے اہم مسائل پر اظہار خیال تھا۔

جمعہ کو عصر کے وقت بذریعہ کار الجزائر شہر واپسی ہوئی، جہاں عشا کے وقت پہونچنا ہوا، ملتقی کے ذمہ داروں نے الجیریس ایرلائن سے قاہرہ کے لئے اور قاہرہ سے سعودی ایرلائنس کے ذریعہ جدہ کے لئے فرسٹ کلاس کی دو سیٹیں ریزرو کرالی تھیں، الجزائر کا کوئی جہاز اس روز جدہ جانے کے لئے نہیں تھا، اس لئے انھوں نے یہ انتظام کیا، رات ہوٹل میں ٹھہر کر ہم لوگ قاہرہ کے لئے روانہ ہوئے، الجزائر کے جہاز میں چھپی ہوئی اطلاع دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جہاز پر کھانا سب حلال اور ذبیحہ ہے، اس میں کوئی مشتبہ چیز نہیں ہے، صبح الجزائر سے روانہ ہو کر ۱۱ بجے دن کو قاہرہ پہونچے ۵۱ء کے بعد ۳۵-۳۶ سال کے بعد ہم نے مصر کی سرزمین پر قدم رکھا، ہوائی اڈہ پر باہر کے حصہ میں بورڈ لگا ہوا تھا، جس پر قرآن مجید کی آیت "ادخلوا مصران شاء اللہ آمنین" لکھی ہوئی تھی، شاید دنیا کے کسی ملک کو قرآن مجید کی ایسی بامعنی اور حسب حال آیت لکھنے کا موقعہ نہ ہو لیکن قاہرہ کے ہوائی اڈہ پر عملہ نے ہمارے ساتھ وہ برتاؤ اور رویہ اختیار نہیں کیا جو اس آیت سے میل کھاتا ہو، ہمارے پاس فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ تھے، جدہ کے لئے سیٹیں بھی ریزرو تھیں لیکن ہم مسافروں کا کوئی

پرسان حال نہ تھا، ڈیوٹی پر جو لوگ تھے، وہ بجائے عربی کے انگریزی میں بات کرنا پسند کرتے تھے، اور ضابطہ کا اکھڑا سا جواب دیتے تھے، نہ کہیں آرام کرنے کا موقعہ تھا، نہ وضو اور نماز کی سہولتیں تھیں، جب ہم کچھ سوال کرتے تو جواب ملتا کہ جہاز کی روانگی کا انتظار کرو۔

ہمیں ۱۱ بجے دن سے ۶ بجے شام تک وہاں وقت گذارنا پڑا، یہ محرم کی پہلی اور ستمبر کی ۶ تاریخ تھی، مغرب کے وقت روانہ ہو کر بوقت عشاء جدہ پہونچے، وہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ ہم اپنے وطن آگئے، دو رات اور ایک دن جدہ میں رہے، ۸ ستمبر کو مدینہ طیبہ روانہ ہوئے، وہاں جمعہ تک رہے، شنبہ ۱۳ ستمبر کو مکہ مکرمہ روانہ ہوئے، وہاں عمرہ سے فارغ ہو کر ۱۳ سے ۱۹ ستمبر پنجشنبہ تک رہے، ۲۰ ستمبر ۸۶ء جمعہ کو صبح دہلی کے لئے براہ کویت روانہ ہوئے، اور دہلی سے اپنے مستقر لکھنؤ پہونچ گئے۔

رفیق قدیم مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی کی وفات

۱۸ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو اچانک حافظ کرامت صاحب دہلوی کے ٹیلیفون سے صدیق عزیز اور رفیق قدیم مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی کی وفات کی اطلاع ملی، مولانا عرصہ سے چند در چند بیماریوں میں مبتلا اور چلنے پھرنے سے معذور تھے لیکن اپنی غیر معمولی قوت ارادی، تحمل و برداشت کی طاقت اور وضعداری اور عالی حوصلگی سے (جس کا ان کو قدرت کی طرف سے حصۂ وافر ملا تھا) کام لے رہے تھے، ۴ نوامبر ستمبر ۱۹۸۹ء کو انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

پر تاج المساجد بھوپال میں ایک سیمینار منعقد کیا تھا، جو اپنی شان میں بالکل منفرد تھا، اور غالباً اس برصغیر میں ایسا شاندار، مفید اور وقیع سیمینار سید صاحب کے بارہ میں منعقد نہیں ہو سکا تھا[1]، خبر بجلی بن کر دل و دماغ پر گری، میری ان کی دوستی، برادرانہ تعلق اور رفاقت کار کی مدت نصف صدی سے کم نہیں، وہ میرے رفیق درس بھی تھے، میں ان کا زمانۂ قیام دار العلوم میں (جہاں وہ سالہا سال تک مہتمم رہے) رفیق کار بھی، انھوں نے اس رفاقت کا حق اس طرح ادا کیا جس میں الید العُلیا خیر من الید السُّفلیٰ کا شرف انھیں کے حصہ میں آیا، میں نے ان کی وضعداری، وفاداری، عالی حوصلگی اور کریم النفسی کی ایسی مثالیں دیکھیں جو اس زمانہ میں اگر بالکل نایاب نہیں تو بہت کمیاب ضرور ہیں، ان کے تعلق اور اس خبر صاعقہ اثر کا تقاضہ تو یہ تھا کہ میں اور دار العلوم کے خصوصی اہل تعلق سنتے ہی بھوپال روانہ ہو جائیں اور تدفین میں شرکت کریں، لیکن لکھنؤ سے بھوپال کے لئے ڈائرکٹ سروس نہیں ہے، کسی طرح اس وقت پہونچنا ممکن نہ تھا، دوسری دقت یہ تھی کہ اگلے ہی روز یعنی ۱۹؍اکتوبر کو سیتاپور میں دینی تعلیمی کونسل کی ایک اہم کانفرنس تھی، جس کی مجھے صدارت بھی کرنی تھی، اور خطاب بھی، اس لئے میں بجائے ۱۸ ؍یا ۱۹؍اکتوبر کے رفقائے عزیز مولوی معین اللہ صاحب ندوی، مولوی ابو العرفان خاں صاحب ندوی مولانا

---

[1] اس بزم سلیمان کی مفصل روئیداد اور اس میں پیش کردہ مقالات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "مطالعۂ سلیمانی" مرتبہ ڈاکٹر مسعود الرحمن خاں ندوی و ڈاکٹر محمد حسان خاں ندوی۔

محبوب الرحمٰن صاحب ازہری، اور عزیزی عبدالرزاق کی معیت میں ۲۰ اکتوبر کو
بھوپال پہونچا، افرادِ خاندان، علماء دارالعلوم تاج المساجد اور تبلیغی جماعت کے
مخصوص احباب ورفقاء ہی نہیں سارا شہر سوگوار اور مستحق تعزیت تھا تاج المساجد
کی عمارت جس کی تکمیل و تزئین ان کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ، ان کے عزم و ہمت
اور قوت عمل کا پیکر تھا، اس کے در و دیوار ان کی زندہ یادگار تھے، یہیں جماعت
تبلیغ کا ہندوستان میں سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے، جو انھیں کا قائم کیا ہوا ہے،
اسی مسجد میں ان کا تعزیتی جلسہ ہوا، جس میں میں نے اپنے تاثرات و جذبات کا
اظہار کیا، اور ان کی خداداد خصوصیات کا ذکر کیا، اور بتایا کہ ان کے بعد ان کے
تربیت یافتہ نوجوانوں، ان کے رفقائے کار، ان کے عقیدت مندوں اور
اہلِ شہر پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، یہ تاثر صرف اسی جلسہ اور بھوپال
تک محدود نہیں ہے، اس کا حلقہ وسیع اور اس کی مدت طویل ہے، اللہ تعالےٰ
ان کے درجے بلند فرمائے، اور ان کی نشانیوں کو آثار باقیہ اور صدقاتِ جاریہ
میں تبدیل کر دے۔

امام حرم اور سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی کی لکھنؤ اور دارالعلوم میں آمد

یکم نومبر ۱۹۸۶ء کو امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السُّبَیّل، رابطۂ عالم اسلامی کے
سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف، اور ہندوستان میں متعیّن سعودی عرب
کے سفیر صادق فؤاد مفتی اور ان کے رفقاء دارالعلوم ندوۃ العلماء کی دعوت پر
لکھنؤ تشریف لائے، حرم کی نسبت سے ان حضرات کا لکھنؤ کے ہوائی اڈہ اور

شہر میں ایسا استقبال ہوا جس کی نظیر کسی بیرونی مہمان کے سلسلہ میں شاید لکھنؤ کی تاریخ میں نہ ملے، اتفاق سے جمعہ کا دن بھی تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے میدان میں ان کے اعزاز میں جلسہ ہوا جس میں کئی لاکھ کا مجمع تھا، انگریزی اخباروں نے لکھا کہ "انسانوں کا ایک مواج سمندر تھا" جلسہ میں جناب عثمان عارف نقشبندی گورنر صاحب اترپردیش، نیاز حسن خاں صاحب اسپیکر یو. پی اسمبلی، مرکزی و صوبائی وزراء اور سرکاری ذمہ داروں، دانشوروں اور علمائے کرام اور اساتذۂ مدارس کی بڑی تعداد تھی۔

میں نے اپنی تقریر میں "جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ"[1] کی تفسیر پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ باطنی طور پر نظامِ عالم بیت اللہ سے اور نظام عقائد و اعمال و اخلاق اس دعوت سے مربوط ہے جس کے لئے بیت اللہ قائم ہوا، میں نے کہا کہ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ "قِيٰمًا لِّلنَّاسِ" کا صحیح ترجمہ نہیں کر سکتا، میں نے جو اردو کے تراجم دیکھے ہیں، میں اس سے بھی مطمئن نہیں ہوں کہ "قِيٰمًا لِّلنَّاسِ" کا اردو میں صحیح ترجمہ ہوا ہے، لیکن میں اس کا مفہوم ادا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو لوگوں کی زندگی کا دار و مدار بنایا ہے، یہ نظام عالم نہ حکومتوں سے مربوط ہے، نہ تنظیمات سے، نہ فوجی طاقت سے، نہ اخلاقی فلسفوں اور تہذیبوں اور علمی مرکزوں سے مربوط ہے، نظامِ عالم جہاں تک ہماری نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں، بیت اللہ شریف سے اور اس دعوت سے مربوط ہے، جس کے لئے بیت اللہ قائم ہوا، وہ صحیح اعتقاد،

---

[1] سورۃ المائدۃ - ٩٧

صالح سیرت واخلاق، انسانیت کے رشتے، اخوت ومحبت، انسانیت کے احترام، ہر چیز میں خدا کو حاضر ناظر سمجھنے سے قائم ہے، اور اس سب کا مرکز وہ دعوت، وہ مقاصد، وہ تعلیم، وہ مرکزیت ہے، جس کے داعیِ اول سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور جس کے مجدد وخاتم اور تکمیل ومحافظ سیدنا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور جن کی نمائندگی بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی کرتی ہے۔

اس آیت سے ہم ہندوستانی مسلمانوں پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، یہاں دینی حیثیت سے بھی ملت اسلامیہ بیت اللہ کی نمائندگی کرتی ہے، اگر یہ ملک خدانخواستہ مال کی بڑھی ہوئی محبت، انسان کشی، مردم آزاری، اور روزمرہ کے فسادات، خودغرضی اور بے ضمیری اور انسانیت کی قدر وقیمت نہ جاننے کی وجہ سے تباہ ہوا تو ہمارا دامن ہوگا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دست مبارک، اس لئے کہ ہم انھیں نبی کی امت ہیں جن کو "رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ" کا لقب دیا گیا ہے "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ" اور کہا گیا ہے کہ "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ"[1] (اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے، انھیں عذاب دیتا، اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انھیں عذاب دے)۔

اس امت کی موجودگی میں بھی جو نبیٔ رحمت سے نسبت رکھتی ہے، اور اُن کی تعلیمات کی حامل اور ان کی ساختہ پرداختہ ہے، کسی ملک کو تباہ نہیں ہونا چاہئے، اس کی ذمہ داری ہے کہ یہ حقیقتیں زندہ رہیں، وہ ملک کے محافظ بنیں اور اس کو

---

[1] سورۃ الانفال۔ ۳۳

اجتماعی خودکشی اور خودسوزی سے بچائیں۔

میرے بعد دونوں معزز مہمانوں نے تقریریں کیں، اور حاضرین اور عام ہندوستانی مسلمانوں کو مناسب نصیحتیں، توحید خالص تقویٰ، صحیح دینداری، صحیح حب الوطنی اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تلقین کی۔

باب ہفتم

دہلی، ناگپور اور پونہ کے ڈائلاگ

شاخ نشیمن

صدیوں پہلے کسی دل جلے عرب شاعر نے اپنے شہر و وطن کے متعلق جہاں وہ اپنے ہم وطنوں کی جفا اور مخالفتوں کا نشانہ بنا تھا ایک شعر کہا تھا ؂

لا أذود الطّیر عن شجر
قد بلوتُ المُرّ من ثمرہ

(میں ایسے درخت کی اس کو نقصان پہونچانے والی چڑیوں سے حفاظت کرنے اور ان چڑیوں کو اس کی شاخوں سے اڑانے کے لئے تیار نہیں جس کے کڑوے پھل ہی میرے حصہ میں آئے)۔

کسی اردو شاعر نے بھی کہا تھا ؂

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھالیا
اس کی بلا سے بُوم رہے یا ہُما رہے

لیکن ایک سچے ہندوستانی مسلمان کے نقطۂ نظر سے ہندوستان اور ہندوستان میں مسلمانوں کی صورتِ حال اس سے قطعاً مختلف ہے، اول تو اس کا ذہن آفاقی اور کائناتی ہے اور وہ اپنے دین کی تعلیمات کی رُو سے

نہ صرف انسان دوستی اور خلائق پروری پر مامور ہے، بلکہ وہ ہر جگہ کے انسانوں کو خدا کی امانت، ان کی حفاظت و خدمت اور ان کی خیر خواہی اور ان کو نیک راستہ بتانے کو اپنا فریضہ اور اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے، اس لئے وہ اس کھیتی کو تاراج کرنے والے جانوروں کے رحم و کرم، اور اس ہرے بھرے درخت کو ظالم چڑیلوں کے حوالہ نہیں کر سکتا۔

اردو شاعر کے قول کے برخلاف بلبل نے اس چمن سے آشیانہ نہیں اٹھایا، اسی درخت کی ایک شاخ پر اس کا نشیمن ہے، اس نے اس چمن کو اپنے خون سے سینچا ہے، اور اس کے ایک ایک درخت اور پودہ کی آبیاری اور پاسبانی کی ہے۔

ع مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا

اس لئے مسلمان ایسے ملک کی تباہی و بربادی نہیں دیکھ سکتا جس کو اس نے اپنا وطن بنایا اور جہاں اس کے اسلاف نازک وقتوں میں توحید کا پیغام اور اُخوّت و مساواتِ انسانی کا مقدّس کام لے کر آئے اور اس ملک نے ان کو جگہ دی۔

یہی وہ حقیقت، عقیدہ اور طریقِ فکر تھا جس نے ان سطور کے لکھنے والے کو ہندوستان کے حالات، یہاں کے پھلنے پھولنے والے تخریبی رجحانات، انتشار انگیز اور مفسدہ پرداز تحریکوں اور یوماً فیوماً ترقی پذیر باہمی منافرت اور فرقہ پرستی سے یکسر آنکھیں بند کر لینے کی اجازت نہیں دی، عالم اسلام کے مسائل، مسلم ممالک کی صورتِ حال کی طرف توجہ کرنے، اور اس عام اسلامی بیداری کی (جو اس وقت رباط اور مراکش سے لے کر انڈونیشیا اور بنگلہ دیش تک میں کروٹیں لے رہی ہے)

اپنی تحریروں، تقریروں اور مجالس مذاکرات میں شرکت کرنے کے ذریعہ حقیر خدمت انجام دینے کے ساتھ وہ کبھی اس شاخ کو فراموش نہیں کرسکا جس پر اس کا اور ملّت اسلامی کے ایک ایسے بڑے خاندان کا نشیمن ہے، جو ذہنی اور عملی صلاحیتوں سے اب بھی محروم نہیں ہوا ہے۔

یہی خیال اور جذبہ تھا جس نے راقم سطور کو "پیامِ انسانیت" کی تحریک شروع کرنے پر (جس کا بظاہر اس کے طبعی ذوق، مطالعہ و تصنیف کے انہماک اور خاندانی خلوت پسندی اور "خود مشغولی" کے ساتھ کوئی جوڑ نہ تھا) آمادہ کیا اور اس نے اپنے معدودے چند رفقاء کے ساتھ ملک کے دورے کئے، بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیں، اور مختلف مقامات پر سیمینار اور مجلس مذاکرہ منعقد کیں[1]۔

نفقۂ مُطلّقہ کے سلسلہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد انگریزی، ہندی پریس، غیر مسلم دانشوروں، اہل قلم اور مختلف پارٹیوں کے قائدین اور رہنماؤں نے جو جذباتی، جارحانہ اور غیر دانشمندانہ رُخ اختیار کیا، اور اس کو اکثریت کے وقار اور اس کی بالادستی اور حقِ آئین سازی کا بلکہ قومیت متّحدہ کا نشان اور معیار بنا دیا، اس نے اس حقیقت کی طرف دوبارہ متوجہ کیا کہ ملک کی اکثریت مسلمانوں کے بنیادی عقائد، ان کے دینی و ملّی مزاج و فطرت اور ان کے اہم ترین مسائل و جذبات سے اتنی ناواقف ہے جتنے اکثر ایک ملک کے لوگ بھی (نشر و اشاعت سفر کی سہولتوں اور ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرنے کے امکانات کے دور میں)

---

[1] تفصیل "کاروانِ زندگی" جلد دوم باب پنجم ص ۱۰۹-۱۲۷ اور باب سیزدہم ص ۳۲۳ میں گذر چکی ہے۔

دوسرے ملک کے لوگوں کے مسائل و جذبات سے شاید اتنے ناواقف نہیں ہوتے، پھر منافرت انگیز لٹریچر، سیاسی پروپیگنڈہ، زہر آلود اور رنگ آمیز تاریخ، نصاب کی کتابوں اور بے تحقیق داستانوں اور کہانیوں کی بناء پر معاملہ صرف منفی ناواقفیت کا نہیں، مثبت نفرت و اشتعال، تحقیر و تذلیل کے جذبہ کا ہے، اس سب کے ساتھ خوف و اندیشہ بھی لاکھوں دماغوں میں جڑ پکڑ چکا ہے۔

"نفقۂ مطلقہ" کے مسئلہ کے افہام و تفہیم کے سلسلہ میں تلخ تجربہ نے اس پر اور بھی آمادہ کیا کہ ہندوستان کے مرکزی مقامات پر خاص طور پر جہاں سے بڑے بڑے انگریزی ہندی کے اخبارات اور رسائل نکلتے ہیں، اور وہ فرقہ پرستی اور جارحانہ ہندو احیائیت کے اہم رہنماؤں کی سرگرمیوں کا مرکز بھی ہیں، اس مقصد کے لئے ڈائلاگ (DIALOGUE) منعقد کرنے کا پورے اہتمام کے ساتھ اور مؤثر طریقہ پر جلد انتظام کرنا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے دہلی پھر ناگپور اور پونہ پر نظر گئی جن میں سے ایک ہندوستان کا دارالحکومت اور سیاسی و ثقافتی مرکز ہے، بقیہ دو R. S. S. اور شیوسینا کے گڑھ ہیں، پچھلے تجربوں کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آچکی تھی کہ ایسی مجلس مذاکرہ اور ڈائلاگ کے لئے محض ضابطہ کے دعوت ناموں اور اخبارات میں اعلان سے کام نہیں چلتا، اس کے لئے شخصی رابطہ قائم کرنے، ملاقاتوں اور تعلقات سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی ضرورت ہے، جہاں تک دہلی کا تعلق تھا، میں نے اور رفیق محترم ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی نے یہ کام محترمی سید حامد صاحب (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے

سپرد کیا، جن کو اس طرز فکر اور طرز کار سے پورا اتفاق بھی ہے، اور وہ ایک باوقار شخصیت کے حامل اور دہلی میں مقیم ہیں، اور وہاں کے مختلف حلقوں سے تعارف اور تعلق رکھتے ہیں، ان کی مدد کے لئے قاضی عبدالحمید صاحب اندوری کو چند روز دہلی کے قیام پر آمادہ کیا گیا تاکہ وہ ملاقاتوں اور ذاتی رابطہ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ غیر مسلم صحافیوں، دانشوروں اور پارٹیوں کے رہنماؤں کو شرکت پر آمادہ کر سکیں۔

ایک بڑی دشواری اور نزاکت یہ تھی کہ ہم نے اس ڈائلاگ کے لئے (ملک کے دوروں اور ناگزیر مصروفیتوں کی بنا پر) ۴ر مئی ۱۹۸۶ء کی تاریخ مقرر کی تھی، اور اس کے ٹھیک ۲ دن بعد ۶ر مئی ۸۶ء کو مسلم مطلقہ بل بحث و مباحثہ کے لئے پارلیمنٹ میں پیش ہونے والا تھا، جس نے ہندوستان بالخصوص دہلی کی پوری فضا کو گرم، مشتعل اور غیر متوازن بنا رکھا تھا، پھر بھی جد و جہد جاری رکھی گئی، سید حامد صاحب نے ابتدائی تعارف اور تجاویز انگریزی میں مرتب کر لی تھیں، میں نے "مسلمانوں کے مسائل و جذبات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے!" کے عنوان سے ایک مضمون کل ہند مجلس استحکام و یکجہتی لکھنؤ فورم کی طرف سے مستقل رسالہ کی شکل میں چھپوا لیا تھا، اور اس کا انگریزی، ہندی ترجمہ بھی چھپا ہوا اور تیار موجود تھا، اس رسالہ میں مسلمانوں کی بنیادی خصوصیتوں (معیّن عقیدہ، مستقل دین و شریعت، دینی تسلسل کی اہمیت، اپنے پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن مجید سے مسلمانوں کے بے مثال تعلق) کو بیان کرنے کے ساتھ مسلم پرسنل لا کی اہمیت کی وجہ بیان کی گئی تھی، پھر گاندھی جی کی اس بالغ نظری اور حق پسندی

(مسئلۂ خلافت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تائید اور حمایت) کا ذکر کیا گیا جس نے ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد، جنگ آزادی میں باہمی اعتماد، تعاون اور جوش کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی، جو نہ اس سے پہلے دیکھنے میں آئی تھی نہ اس کے بعد، اسی کے ساتھ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی اس اصول پسندی کی مثال پیش کی گئی، جو انھوں نے ۱۹۵۰ء میں کانگریس کے فرقہ پرست عناصر کے مقابلہ میں قائم کی تھی، جو ملک کی قیادت پر حاوی ہو رہے تھے اور اس کو جمہوریت اور رائے عامہ کا نام دے کر اس کا ساتھ دینے کی اپیل کر رہے تھے، انھوں نے ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۰ء کو گاندھی نگر ناسک میں جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا:

"کچھ لوگ مجھ سے آکر کہتے ہیں کہ مجمع فلاں بات نہیں مانتا اور جمہوریت کی آواز آگے بڑھ رہی ہے، دراصل یہ بزدلوں کی دلیل ہے اگر جمہوریت کا مطلب ہجوم کے آگے جھکنا ہے، تو ایسی جمہوریت کو جہنم واصل ہونا چاہیئے، اس قسم کی ذہنیت جہاں بھی سر اٹھائے گی میں اس کے خلاف لڑوں گا۔"[۱]

اس کے بعد ہندوستانی پریس، اور اخبار نویسوں سے دوستانہ شکایت کی گئی تھی کہ وہ مختلف فرقوں کے جذبات و شکایات، احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کو اپنے صحیح حجم (BULK) اور مقررین و سامعین کے اصل جذبات و کیفیات کے ساتھ، حکومت اور پبلک کے سامنے پیش نہیں کرتے، جس سے وہ صورتِ حال کا صحیح اندازہ کر سکیں، اس سلسلہ میں میں نے کلکتہ کے

---

[۱] ماخوذ از "قومی آواز" لکھنؤ، ۲۲ر ستمبر ۱۹۵۰ء

شہید مینار کے عظیم الشان جلسہ کی مثال دی۔ مسلم پرسنل لا بل کے سلسلہ میں پریس نے جو ONE WAY TRAFFIC کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے، اور وہ یک طرفہ ترجمانی پر مُصر ہے، اس کی شکایت کی۔

لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ ساری کوششوں کے باوجود فضا کے غیر معتدل (SUB NORMAL) ہونے کی وجہ سے غیر مسلم صحافیوں، دانشوروں، قانون دانوں اور پارٹیوں کے رہنماؤں کی شرکت نہ ہونے کے برابر رہی، یہ بھی غنیمت تھا کہ جلسہ کی صدارت اندر کمار گجرال (سابق سفیر روس) نے کی، جناب کلدیپ نیّر صاحب بھی شروع سے آخر تک شریک رہے، جو نسبتاً کھُلے دماغ کے اور صاف گو صحافی سمجھے جاتے ہیں، مالک رام صاحب بھی شریک اجلاس تھے، اخبار STATESMAN کے دو غیر مسلم نمائندے بھی شریک تھے، البتہ مسلمان عمائدین کی اچھی تعداد تھی، جن میں جناب ضیاء الرحمٰن صاحب انصاری وزیر مملکت، بدر الدین طیب جی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی و سابق سفیر ایران و جاپان، سید شہاب الدین صاحب ایم۔ پی، احمد رشید شروانی صاحب اور حکیم عبد الحمید صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مولانا سید منّت اللہ صاحب رحمانی بھی تشریف رکھتے تھے، جو ان دنوں بل کے پیش ہونے کی وجہ سے دہلی ہی میں مقیم تھے۔

یہ ڈائلاگ انٹرنیشنل سنٹر دہلی میں منعقد ہوا تھا اور NON VEGETARIAN لنچ کا بھی انتظام تھا، ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ میرے مضمون کا خلاصہ پیش کرنے کے وقت کلدیپ نیّر صاحب نے کہا کہ اکثریت کے فرقہ کے لوگ اس ملک میں اپنے کو

محسوس کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ان کے گرد گھیرا تنگ اور شدید UNDER SIEGE
ہوتا جا رہا ہے، چاروں طرف مسلم ممالک ہیں، اور خود ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی
آبادی برابر بڑھ رہی ہے، اس پر محترم ضیاء الرحمٰن صاحب انصاری نے فرمایا کہ
یہ تاریخ کا پہلا تجربہ ہے کہ اتنی بڑی اکثریت اپنے کو محصور اور خطرہ میں محسوس کرے۔

اس ڈائلاگ سے اگرچہ وقت اور ماحول کی ناسازگاری کی وجہ سے
دانشوروں اور صحافیوں کے ایک بڑے حلقہ سے رابطہ قائم کرنے میں کامیابی
حاصل نہیں ہوئی، لیکن ان حالات میں جو کچھ کیا جا سکتا تھا، کیا گیا۔

ناگپور کا ڈائلاگ

دہلی کے بعد ناگپور کی باری تھی، جو R. S. S. کا ایک بڑا مرکز ہے، جہاں
اس کے قائد و روحِ رواں بالا صاحب دیورس اور مرہٹہ نسل و قومیت کے
ہندو احیائیت کے متعدد پرجوش داعی رہتے ہیں، اس شہر اور صوبہ نے
بارہویں صدی ہجری کے نصف آخر اور اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں
اس ملک میں ہندو اقتدار دوبارہ قائم کرنے اور برہمنی تہذیب اور ثقافت کو
زندہ کرنے میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا، جس کو احمد شاہ ابدالی کے بروقت اقدام
اور حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کی فکرمندی اور توجہ
نے ناکام بنا دیا تھا۔

ناگپور میں ڈائلاگ منعقد کرنے کا ایک بڑا محرک یہ بھی تھا کہ وہاں ہمارے
ممتاز رفیق کار مولانا عبد الکریم پاریکھ موجود ہیں، جن کا نہ صرف یہ کہ ملک و ملت کے

مسائل میں ذہن صاف اور ہم سے قریب تر ہے' وہ اپنی اخلاقی بلندی' بے لوث خدمتِ خلق' اور شہر کے امن واماں قائم رکھنے میں ساعی وسرگرم ہونے کی وجہ سے غیر مسلموں میں بھی مقبول ہیں' اور ہر حلقہ میں وقار واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں' انھوں نے ڈائلاگ کے انعقاد اور اس کو کامیاب بنانے کی ذمہ داری قبول کی' خوش قسمتی سے ان کے فرزند اکبر الحاج عبدالغفور پاریکھ اس کام میں ان سے زیادہ سرگرم اور مستعد ثابت ہوئے' اور انھوں نے غیر مسلم حلقہ سے رابطہ قائم کرنے میں اور اس ڈائلاگ کے اغراض ومقاصد کے تعارف میں بڑی صلاحیت کا ثبوت دیا' حقیقتاً اس کی کامیابی کا سہرا انھیں باپ بیٹوں کے سر بندھا ہے۔

یہ ڈائلاگ ۵ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ضلع پریشد ہال اولڈ سکریٹیٹ بلڈنگ میں منعقد ہوا' جلسہ کی صدارت ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر چانسرکر V. C. CHANSARKAR کر رہے تھے' جو ایک مشہور ومعزز صاحبِ علم' کئی کتابوں کے مصنف' اور R. S. S. کے خاص حامی ہیں' خوش قسمتی سے سید حامد صاحب بھی دہلی سے تشریف لے آئے' انھوں نے ڈائلاگ کے اغراض ومقاصد "تحریک پیامِ انسانیت" اور اس کے حقیر داعی کے تعارف کا کام اور ملک کی موجودہ خطرناک صورت حال کی تصویر کشی انگریزی میں بڑے اچھے انداز میں کی' اس کی تائید مسٹر چانسرکر نے مناسب انداز میں کی' جلسہ میں شہر کے دانشور' رفاہ عامہ کے کاموں میں پیش پیش کارکن' سکھ سماج اور ہندو مسلم معاشرہ میں بعض مقبول شخصیتیں' وسط ہند کے کئی سماجی اداروں کے ذمہ دار' رائل بودھیک سوسائٹی کے اہم ذمہ دار' جین کی

بودھک عوام کے مسائل میں دل چسپی لینے والے اور چین کے وزیر اعظم چو ائن لائی کے مشیر، بہار انسٹر کے مقبول ترین شاعر اور بہار اشٹر اردو اکیڈمی کے صدر، مشہور سکھ مذہبی رہنما، بعض مشہور سائنٹیسٹ جو اپنی بعض خاص تحقیقات کی وجہ سے نامور ہیں، اور متعدد ماہرین تعلیم شریک تھے، جن سب کے نام لکھنے مشکل ہیں۔

میرا مضمون "ملک و معاشرہ انتہائی خطرناک موڑ پر ہے، اور اس کی جلد خبر لینے اور فکر کرنے کی ضرورت ہے" کے عنوان سے طبع شدہ موجود تھا اور اس کا انگریزی، ہندی ترجمہ بھی تیار تھا، وہ دونوں تقسیم کر دیئے گئے۔ اس مضمون کے چند اہم عنوانات حسب ذیل ہیں۔

"سماج کے لئے سب سے بڑا خطرہ ظلم کا مزاج پیدا ہو جانا اور اس سے بڑھ کر اس کو ناپسند کرنے والوں اور اس کے روکنے کے لئے جان کی بازی لگا دینے والوں کا فقدان ہے"۔

"ملک کی سب سے بڑی طاقت اور دولت حق گو اور بے لاگ اور جانباز انسانوں کا وجود ہے"۔

"انسانیت کا آخری سہارا دو طبقے (سچے مذہبی انسان اور اعلیٰ دانشور) ہیں، جن میں سب سے آخر میں بگاڑ آتا ہے"۔

"موجودہ دور ہندوستان کی تاریخ میں سب سے خطرناک دور ہے جس میں ملک کا اخلاقی زوال اپنی آخری حد کو پہنچ گیا ہے، قائدین و رہنما اپنے فرقے اور اپنے ساتھیوں کا بے لاگ اخلاقی محاسبہ کرنے اور ان کی خبر لینے کے بجائے دوسرے فرقہ کو وعظ و نصیحت کرنے میں مشغول ہیں"۔

آخر میں چار نکاتی ہمہ گیر اور طویل المیعاد پروگرام پیش کیا گیا۔[1]

مضمون پیش کرنے کے وقت صاحب مقالہ جابجا زبانی خطاب بھی کرتا رہا، اس میں اس نے یہ بھی کہا کہ اگر اس ملک میں ظلم و بربریت، اخلاقی قدروں کی پامالی، انسان سوزی اور نسل کشی کا سلسلہ یونہی جاری رہا[2]، اور اس کو روکنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی تو اس ملک کے لئے خطرات اور مسائل ایسی جگہ سے پیدا ہوں گے اور اس طرح سے اچانک نمودار ہوں گے کہ نہ کوئی نجومی اس وقت اس کی پیشین گوئی کر سکتا ہے، اور نہ کوئی بڑے سے بڑا دوربین، سیاسی مبصر ان کی خبر دے سکتا ہے[3]، میں نے صفائی سے یہ بھی کہا کہ ایک جگہ کے فرقہ وارانہ فساد کے بعد ملک میں پیش آنے والے حوادث اور ان کا شکار ہونے والوں کی تعداد پر نظر رکھی جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ حساب نہ صرف برابر ہوگیا، بلکہ کچھ بڑھ گیا۔

مضمون کے اختتام، اور بعض تائیدی تقریروں اور شکریہ کے بعد حاضرین نے لنچ میں شرکت کی جس کا بڑے سلیقہ سے انتظام کیا گیا تھا، معزز حاضرین میں سے متعدد اہم شخصیتیں ملاقات کے لئے آئیں اور انھوں نے اپنے بڑے گہرے تاثرات کا اظہار کیا۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ "ملک و معاشرہ انتہائی خطرناک موڑ پر" شائع کردہ "تحریک پیام انسانیت" لکھنؤ۔ [2] اس کی تازہ اور واضح ترین مثال میرٹھ کا وہ المیہ ہے جو مئی ۱۹۸۷ء میں پیش آیا، اور جس کا قدرے تفصیل سے ذکر آگے کسی باب میں آئے گا۔

[3] مثلاً بوفورس کا قضیہ جس میں حکومت کے ذمہ داروں پر بڑے پیمانہ پر رشوت لینے کا الزام لگایا گیا ہے، اور جس سے ملک میں ایک نئی محاذ آرائی پیدا ہوگئی ہے ایک طرف ہولناک اور تباہ کن سیلاب اور دوسری طرف خطرناک سوکھا اور قحط سالی، کانگرس کی صفوں میں انتشار وغیرہ۔

ناگپور میں ایک مختصر پریس کانفرنس بھی ہوئی جس میں میں نے کہا کہ آپ اس ملک اور اس کے مستقبل کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے، جہاں ایک خاندان کے بزرگ اپنے گھر کے بچوں کو دیکھ کر بجائے خوش ہونے کے فکرمند اور مغموم ہو جائیں، یہ سوچ کر کہ معلوم نہیں کس وقت جنون کی کوئی لہر آئے اور ان کلیوں کو پھولنے سے پہلے مسل کر رکھ دے اور کہنے والے کو کہنا پڑے۔ ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

دوسرے جلسے

ناگپور کے ڈائلاگ سے فارغ ہو کر اس مختصر سے قیام سے (جس کی نوبت دیر دیر میں آتی ہے) فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی، جلسہ کے داعیوں اور منتظموں کے ایماء پر کئی جگہ خطاب ہوا جس میں عرب طلبہ سے خطاب (جو ناگپور میں قابلِ لحاظ تعداد میں ہیں اور ان میں سے متعدد کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ راقم سے پہلے سے واقف تھے، اور خاصی تعداد میں ایرپورٹ پر استقبال کے لئے آئے تھے) ایک زنانہ اسکول میں خطاب، پاریکھ صاحب کے درس قرآن کے شرکاء سے خطاب اور کامٹی کے ایک جلسۂ عام میں تقریر شامل ہے۔

ناگپور سے میں اور مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی رفقائے سفر کے ساتھ برہان پور گئے، جہاں شب میں مسلمانوں کے ایک بڑے جلسہ میں خطاب کیا گیا، اور پرسنل لا بورڈ کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی، اگلے دن وہاں کے علماء اور سربرآوردہ حضرات کے مشورہ سے قاضی شہر مقرر کرنے کا موقعہ ملا، مولانا تو وہاں سے پٹنہ

کے لئے روانہ ہوگئے، میں اپنے چند رفقاء کے ساتھ قصبہ دھارنی گیا، جو مہاراشٹر میں مدھیہ پردیش کی سرحد پر واقع ہے، یہاں کچھ عرصہ پیشتر ایک عربی مدرسہ بھی قائم کیا گیا، اور پیام انسانیت کے لئے فضا بھی تیار ہوئی، غیر مسلم باشندگانِ قصبہ نے ایک بڑی تعداد میں ہم لوگوں کا استقبال کیا، پھر پیام انسانیت کے نام اور نسبت پر ایک بڑے جلسہ کا اہتمام کیا، جس میں بڑے اچھے جذبات اور خیالات کا اظہار کیا گیا، اور اس سے ان اطراف میں کام کی زمین تیار نظر آئی۔

پونہ

ناگپور کے ڈائلاگ میں ہمارے ایک عزیز دوست انیس چشتی صاحب بھی شریک تھے، انھوں نے آئندہ ڈائلاگ کے لئے پونہ کی دعوت دی، جو (غالباً ہندو احیائیت اور فرقہ وارانہ ذہنیت کا صرف مہاراشٹر میں نہیں ہندوستان میں سب سے بڑا مرکز ہے) انیس چشتی صاحب ایم، اے، بی ایڈ پونہ کے مولیدینہ جونیر کالج میں اردو کے لکچرر ہیں، ان کی دل چسپی کا خاص میدان اردو خطاطی ہے، وہ اردو کتابت کو کمپیوٹرائز کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو قوتِ عمل اور تنظیمی صلاحیت سے نوازا ہے، ڈائلاگ کے لئے ۲۱ فروری ۱۹۸۷ء کی تاریخ مقرر ہوئی، انیس صاحب نے اس ڈائلاگ کو کامیابی کے مراحل تک پہونچانے کے لئے غیر معمولی جدّوجہد کی، انھوں نے پہلے مرحلہ میں اپنے شاگردوں کی مدد سے اپنے ہاتھ سے ڈیڑھ ہزار[۱۵۰۰] خطوط لکھ کر پیام انسانیت کے تعارفی واؤچر کے ساتھ پونہ کے بڑے اداروں، سرکاری اور غیر سرکاری افسران، کارپوریٹرز،

ممبران اسمبلی، وزراء اور سماجی و تعلیمی کارکنوں کو روانہ کیے، اس خط پر ان کے علاوہ متعدد غیر مسلم معززین، سماجی کارکنوں، نیز اہم مسلمان شخصیتوں کے دستخط تھے، دوبارہ ڈائلاگ کی اہمیت وافادیت اور موضوع کے بارہ میں ان اصحاب کو مطلع کیا گیا، جن کی طرف سے حوصلہ افزا جوابات آئے تھے، ذاتی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا گیا، پریس، پولیس، سیاست دانوں سے رابطہ بھی قائم رکھا گیا، متعدد ہندی، مرہٹی اور انگریزی اخبارات، نیز ریڈیو اور ٹی، وی نے اس بارہ میں تعاون اور دلچسپی کا اظہار کیا، آریہ سماج کے سابق صدر اور لائنز کلب کے سکریٹری مسٹر اوجول ناوڑے نے ڈائلاگ کو کامیاب بنانے میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا۔

جلسہ

راقم نے اس جلسہ کے لئے اپنا کلیدی مضمون "ملک کے بہی خواہوں کے سوچنے اور کرنے کی باتیں" کے عنوان سے تیار کر لیا تھا، ۱۲ر فروری کو ٹھیک ۶ بجے مرہٹہ چیمبرس آف کامرس پونہ کے ہال میں (MAHARASHTRA HERALD) کے ایڈیٹر مسٹر ایس۔ ڈی واگھ (S. D. WAGH) کی صدارت میں جلسہ کا آغاز ہوا، مسٹر اوجول ناوڑے نے جلسہ کو کنڈکٹ کیا، سید حامد صاحب نے جو دہلی سے تشریف لائے تھے، انگریزی میں مناسب و مؤثر انداز میں صاحبِ مقالہ کے خاندانی ماحول اور اس کے تاریخی پس منظر کو بیان کیا، اور واضح الفاظ میں کہا کہ "مولانا اگر چاہتے تو آرام کے ساتھ کسی گوشہ میں اپنا علمی و تصنیفی کام کر سکتے تھے، مگر حقائق

وحالات نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ مسلم اور غیر مسلم دانشوروں اور سماجی کام کرنے والوں کے ساتھ مل بیٹھ کر معاشرہ اور ملک کو تباہی اور اس کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے جس پر ہم سب سوار ہیں، بے تکلفانہ تبادلۂ خیال کریں اور اس بُحران (CRISIS) سے کامیابی سے گذر جانے کی تدبیریں سوچیں، مقالہ کا ترجمہ مرہٹی اور انگریزی میں تیار تھا جو حاضرین میں تقسیم کر دیا گیا، ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا، اور سب ہمہ تن گوش اور سراپا توجہ تھے۔

مقالہ کے اہم نکات

مضمون میں سب سے پہلے معتدل اور پُرسکون فضا کی اہمیت وضرورت بتائی گئی تھی، جو ہر تعمیری، اصلاحی، علمی وادبی یہاں تک کہ دینی اور مفید سیاسی کام کے لئے شرط ہے، اور جس کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا، پھر ملک و معاشرہ پر ایک حقیقت پسندانہ نظر ڈالی گئی، اور اس کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیا گیا اور صفائی سے کہا گیا کہ اس وقت انسانی اور اخلاقی قدریں بالکل بے اثر ہو گئی ہیں، بڑی خرابی یہ ہے کہ آدمی اپنا کام نکال لینا چاہتا ہے، اور ہماری یو۔پی کی زبان میں "اپنا اُلّو سیدھا کر لینا چاہتا ہے" چاہے کسی کی جان جائے، یا کسی کے بچے مر جائیں، انسان انسان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے، اس کی جان، عزّت، کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں رہ گئی، پھر صفائی سے کہا گیا کہ ان حالات میں مُلک رہیگا نہیں، چاہے اس کی پُشت پر امریکہ ہو، چاہے روس ہو، اگر اپنا گھر ہم خود بگاڑ دیں گے تو کوئی دوسرا اس کو سنبھال نہیں سکتا، اپنا گھر اپنے ہی ہاتھ سے بنتا ہے۔

وحشتیں وحشتوں ہی سے نہیں ٹکراتیں، وحدتیں بھی وحدتوں سے ٹکراتی ہیں،
وہ وحدت (UNIT) جس کی اساس غلط ہو، جو اخوّتِ انسانی اور عبودیت ربانی
(خدا کی بندگی اور غلامی) پر قائم نہیں، جو حقوق و فرائض کی صحیح تقسیم و توازن،
خوف خدا، اور انسانی جان و مال کے احترام پر قائم نہیں، وہ وحدت خطرناک ہے،
جو دانہ اپنی لڑی سے جدا ہو وہ اپنے حدود میں محدود نہیں رہتا وہ ٹکرائے گا ضرور،
پیغمبروں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ یہ دانے انسانیت کی لڑی میں پروئے رہیں،
ٹوٹنے نہ پائیں، شیطان نے کوشش کی کہ یہ دانے بکھریں اور ایک دوسرے سے
ٹکرائیں، ہر فرد کی قسمت دوسرے فرد سے وابستہ ہے، اگر کوئی خرابی کسی معاشرہ
(سوسائٹی) یا ملک میں پیدا ہو اور آدمی سمجھے کہ ہماری بلا سے! ہم تو اس سے
محفوظ ہیں، اگر فلاں شہر میں، ملک کی ایک ریاست میں آدمی آدمی کو مار رہا ہے،
لوگوں کے گھر جلائے جا رہے ہیں، بیکس و تنہا مسافر کو چھرا گھونپا جا رہا ہے تو کیا حرج
ہے؟ تو اس معاشرہ یا ملک کا انجام وہ ہو گا جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے
ایک کشتی کی مثال دے کر بیان کیا اور جس کی مثال مجھے اصلاحی ادب ہی میں نہیں
ادبیات انسانی (WORLD LITERATURE) میں بھی نہیں ملی۔

آپ کی دی ہوئی مثال کو کھول کر بیان کیا جائے تو یوں کہا جائیگا کہ اس کشتی
میں دو طبقے ہیں، ایک بالائی (UPPER CLASS) ایک زیریں LOWER CLASS،
کچھ مسافر اوپر کے طبقہ میں ہیں جن کو ہم بالانشین (UPPER CLASS PASSENGERS)
کہہ سکتے ہیں، کچھ حصۂ زیریں کے لوگ ہیں جو عام طور پر غریب غرباء ہوتے ہیں، میٹھے پانی
کا انتظام اوپر کیا گیا ہے (اپر کلاس والوں کی رعایت بھی زیادہ کی جاتی ہے) نیچے والے

مجبور ہیں کہ پانی لینے اوپر جائیں، پانی کی فطرت ہے کہ چھلکتا ہے، اچھلتا ہے، پھر کشتی خود ایک متحرک چیز ہے، ان لوگوں کی ہزار احتیاطوں کے باوجود پانی چھلکتا ہے، پانی پہچانتا نہیں کہ فلاں امیر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، یہ نواب صاحب کے کپڑے پھیلے ہوئے ہیں، ایک مرتبہ ہوا دو مرتبہ ہوا، چار مرتبہ ہوا، آخر میں اپر کلاس کے ان مسافروں سے برداشت نہیں ہو سکا، انھوں نے کہا صاحب! یہ تماشہ ہم نہیں دیکھ سکتے، پانی یہ لے جائیں اور پریشان ہم ہوں، ہم پانی نہیں لے جانے دیں گے، نیچے والوں نے کہا کہ پانی کے بغیر تو گذارا نہیں، اب ہم اگر اوپر سے پانی نہیں لا سکتے تو ہم کشتی میں نیچے ہی سوراخ کر لیتے ہیں، بیٹھے بیٹھے ہی اپنے برتنوں میں پانی بھر لیا کریں گے، ہمیں کسی کا احسان نہیں لینا پڑے گا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر ان بالا نشینوں کی عقل پر پتھر نہیں پڑے ہیں، اور ان کی شامت نہیں آئی ہے تو وہ خوشامد کریں گے، ہاتھ پکڑیں گے اور کہیں گے کہ نہیں بھائی! تم اوپر ہی سے پانی لے جاؤ لیکن خدا کے لئے یہ غضب نہ کرو کہ نیچے نیچے سوراخ کر لو، اس لئے کہ کشتی ڈوبے گی تو پھر سب کو لے کر ڈوبے گی، نہ اوپر والے بچیں گے نہ نیچے والے۔

آج ہمارے ملک کی کشتی میں کتنے سوراخ کئے جا رہے ہیں، ہر شخص اپنی محدود غرض کو دیکھتا ہے، اس نے دوسروں سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں، ہم بھی اس حقیقت سے اگر آنکھیں بند کر لیں گے کشتی میں کسی دوسری جگہ سوراخ ہونے سے ہمارا کیا بگڑتا ہے، تو پھر اس کشتی کی خیر نہیں۔

پھر اس مضمون میں صوفیائے کرام کے کچھ اقوال پیش کئے گئے جن پر عمل کر کے ہم پھر امن وسکون، باہمی اعتماد واحترام اور لطف ومسرت کی زندگی

گذار سکتے ہیں، اس سلسلہ میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا یہ مقولہ پیش کیا گیا کہ "دیکھو اگر کسی نے ایک کانٹا رکھا اور تم نے بھی کانٹا رکھ دیا تو کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے، اور اگر اس نے کانٹا رکھا اور تم نے پھول رکھا تو پھول رکھے جانے شروع ہو جائیں گے، کانٹے کا علاج کانٹا نہیں ہے، کانٹے کا علاج پھول ہے" ایک مرتبہ فرمایا کہ "لوگوں کا اصول تو یہ ہے کہ ٹیڑھے کے ساتھ ٹیڑھا اور سیدھے کے ساتھ سیدھا، اور ہمارا اصول یہ ہے کہ سیدھے کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھے کے ساتھ بھی سیدھا۔"

بادشاہوں، فاتحین عالم اور مادی طاقت رکھنے والوں کا اس اصول پر عقیدہ و عمل تھا کہ "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" اور اہل محبت کا اس اصول پر عمل تھا کہ "بانس بھی رہے اور بانسری بھی" صرف اس کا نغمہ بدل جائے، اس سے پہلے اس سے نفرت و عداوت کے گیت نکلتے تھے، اب محبت اور تشکر و اعتراف کے گیت نکلنے لگیں، خواجہ فریدالدین شکر گنجؒ کے کوئی معتقد آپ کی خدمت میں اپنے شہر کا مشہور تحفہ قینچی لے گئے، حضرت نے دیکھ کر فرمایا کہ "ہمارا کام ٹوٹے ہوئے دلوں کے جوڑنے اور لوگوں کو لوگوں سے ملانے کا ہے، توڑنے اور پھاڑنے کا نہیں، ہمارے لئے قینچی کے بجائے سوئی کا تحفہ لائے ہوتے تو مناسب تھا۔"

پھر عرض کیا گیا کہ تاریخ بتاتی ہے کہ کسی قوم کا اخلاقی زوال پہلے شروع ہوتا ہے، سیاسی زوال بعد میں آتا ہے، ہندوستان آج اسی منزل سے گذر رہا ہے، وہ شدید اخلاقی زوال سے دوچار ہے، اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اتنے لمبے چوڑے ملک میں کنیا کماری سے لے کر سری نگر تک کوئی آواز بلند کرنے والا نہیں کہ اخلاق درست کرو، انسانیت کا سبق پڑھو، ملک کو بچاؤ، یہ کہنے والے ہزار ہیں کہ ہماری پارٹی برسر آئے،

فلاں کی قیادت تسلیم کرو، اس کا شکوہ نہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، غلط ہو رہا ہے، سب کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ غلط صحیح ہوتا ہے، ہمارے جھنڈے کے نیچے اور ہمارے زیر اقتدار ہو، کوئی خدا لگتی سچی بات کہنے والا، دکھتی رگ پکڑنے والا، بیماری کی جگہ پر انگلی رکھنے والا، اپنے فرقہ اور اپنی جماعت پر بے باک تنقید کرنے والا، اس کو غلطی پر ٹوکنے والا موجود نہیں، جو کھڑا ہوتا ہے، دوسرے فرقہ یا جماعت یا حلقہ کو بڑی فیاضی سے مشورہ دینے لگتا ہے، ہر ایک اپنے طبقہ کے بارہ میں ہوشیار، اور لائق وکیل (ADVOCATE) اور دوسرے طبقہ یا فرقہ کے بارہ میں تھانہ دار اور خدائی فوجدار (PUBLIC PROSECUTOR) نظر آتا ہے۔

میں ایک مذہبی انسان اور تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ہمارے گناہ اور ظلم کے نتیجہ میں آسمانی آفتیں آتی ہیں، خدا یہ دکھاتا ہے کہ مارنے کا سامان ہمارے پاس تم سے زیادہ ہے، جب بھی ظلم کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو میں ڈر جاتا ہوں کہ کوئی قدرتی تازیانہ انسانوں کی طرف نہ بڑھے۔

آخر میں مایوسی اور منفی طرز فکر سے بچانے کے لئے کہا گیا کہ:۔

"خدا کا شکر ہے ہمارا ملک سویا ہے، مرا نہیں ہے، سویا ہوا جگایا جا سکتا ہے، لیکن مرا ہوا جلایا نہیں جا سکتا، ہم کئی بار سوئے کئی بار جاگے، یہ انسانیت کئی بار سوئی کئی بار جاگی، اور جاگی تو ایسی جاگی کہ اپنے سونے کی سب تلافی کر دی"۔

ایک گھنٹہ کا یہ مقالہ بڑے سکون و توجہ سے سنا گیا، درمیان درمیان میں زور زور سے تالیاں بجا کر سامعین اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کرتے، آخر میں صدر جلسہ مہاراشٹر ہیرلڈ کے ایڈیٹر مسٹر ایس، ڈی واگھ نے صدارتی تقریر کی جس میں مقالہ کے مرکزی مضمون

اور روح کی پر زور تائید کی گئی، اور کہا گیا کہ "حالات سنگین ضرور ہیں لیکن مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، اگر انسانیت کا یہ پیغام دیہاتوں دیہاتوں پہونچایا جائے تو اس کے حوصلہ افزا نتائج نکلیں گے، مولانا صاحب جیسے انسانوں کی ہمارے سماج کو بہت ضرورت ہے"!

مسٹر واگھ کی تقریر کے بعد حاضرین ڈنر کے لئے اٹھ گئے، کھانے کے دوران بڑی تعداد میں لوگ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے رہے، شہر کے معززین، جماعتوں کے قائدین اور دوسرے فرقوں کے ذمہ دار شریک محفل اور یک زبان تھے، دوسرے دن ریڈیو نے ساڑھے سات منٹ تک ڈائلاگ کے اقتباسات نشر کئے، اور جلسہ کی کارروائی دی، انگریزی، مرہٹی اور ہندی اخبارات نے صفحۂ اول پر تصویر کے ساتھ جلسہ کی کارروائی نشر کی، اور مقالہ کے اہم حصے شائع کئے۔

دوسری مجالس

پونہ میں ہمارا قیام تین دن رہا، ان تین دنوں میں پونہ کالج، طلبیہ کالج، مولدینہ ہائی اسکول، الشبان المسلمین، عرب طلبہ، گیان پربودھنی، مسجد مومن پورہ، مسجد تنبولیان میں خطابات ہوئے۔

مومن پورہ میں عوامی اجتماع کے علاوہ آر، ایس، ایس کے ادارہ، گیان پربودھنی کے طلبہ اور ذمہ داروں سے بھی خطاب ہوا، ایک پروگرام قیام گاہ سے متصل مقامی ہائی اسکول میں تعلیمی و تربیتی موضوع سے متعلق تھا، پونہ کالج کے ہال میں مسلم ایڈوکیٹس سے خطاب تھا، دو سو کے قریب وکلاء موجود تھے، ان کو یاد دلایا گیا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد تحریک آزادی

بلکہ تعلیمی، تعمیری اور سماجی تحریکوں کی قیادت زیادہ تر قانون داں طبقہ نے کی، اس لئے کہ قانون سے واقفیت نے ان کے اندر خود اعتمادی اور جرءت پیدا کر دی تھی، تحریک آزادی کے نمایاں ترین قائدین مسلم وغیر مسلم قانون داں طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، مسلمانوں میں بھی مسلم وکلاء تعلیمی و سماجی کام کے میدان میں پیش پیش تھے، اس سلسلہ میں مقرر نے شمالی ہند کے ممتاز قومی کارکن قاضی محمد عدیل عباسی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ذاتی جدوجہد سے دینی تعلیم کے لئے خود کفیل مکاتب بڑی تعداد میں قائم کئے، پھر ہندوستان کے تمام علماء اور سماجی کارکنوں کو جمع کر کے اس کام کی اہمیت اور نئے نصابِ تعلیم اور سرکاری اسکولوں پر انحصار کرنے سے آئندہ نسل کے ذہنی اور تہذیبی ہی نہیں، اعتقادی اور ایمانی ارتداد کا جو خطرہ واقعہ بن کر سامنے آگیا ہے، اس سے خبردار کیا، اور اتر پردیش میں وہ عظیم دینی تعلیمی تحریک چلی جس کے نتیجہ میں دس ہزار کے قریب خود کفیل اسلامی مکاتب قائم ہوئے جن میں ہزاروں طلبہ تعلیم پاتے ہیں، افسوس ہے کہ اب وکلاء اپنے پیشہ میں اتنے مصروف ہو گئے ہیں، کہ انھوں نے مفید تحریکات کی قیادت اور عوام سے اپنا رابطہ ختم کر لیا، اب یہ طبقہ اپنے کو کامیاب بنانے اور زندگی کے معیار کو بلند کرنے میں ایسا مصروف ہے کہ اجتماعی جدّوجہد اور عوامی قیادت میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے، آپ کی وابستگی مسلم معاشرہ سے بہر حال رہے گی، اگر یہ معاشرہ پُرامن اور خوش حال ہے تو آپ بھی عزت و آرام اور امن و سکون سے رہیں گے، اگر یہ معاشرہ خطرہ میں ہے، اور معاشرہ کے تعلقات ایک دوسرے سے صحیح نہیں ہیں، تو آپ بھی محفوظ نہیں رہ سکتے، ملک آپ کی اخلاقی رہنمائی کا منتظر ہے، اخلاقی، روحانی اور سماجی خدمات کا میدان خالی ہے، اس ملک میں اگر مسلمانوں کو

عزت و قیادت مل سکتی ہے، تو وہ خدمت کے میدان ہی سے مل سکتی ہے۔

آپ کا ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ اسلام کے قوانین کا گہرائی سے مطالعہ کریں، اور اپنے مضامین و مقالات سے بارالیسوسی ایشن عدالتوں اور علمی مجالس و سیمینارس میں ثابت کریں کہ ان کے اندر زمانہ کے تقاضوں کی تکمیل کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے، کوئی دن خالی نہیں جاتا کہ انگریزی اور ہندی اخبارات میں اسلام اور اسلامی قوانین کے خلاف کوئی مضمون، اداریہ یا مراسلہ نہ شائع ہوتا ہو، آپ اس پر نظر رکھیں اور ہر وقت ان کا نوٹس لیں، مسلم پرسنل لا کی برتری اور زندگی کے تقاضوں کے ساتھ اس کی فطری ہم آہنگی کو ثابت کریں۔[1]

---

[1] پونہ کے ڈائلاگ اور سفر کی روئیداد میں مولوی نذر الحفیظ ندوی کے اس سلسلۂ مضامین سے استفادہ کیا گیا، جو "تعمیر حیات" مارچ ۱۹۸۷ء میں بالاقساط شائع ہوا۔

بابِ ہشتم

رابطۂ ادب اسلامی کے اجلاس

مولانا حسرتؔ موہانی مرحوم کا مشہور شعر ہے ؎

ایک طرفہ تماشہ ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی
ہے مشق سخن جاری، چکّی کی مشقّت بھی

راقم سطور اس حد تک "اجتماع ضدّین" کا دعویٰ نہیں کرسکتا، اس کو کبھی جیل جانے اور چکّی کی مشقّت برداشت کرنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدّعی کے واسطے دارورسن کہاں؟

لیکن خاندانی اثرات اور جس گروہ اور ادارہ (ندوۃ العلماء) سے وابستگی اور انتساب ہے، اس کا یہ اثر ضرور پڑا کہ سفروں اور دوروں کی کثرت، ملک و ملّت کے حالات و مسائل سے گہری دلچسپی اور فکرمندی، "پیام انسانیت" کی دعوت، مشترک اجتماعات اور ڈائلاگس کی مصروفیت کے ساتھ اس کو اپنے عہد کے ادبی رجحانات اور تحریکات کے مطالعہ اور ان کے مسلمانوں کی نئی نسل اور علم وادب سے اشتغال رکھنے والے حلقوں کے ذہن پر منفی و مثبت اثرات کا جائزہ لیتے رہنے، ادب و شاعری اور فکر و تحقیق کے دین و اخلاق سے آزاد ہوجانے،

بلکہ ان کے خلاف محاذ آرائی اور نبرد آزمائی کے مضمرات وخطرات سے آگاہ رہنے، اور ان کا نوٹس لینے سے کبھی فرصت نہیں ہوئی اور اس کو اس نے کبھی نظر انداز نہیں کیا، اسی مطالعہ اور جائزہ اور اسی ادراک وشعور نے گوناگوں ذمہ داریوں اور مصروفیتوں کے ساتھ عالمی رابطۂ ادب اسلامی کی صدارت اور ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ کیا جس کا تذکرہ اس جلد کے ابتدائی صفحات میں تفصیل سے گذر چکا ہے۔

رابطۂ ادب اسلامی کا جلسہ ندوۃ العلماء میں

۷،۸،۹ جنوری ۱۹۸۶ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء میں رابطۂ ادب اسلامی کی پہلی کانفرنس ہوئی، اس میں رابطہ کے دستور اساسی کو آخری شکل دی گئی، تنظیمی انتخابات ہوئے اور خاکسار کو تاحیات اس کا صدر منتخب کیا گیا، اور تمام مندوبین نے ندوہ کے اساتذہ، کارکنان اور طلبہ کا شکریہ ادا کیا، اس موقعہ پر ایک شعری نشست میں عرب شعراء خاص طور سے ڈاکٹر علی رضا عدنان نحوی اور ڈاکٹر عبد القدوس ابو صالح نے منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا۔

اس کانفرنس میں عالم عربی کے معروف ادیب و شاعر عمر بہاء الامیری خاص طور سے شریک ہوئے، افتتاحی اجلاس میں بڑی پرجوش تقریر کی، مقالات کی نشست میں مقالہ بھی پیش کیا، پاکستان میں ایک عرصہ تک سفیر رہنے کی وجہ سے وہ اردو بھی جانتے ہیں اور اقبال کے کچھ اشعار کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے، قطر کے احیاء التراث الاسلامی کے ڈائرکٹر شیخ عبد اللہ ابراہیم انصاری بھی خاص طور سے شریک ہوئے،

ان کے علاوہ سعودی عرب، قطر، بحرین، یمن، مصر، شام، فلسطین، حبشہ، مراکش اور بنگلہ دیش کے ادباء، شعراء، اہلِ قلم اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ شریک ہوئے، ہندوستان سے مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، دہلی یونیورسٹی، بنارس یونیورسٹی، الٰہ آباد یونیورسٹی، کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالا، دار المصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ العلماء کے اساتذۂ ادب شریک ہوئے۔

اس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں، میں نے "ہندوستان کا اسلامی ادبی اسکول" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا، عرب ممالک اور دوسرے اسلامی ممالک میں بدقسمتی سے دینی عنصر ادب کے میدان سے دور ہو گیا ہے لیکن ہندوستان کا اردو ادب اس سے مستثنیٰ ہے، یہاں اللہ کا کرم ہے، اردو زبان و ادب کے اساطین وہی رہے ہیں، جو اسلامی علوم و فنون میں بھی ممتاز مقام رکھتے تھے، میں نے اپنے مختصر مقالہ میں علامہ شبلی، مولانا حالی، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال اور دوسرے ادباء و شعراء کے مختصر تذکرے میں ان کی اسلامیت کی طرف اشارے کیے، اور عرب حاضرین اس سے خاص طور سے متاثر ہوئے، اس تاثر کا اثر اب تک باقی ہے، چنانچہ ادب اسلامی جے پور کے سیمینار میں عربوں نے اردو کے ذخیرۂ ادب اسلامی کے عربی ترجمہ کا مطالبہ کیا۔

ندوۃ العلماء کے بانیوں اور اس کے خدّام کے اخلاص کی برکت ہے کہ رابطۂ ادب اسلامی کی قیام اور اس کی پہلی کانفرنس عالم عربی سے بہت دور لکھنؤ میں ہوئی، میں نے اس کانفرنس کے مندوبین کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہندوستان میں ایشیائی تنظیم کا اجلاس ہو، یا غیر جانبدار ممالک کا کوئی اجتماع ہو،

یہ تعجب کی بات نہیں، تعجب خیز بات یہ ہے کہ ادب اسلامی کی ایک بین الاقوامی تنظیم قائم ہو جس میں عرب ممالک کے چوٹی کے اساتذہ و ماہرین فن شریک ہوں، اس کی پہلی کانفرنس ہندوستان میں ہوا اور اس کا صدر دفتر بھی یہیں قائم ہو، یہ محض اللہ کا فضل ہے، اور اس ادارہ کے بانیوں اور خادموں کی مخلصانہ کوششوں کا ثمرہ۔"

جامعۂ ہدایت جے پور میں رابطہ کا سیمنار

۲۲ ر ۲۳ ر جون ۱۹۸۶ء میں رابطۂ ادب اسلامی کی مجلسِ اُمناء (BOARD OF TRUSTEES) کی جو نشست استنبول (ترکی) میں ہوئی، اس میں ۱۹۸۶ء میں ادب اسلامی کی ہندوستانی شاخ نے ہندوستان کے کسی مقام پر "اسلامی ادب اور مغربی وادبی تحریکات" کے موضوع پر ایک سیمنار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا، اس کے لئے ہندوستان کے متعدد مقامات زیر غور آئے، لیکن مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب مجددی بانی جامعۂ ہدایت جے پور کی دعوت کی بناء پر اور ان کے احترام میں جے پور کو ترجیح دی گئی، اور ۱۷ ر ۱۸ ر فروری ۱۹۸۶ء کو وہاں سیمنار منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

راجستھان کی راجدھانی جے پور میں (جو خود ہندوستان کا ایک تاریخی اور خوبصورت شہر ہے) ۷ ر اکتوبر ۱۹۷۶ء میں جے پور شہر سے چند میل کے فاصلہ پر شاہ صاحب نے اپنے جد بزرگوار حضرت مولانا شاہ ہدایت علی صاحب مجددی کی یادگار میں ان کے نام پر جامعۂ ہدایت کی بنیاد ڈالی، تینوں طرف سے خشک پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی سرسبز و شاداب وادی میں (جو حجازی کی پہاڑیوں

اور روادیوں کی یاد تازہ کرتی ہے) دسمبر ۱۹۸۹ء میں اس جامعہ کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا تھا، جس میں دوسری ریاستوں کے بھی ممتاز علماء، ماہرین تعلیم و دانشور جمع ہوئے تھے، اس موقعہ پر جب اس "وادی ہدایت" میں راقم نے قدم رکھا تھا، جس کو اس عام اجلاس کی صدارت کے فرائض بھی انجام دینے تھے، تو اس منظر کو دیکھ کر کہ پہاڑوں کے درمیان ایک غیر آباد علاقہ میں خدا کے ایک مخلص بندہ اور صاحبِ عزیمت انسان کی عالی نظری اور اولوالعزمی کے طفیل جامعۂ ہدایت کی شاندار عمارت کھڑی ہوئی ہے، بے اختیار مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم کا یہ شعر زبان پر آگیا، اور اسی سے راقم نے اپنی تقریر کا آغاز کیا ؎

عزمِ راسخ ہے نشانِ قیس و شانِ کوہ کن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار

اب یہ وادی وادیٔ علم و ہدایت بن گئی ہے، اور جامعہ کی وسیع، شاندار اور خوبصورت عمارتوں اور وہاں رہنے والے طلبہ و اساتذہ کی وجہ سے "جنگل میں منگل" کا سماں نظر آتا ہے۔

اس مذاکرۂ علمی کا اہتمام رابطہ کی ہندوستانی شاخ نے کیا تھا، اور صرف ہندوستانی اہل قلم اور اساتذۂ ادب کو دعوت دی گئی تھی، لیکن رابطۂ ادب اسلامی کے عرب ممالک کے دفتر (ریاض سعودیہ عرب) کی طرف سے جامعۃ الامام محمد بن سعود یونیورسٹی کے ادب عربی کے پروفیسر اور رابطہ کے نائب صدر ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح سیمینار میں شرکت کے لئے جے پور

تشریف لائے، وہ مذاکرۂ علمی کی کارروائیوں میں اول سے آخر تک شریک رہے، مذاکرات وبحث ومباحثہ میں حصہ لیا، تقریر بھی کی اور اپنا قصیدہ بھی سنایا، نوٹس بھی لیتے رہے اور بڑے ممنون ومسرور واپس ہوئے، تقریباً پچاس کی تعداد میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذۂ ادب اور دوسرے اہلِ قلم شریک ہوئے، وادیٔ ہدایت کے روح پرور ماحول اور ایک بزرگ کی سرپرستی اور توجہ نے اس میں "نورٌ علیٰ نور" کا کام کیا، مندوبین دور دراز مقامات سے سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے اپنے خرچ سے آئے تھے، اور انھوں نے بڑے ذوق وشوق اور یکسوئی کے ساتھ (جو اس وادی ہدایت میں اختیاری واضطراری دونوں طور پر حاصل تھی) آخر تک شریک رہے۔

اس اجلاس کی پانچ نشستیں ہوئیں، پہلی نشست میں عزیزی مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی (سکریٹری رابطہ) نے رابطۂ ادب اسلامی ہند کی رپورٹ پڑھ کر سنائی اور کام میں جو پیش رفت ہوئی اور جو کام پیش نظر ہیں، اس سے آگاہ کیا، صدر مجلس استقبالیہ (مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب) کی جانب سے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا گیا، اس میں ادب کی قوت اور اثر آفرینی کی وضاحت کے ساتھ أفصح العرب والعجم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام سے چند شہ پاروں کا حوالہ دینے کے بعد فرمایا گیا کہ "ہم کو دیکھتے رہنا چاہئے کہ انسان کی خوبیوں اور صالح قدروں کو تباہ کرنے کے لئے کہاں کہاں اور کیا کام ہو رہا ہے؟" پھر آپ نے مغرب سے درآمد کئے ہوئے رجحانات ونظریات کی طرف اشارہ کیا۔

سیمنار کی نشستوں میں بڑی تعداد میں جو مقالات پڑھے گئے، ان میں سے

چند کے موضوعات لکھے جاتے ہیں، تاکہ ان سے سیمنار کے بحثوں کی رنگارنگی اور فکر و نظر کے دائرہ کی وُسعت و شادابی کا اندازہ ہو۔

"تیرہویں صدی میں اسلامی ادب کی اردو میں نمائندگی" از ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی سابق پروفیسر اُمّ القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ، اس میں حضرت محسن کاکوروی کے قصیدہ مدیح خیر المرسلینؐ کی فکری و فنّی خوبیوں کو نمایاں کیا گیا، اور اعتراضات کا جائزہ لیا گیا، "مغربی ادب کے خدّوخال اور اسلامی ادب" از ڈاکٹر محمد راشد ندوی صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ "عربی اسلامی ادب اور تحقیق نصوص کا مغربی فن" از ڈاکٹر عبدالباری شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ "مغربی ادبی تحریکوں کا نظریاتی پس منظر" از ڈاکٹر محمد محسن عثمانی ندوی، ریڈر نہرو یونیورسٹی دہلی "اسلامی ادب اور کچھ دوسرے ادبی نظریئے" از مولوی سعید الرحمٰن ندوی "اسلامی ادب اور جدید ادبی تحریکیں" از سید محی الدین سابق ڈپٹی سکریٹری حکومت یو.پی "اسلامی ادب اور رومانی ادب کا تقابلی مطالعہ" از ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی، صدر شعبۂ عربی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد "اشتراکیت نے ادب کو کیا نقصان پہونچایا؟" از ڈاکٹر مظفر احمد صدیقی ندوی ریڈر شعبہ اردو، ہندو یونیورسٹی بنارس، عربی مقالہ "موقف الادب الاسلامی من الجنس" (جنس کے بارہ میں اسلامی ادب کا رویّہ) از ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح "جدید مغربی ادبی مکاتب خیال پر تنقید" از پروفیسر ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی (نہرو یونیورسٹی دہلی) عربی مقالہ "الإنسان فی العلم الحدیث وموقف الأدب الاسلامی" از سید

جعفر مسعود ندوی "الأدب الرومانيتكي والأدب الإسلامي" از فرید احمد ندوی "اسلامی ادب میں مستشرقین کی خدمات" از صاحبزادہ شوکت علی خاں، ڈائرکٹر عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹیٹیوٹ، ٹونک "وجودیت کا ادبی تجزیہ" از محمد فیضان بیگ استاد جامعہ ملیہ، دہلی "اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بچوں کا ادب" از مولوی نذر الحفیظ ندوی "مغربی ادبی تحریکات کے مطالعہ اور تجزیہ کی ضرورت" از بہاء الدین سلیمان متعلم دار العلوم ندوۃ العلماء "آبادی کے تخمینہ کا جدید مغربی اصول اور مکی عہد کی مسلم آبادی" از ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی ندوی ریڈر شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

سیمنار کو مولوی نور عظیم ندوی نے بڑی خوبی سے کنڈکٹ کیا۔

مغربی فکر وادب کی بے راہ روی خامی و نارسائی کا بنیادی سبب

راقم نے اس سیمنار کی افتتاحی نشست کے آخر میں جو تقریر کی تھی، اور جس میں مغرب کے پورے فکر و فلسفہ پر ایک ناقدانہ تبصرہ تھا، وہ یہاں پیش کی جاتی ہے۔

"ایک چیز جو ہر وقت ہمارے سامنے اور کم از کم اس سیمنار میں پیش نظر رہنی چاہیئے، وہ یہ ہے کہ مغرب کی بے راہ رویوں، خامیوں اور نارسائیوں کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب ہے، نورِ نبوت سے محرومی، نبوت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو ظن و تخمین سے نکال کر یقین تک پہونچاتی ہے، اور مغرب اپنی تمام ترقیات اور تمام فتوحات کے باوجود اس پورے سفر میں نورِ نبوت سے محروم رہا"۔

قرآن مجید کی دو۲ آیتیں اس وقت مجھے یاد آ رہی ہیں جن میں مغرب کی صاف تصویر نظر آتی ہے، اور ان میں مغربی ذہن کی نقاب کشائی کی گئی ہے، عربی داں حضرات، ادبی ذوق رکھنے والے اور قرآن کی زبان و بیان سے مناسبت رکھنے والے ان آیتوں اور ان کے الفاظ کے آفاق و اعماق تک پہونچنے کی کوشش کریں گے، میں ان کا صحیح اور مکمل ترجمہ کرنے سے قاصر ہوں، ان دو۲ آیتوں میں ایک سورہ نمل کی یہ آیت ہے:۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ	بلکہ تھک کر گر گیا ان کا فکر آخرت
بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِّنْهَا ۖ بَلْ هُمْ	کے بارہ میں بلکہ یہ لوگ اس سے
مِّنْهَا عَمُونَ ○	شک میں مبتلا ہیں، بلکہ یہ اس سے
(سورۂ نمل۔ ۶۶)	اندھے ہو رہے ہیں۔

میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں، منزّل قرآن اور صاحبِ قرآن سے تو معذرت کی جرٔت نہیں کر سکتا، لیکن قرآن کی بلاغت اور قرآن کے اعجاز سے معذرت کے ساتھ میں "بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ" کا ترجمہ کرتا ہوں کہ ان کا علم پنکچر ہو گیا، آخرت کے بارہ میں، اور مجھے مغرب کی صورتِ حال اور اس کے علمی و اختراعاتی سفر کی اس سے بہتر تشبیہ نظر نہیں آتی کہ جیسے کوئی کار چل رہی ہو اور اچانک اس میں کوئی ایسا نقص پیدا ہو جائے کہ اس کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں، اس کے لئے پنکچر سے بہتر کوئی لفظ نہیں، ذرا دیکھئے اور غور کیجئے کہ وہ علم جو اچھا خاصا چل رہا تھا، اطمینان سے سفر طے کر کے آیا تھا، جس نے عقلیات پر، طبیعیات پر، ریاضیات پر، اور مابعد الطبیعیات تک میں

اپنی فکر کی جولانی اور ذہن کی تابانی دکھائی، وہی علم جب واجب الوجود کی ذات وصفات تک پہونچا، اور آخرت یعنی اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کے مرحلہ تک پہونچا تو "ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اچانک پہیہ سے ہوا نکل گئی، اس آیت کے بعد کے الفاظ میں مغرب کی مختلف ذہنی کیفیات یا مختلف طبقات کی تصویر نظر آتی ہے کہ "بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِّنْهَا" وہ اس کے بارہ میں شک میں مبتلا ہیں "بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُونَ" بلکہ وہ اس کے معاملہ میں بالکل بے بصر وبے بصیرت ہیں۔

دوسری آیت جس کو امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "النبوات" کی گویا اساس بنایا ہے، یہ ہے :۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ۔ (یونس۔۳۹)	بلکہ انھوں نے جھٹلا دیا ان چیزوں کو جن کا ان کے علم نے احاطہ نہیں کیا۔

مغرب کی یہ خام خیالی ہے کہ جو مشہود نہیں، وہ موجود نہیں، موجودات کو مشہودات میں محدود کرنا یہ علم انسانی اور عقل انسانی کی شدید کمزوری ہے، جسے مغرب نے علمی رنگ دے دیا ہے، اور یہ انسان کی بڑی بدقسمتی ہے، بلکہ انسانیت کے حق میں زیادتی ہے، اور فیض الٰہی سے محروم علم اور نبوت میں یہی فرق ہے، جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بہت ہی سادہ لفظوں میں بیان کیا ہے :۔

أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ط (الانعام۔۸۱)	تم مجھ سے کٹ حجتی اور بحث کر رہے ہو خدا کے بارہ میں؟ جبکہ وہ مجھے

ہدایت سے نواز چکا، جب وہ میرا
ہاتھ پکڑ کر اس راستہ پر لگا چکا تو
اس میں شک یا کلام کی گنجائش
کہاں؟

کوہ صفا کی تقریر کا حاصل بھی یہی ہے کہ آپ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) پہاڑ کی چوٹی پر تھے، اور لوگ نیچے وادی میں، آپ نے کہا اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک فوج چھپی بیٹھی ہے اور وہ کسی آن حملہ کر سکتی ہے تو کیا آپ لوگ میری تصدیق کریں گے؟ عرب فلسفہ و تمدن میں مغرب سے پیچھے تھے، لیکن عقل سلیم میں ان سے بہت فائق ثابت ہوئے، انھوں نے دیکھا کہ بات ایک ایسا شخص کہہ رہا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر ہے، آگے بھی دیکھ سکتا ہے، اور پیچھے بھی دیکھ سکتا ہے، پھر وہ کبھی غلط بات بھی نہیں کہتا، انھوں نے صفائی کے ساتھ کہہ دیا ہم ضرور تصدیق کریں گے! وہ عرب اپنی سلامتِ فہم سے وہاں پہونچ گئے، جہاں یونان وروم نہیں پہونچ سکے اور جہاں مغرب آج تک نہیں پہونچ سکا، انھوں نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ محض اس بنیاد پر جھٹلانے کا کوئی جواز نہیں کہ ہم نہیں دیکھ سکتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مغربی افکار و نظریات اور اسلامی حقائق و عقائد کے درمیان جب بھی تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس فرق کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیئے، اس کے بغیر وہ سر رشتہ ہمارے ہاتھ نہیں آئیگا جس سے ہم اصل حقیقت تک پہونچ سکیں"!

دنیا کی علمی، فکری اور ادبی قیادت مسلمانوں کا منصب و فریضہ

سیمنار کی آخری نشست میں جو اختتامی تقریر کی گئی اس کے کچھ منتخب حصے یہاں پیش کیے جاتے ہیں[1] کہ اس میں ایک اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی اور بتایا گیا ہے کہ دنیا کی علمی و فکری قیادت امتِ اسلامیہ ہی کا منصب اور حق ہے، اور اس سے اپنے کو سبکدوش سمجھ لینے سے دنیا کو اور خود اس کو کیا نقصان پہونچے گا؟

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي	اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں
الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ (الانفال ۷۳)	فتنہ اور فساد کبیر برپا ہوگا۔

حضرات! نسل انسانی کی طرف زندگی کے استحقاق کو دوبارہ واپس لانے کی ذمہ داری اللہ نے اس چھوٹے سے مجموعہ (مہاجرین و انصار کی برادری پر جس کے افراد کی تعداد اس وقت ڈیڑھ دو ہزار انسانوں سے زیادہ نہ تھی) پر ڈالی ہے اور فرمایا ہے کہ دیکھو اگر تم نے اس وقت اخوت اسلامی کا رشتہ قائم نہ کیا، پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر دنیا کو ہلاکت کے غار سے دور لے جانے اور اس پوری نسل انسانی کو خودکشی سے باز رکھنے کی جدوجہد نہ کی، اس کے لئے ہاتھ پاؤں نہ مارے تو دنیا کی قسمت میں آخری شقاوت، ہلاکت و بربادی لکھ دی گئی ہے، تاریخ گواہ ہے کہ اس چھوٹی سی جماعت نے اس اہم ترین اور نازک ترین ذمہ داری کا حق ادا کر دیا۔

---

[1] کتاب میں شامل کرتے وقت اس برجستہ تقریر میں کچھ اضافہ اور تنقیح سے کام لیا گیا ہے۔

یہ سب کیسے ممکن ہوا؟ یہ اس وقت ممکن ہوا جب یہ جماعت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی اور اس نے دنیا کے سامنے زندگی کا ایک نیا نقشہ پیش کیا، اس کے ساتھ مجھے اجازت دیجئے کہ میں یہ کہوں کہ اس نے عالم انسانی کی اور نسل انسانی کی ایمانی و اعتقادی، علمی و فکری، ثقافتی و تمدّنی قیادت کی ذمہ داری قبول کی، حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر اُمّتیں دنیا کے نقشہ اور تقدیر انسانی میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتیں، جب تک وہ اپنے کو اس کا اہل ثابت نہ کریں کہ وہ ایمان و یقین کی دولت بھی دے سکتی ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کا ایک نیا نقشہ بھی پیش کر سکتی ہیں، اور صرف انسانی جسموں کو نہیں بلکہ انسانی ذہنوں کو، انسانی توانائیوں کو، انسانی صلاحیتوں کو، انسانی ذہانتوں کو، انسان کی تخلیقی طاقتوں کو اور اس کے ذوق و ادب کو بھی ایک نیا رُخ (صالح و تعمیری) دے سکتی ہیں۔

یہ چھوٹا سا مجموعہ جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کا اہل قرار دیا کہ وہ اب نسل انسانی کی کامل قیادت کرے گا، یعنی وہ دنیا میں صرف ایک معاشرہ کی بنیاد ہی نہیں ڈالے گا (خواہ وہ معاشرہ اپنے خصائص میں کیسا ہی ممتاز کیوں نہ ہو) بلکہ وہ اب پوری نسل انسانی کی فکری، ذہنی، علمی، ادبی، تعلیمی، تربیتی اور تمدّنی قیادت بھی کرے گا، اور اُس نے اس کو ثابت کر کے دکھا دیا، مسلمانوں نے صدیوں تک دنیا کے ایک بڑے حصہ کی نہ صرف سیاسی و انتظامی قیادت سنبھالی، بلکہ علمی و فکری قیادت بھی سنبھالی، کم سے کم ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کے حملہ تک کلّی طور پر اور اس کے بعد جزئی طور پر، وہ نہ صرف ایمان و اخلاق

اصلاحِ حال اور دینِ حق کی دعوت کے تنہا علمبردار رہے، بلکہ علمی و فکری، تعلیمی، ادبی و تمدّنی رہنمائی کے بھی اہل تھے، اور انھوں نے ان میدانوں میں بھی اپنی اہلیت، خلوص، اور جذبۂ خدمت کا ثبوت دیا۔

میں اپنے مطالعہ کی روشنی میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کو اپنی سیاسی و جنگی بالاتری اور وسیع سلطنتوں کے ساتھ معاصر دنیا اور اقوام عالم میں علمی و فکری برتری بھی حاصل رہی، امتِ اسلامیہ برابر ایسے اشخاص پیدا کرتی رہی جو اپنے علمی ذوق و عشق، جذبۂ قربانی، تصنیفی انہماک اور تحقیقی معیار میں اپنے عہد میں واضح امتیاز و تفوّق کے مالک تھے، ائمّہ مجتہدین اور اصحاب صحاح محدّثین سے قطع نظر کہ ان کی نظیر امتوں اور ملّتوں میں بھی نہیں ملتی، ایسے سرآمدِ روزگار علماء اور یگانۂ عصر ماہرین فنون متکلّمین اور مصنّفین پیدا ہوتے رہے، جن کی نظیر معاصر اور ہمسایہ اقوام میں نظر نہیں آتی اگر چوتھی صدی ہجری پر نظر ڈالیں گے تو امام ابوالحسن اشعریؒ، قاضی ابوبکر باقلّانی، شیخ ابو اسحٰق اسفرائنی نظر آئیں گے، اگر پانچویں صدی پر نظر ڈالیں گے تو علامہ ابن حزم اندلسی، امام غزالی[1] اور اگر آپ چھٹی صدی میں آئیں گے تو امام فخر الدین رازی نظر آئیں گے[2] اگر آپ ساتویں، آٹھویں صدی میں آئیں تو شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابراہیم الشاطبی (صاحب "الموافقات") نظر آئیں گے، نویں صدی ہجری میں امام فنِ حدیث

---

[1] امام غزالی کی وفات ۵۰۵ھ میں ہوئی لیکن ان کے علمی کارناموں اور تصنیف و تحقیق کا زمانہ پانچویں صدی ہی ہے۔ [2] امام رازی کی وفات ساتویں صدی کے اوائل ۶۰۶ھ میں ہوئی لیکن ان کی علمی سرگرمیوں اور محنتوں کا زمانہ چھٹی صدی ہی ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی اور دسویں صدی میں علامہ شمس الدین سخاوی اور علامہ جلال الدین سیوطی جیسے علوم دینیہ کے بحر زخّار اور اسلام کے مصنفین کبار نظر آئیں گے، اور یہ تسلسل برابر باقی رہتا ہے۔ گیارہویں اور بارہویں صدی کے دورِ انحطاط میں بھی ہندوستان جیسے (مرکز اسلام اور علوم اسلامیہ سے دور) خطّہ میں ملّا محمود جونپوری، اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسے مجتہد الفن اور نادرۂ روزگار علماء و مصنفین نظر آتے ہیں[1]۔

یہ تو ان شخصیتوں کا ذکر ہے جنھوں نے عقائد، علم کلام عقل و نقل کی تطبیق اور علوم شریعت کے میدان میں اپنی ذہانت اور حافظہ، مطالعہ کی وسعت اور فکر و نظر کی گہرائی کا نقش قائم کیا، لیکن دنیا کی علمی و فکری قیادت کے لئے اتنا کافی نہیں، مسلمانوں نے جغرافیہ، طبیعیات، نباتیات، ریاضیات، طب، علم الکیمیا، فلسفۂ تاریخ، مذاہب، تہذیبوں اور مختلف فلسفوں کے مطالعہ اور نقد و تنقید میں بھی ایسے اشخاص پیدا کئے، جنھوں نے صدیوں تک ان فنون میں دنیا کے علمی حلقوں کی رہنمائی کی اور وسیع پیمانہ پر علمی دنیا پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے، مثلاً محمد بن محمد الادریسی صاحب "کتاب الممالک و المسالک"، محمد ابن الہیثم، محمد بن موسیٰ الخوارزمی، محمد بن جابر البتّانی، ابو بکر الرازی، ضیاء بن بیطار، شیخ الرئیس ابو علی ابن سینا ابن خلدون اور ابو الریحان البیرونی[2]۔

ادب و شاعری میں بھی ایسی عبقری (GENIUS) شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کا اثر دلوں اور دماغوں، طرز فکر، بیان و تعبیر اور اسلوب پر صدیوں تک

[1، 2] اس فہرست میں بھی استیعاب سے کام نہیں لیا گیا، جو نام مستحضر تھے وہ بطور نمونہ ذکر کر دیئے گئے۔

قائم رہا، ان میں مولانا جلال الدین رومی، شیخ سعدی، حافظ شیرازی، حکیم سنائی اور امیر خسرو کا نام لیا جا سکتا ہے، خاص طور پر مولانا روم اور ان کی مثنوی کا اثر سب سے زیادہ گہرا، دیرپا اور وسیع ترین دائرہ میں رہا، اس سے ادب و شاعری، فلسفہ اور علم کلام یکساں متاثر ہوئے اور وہ صدہا متشکک طبیعتوں بلکہ الحاد ولادینیت سے متاثر ذہنوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنی۔

اگر اس امّت نے "احتسابِ کائنات" کا فریضہ چھوڑ دیا، اگر اس نے اپنے کو عالم انسانی کی علمی و فکری قیادت سے سبکدوش کر لیا تو یہ نوع انسانی کے حق میں جرم اور خود اپنے اوپر ظلم عظیم ہوگا، اس لئے اگر آج ہمارے اہلِ علم، ہماری جامعات کے فضلاء، ہمارے ادباء و شعراء، اہل قلم اور اہل فکر اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ جائیں، یا اپنے حصار کے اندر مطمئن ہو جائیں، اور نوعِ انسانی کی علمی و فکری قیادت کا کام چھوڑ دیں تو نوعِ انسانی کا بھی خسارہ ہوگا، وہ ملک بھی نقصان اٹھائے گا اور خود وہ بھی اپنی دعوتِ ایمانی اور صدائے اصلاح کو محدود سے محدود تر بنا دیں گے۔

حضرات! مستشرقین کا تذکرہ اس مجلس میں بار بار ہوا، یہ صحیح ہے کہ ان یورپی علماء و محققین نے مشرقی زبانوں میں بڑی محنت سے کام لیا اور نمایاں مقام حاصل کیا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ان محنتوں کا بہت بڑا محرک مغربی نوآبادیوں کا وجود تھا، اور وہ یلغار تھی جو مغرب مسلسل مشرق میں کر رہا تھا، اس کے لئے ایک علمی و تصنیفی ہراول دستہ (PIONEER FORCE) کی ضرورت تھی، دراصل مستشرقین یہی کام کرتے تھے، وہ مفتوح قوموں کی تہذیب اور

علمی سرمایہ ان کے سامنے رکھتے تھے، ان کی کمزوریاں اور خامیاں بیان کرتے تھے، اور ان مفتوح قوموں میں احساس کمتری اور مرعوبیت، دین کے اصلی وقدیم مراجع و مآخذ (SOURCES) کے بارہ میں شکوک و شبہات اور اپنے اسلاف کے بارہ میں بے اعتمادی و تحقیر پیدا کرتے تھے، لیکن جب نو آبادیوں کا نظام ختم ہوا تو میں ایک ایسے طالب علم کی حیثیت سے جس کو بار بار یورپ جانے کا اتفاق ہوا ہے، آپ سے عرض کرتا ہوں کہ استشراق کے اندر جو جوش و خروش تھا اس کے اندر جو محنت کا جذبہ تھا، اس کے اندر جو بلند ہمتی تھی، اس میں بہت بڑا فرق پڑ گیا، آج یورپ و امریکہ میں استشراقی کام بہت کمزور پڑ گیا ہے، اور اب اس پایہ کی چیزیں سامنے نہیں آرہی ہیں جو اس سے پہلے آئیں مستشرقین کی کامیابی کا بہت بڑا راز یہ تھا کہ وہ ایک موضوع کو اپنی زندگی بھر کا موضوع بنا لیتے تھے، اور اس میں جذب ہو جاتے تھے، اس کے نتیجہ میں وہ اس پر حاوی ہو جاتے تھے، لیکن ان کو یہ سمجھنا کہ وہ ہمہ داں تھے، بڑے متبحر عالم تھے، یہ بات صحیح نہیں، میں یورپ کے چوٹی کے دو تین مستشرقین سے ملا ہوں اور مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ صرف اس موضوع سے واقف ہیں، جس پر یہ اس وقت اسٹڈی کر رہے ہیں یا کوئی کتاب لکھ رہے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں خود ہمارے برصغیر میں ہندوستان میں ایسے تحقیقی کام ہوئے ہیں، جن کی مثال یورپ و امریکہ میں ملنی مشکل ہے، اور ہمارے یہاں جن لوگوں نے علمی ذوق سے کام لیا ہے اور شمع علم کے پروانے بن گئے ہیں، انھوں نے تحقیق کے ایسے نمونے پیش کئے ہیں جن کی مثال مغرب میں نہیں ملتی۔

میں مثال کے طور پر علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب "خیام" کا ذکر کرتا ہوں، ان کی یہ کتاب اپنے موضوع پر آخری کتاب ہے، علامہ اقبال نے اس کے پڑھنے کے بعد کہا کہ اب اس سے بہتر کتاب لکھنی مشکل ہے، اور علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کا فرہاد سید سلیمان ندوی سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے؟ اسی طرح علامہ شبلی کی "شعر العجم" کی (حافظ محمود خاں شیرانی کی تنقیدوں کے باوجود) مثال نہ ایران کے ادب میں ملتی ہے، نہ ہندوستان کے ادب میں، اسی طرح سے میں کئی کتابوں کے نام لے سکتا ہوں، مولانا سید سلیمان ندوی کی "عرب و ہند کے تعلقات" اور "عربوں کی جہازرانی" مولانا شبلی کی "الجزیۃ فی الاسلام" "کتب خانہ اسکندریہ" اور مولانا حکیم سید عبدالحی کی "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" اور "نزھۃ الخواطر" اپنے موضوع پر بے مثال کتابیں ہیں۔

لیکن میں آپ سے معذرت کرتے ہوئے یہ کہوں گا (اور یہ ایک دوستانہ شکایت ہے) کہ ہماری جامعات (یونیورسٹیوں) میں وہ اوریجنل، وقیع اور وسیع علمی کام نہیں ہوا جو ہونا چاہیئے تھا اور جس کی توقع کی گئی تھی، جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ہے، سید امیر علی کی SPIRIT OF ISLAM کے بعد اس وقت تک کوئی طاقت ور کتاب اہل زبان کی قدرت و بلاغت کے ساتھ اسلام کے تعارف میں نہیں لکھی گئی۔

اسی طرح ہماری یونیورسٹیاں آج بھی براؤن کی — (A LITERARY HISTORY OF PERSIA) نکلسن کی کتاب (A LITERARY HISTORY OF THE ARABS) پڑھانے پر مجبور رہیں، ہٹی (HITTI) کی

کتاب A SHORT HISTORY OF THE ARABS سے آج تک مدد لے رہے ہیں، ہمارے اساتذۂ جامعات اور فضلاء نے کوئی کتاب نہیں پیش کی جو ان کتابوں کی قائم مقام ہو جس کو یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا جائے، یا تدوین فقہ و حدیث کی تاریخ پر کوئی کتاب شاخت اور گولڈزیہر وغیرہ کی گمراہ کن کتابوں کا بدل بن سکے۔

یہ ایک بہت بڑا خلا ہے جس کو پُر ہونا چاہیئے، اور اس بات کی طرف توجہ دلانے کا بہترین موقعہ رابطۃ الادب الاسلامی کا یہ اجلاس ہے، اس میں ہماری جامعات کے اساتذہ آئے ہوئے ہیں، ان کے سامنے میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے فضلاء کو علمی و فکری قیادت کی ذمہ داری بھی قبول کرنی چاہیئے اور ادبی و فنّی قیادت کی بھی، اگر ہم نے یہ ذمہ داری نہ سنبھالی تو ہم اپنی ملّت کو بھی نقصان پہونچائیں گے اور نئی تعلیم یافتہ نسل کو بھی، یاد رکھئے کوئی ملّت اس وقت تک اعزاز و احترام کی مستحق نہیں ہوتی جب تک کہ وہ علمی و فکری اور ادبی و فنّی طور پر خودکفیل نہ ہو، بلکہ دوسروں کے دل و دماغ پر اثر ڈالنے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو، آج کا جو "معمارِ حرم" ہوگا جو جاہلیت علمیہ سے اس پوری نسل انسانی اور تمدّنِ انسانی کو نکالنے کی سعادت حاصل کرے گا، اس کو علم سے، ادب سے اور قلم کی طاقت سے مسلّح ہونا پڑے گا، آج کا دور علم کا دور ہے، تعلیم کا دور ہے، تصنیف و تالیف کا دور ہے، تحقیق اور نقد و احتساب کا دور ہے، نبیِّ امّی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، اس میں بھی قلم کو ذریعہ تعلیم بتایا گیا "اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ" ان کی اس امّت کو بھی صاحبِ قرطاس و قلم

اور معلّم الامم ہونا چاہیئے، وہ دانشوروں کی معلّم ہے، فلسفیوں کی معلّم ہے، مدارس اور دانش گاہوں کی معلّم ہے، اور ادب و ادبی رجحانات اور ادبی افکار کی نگران و محتسب ہے، اور پورے عالم کی ذہنی و فکری قیادت کی ذمہ دار ہے۔

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ
معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز!

باب نہم ۹

ملیشیا کا سفر اور وہاں کی مختلف مجالس، اداروں اور مسلم تنظیموں میں خطاب

ملیشیا کا سفر اور اس کی دعوت و تحریک

ملیشیا جس کو پہلے ملایا کہتے تھے، خلیج بنگال کے مشرق میں ایک جزیرہ نما کی صورت میں واقع ہے، اس کے قرب و جوار میں متعدد خطے ہیں، جو جزیروں پر مشتمل ہیں، اور مشرق بعید کا جزء سمجھے جاتے ہیں، ملیشیا اس خطہ کے مغربی پہلو میں واقع ہے، اس کے پڑوس میں اہم ملک انڈونیشیا، فلپائن، بورنیو، برما، تھائی لینڈ وغیرہ ہیں[1]، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، راقم سطور کے بیرونی سفروں کا رُخ زیادہ تر شمال و مغرب کی طرف رہا، جو ممالک اسلامیہ عربیہ میں الجزائر اور مراکش در رباط اور

---

[1] ملیشیا کے جغرافیائی، سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ کی تفصیلات، آبادی کا تناسب اور مسلم اکثریت (جو بہت تھوڑے فرق کے ساتھ اکثریت کا حکم رکھتی ہے) کے خصائص اور اس کی دینی و تعلیمی سرگرمیوں کا مختصر تعارف رفیق سفر مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی کے مفصل مقالہ میں دیکھا جائے جو ماہنامہ "ذکر و فکر" دہلی، محرم، صفر ۱۴۰۸ھ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۷ء) کے شمارہ (۵-۶) میں شائع ہوا ہے۔

غیر اسلامی ممالک میں یورپ و امریکہ کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے، جنوب میں ایک مرتبہ سری لنکا، اور مشرق میں ایک مرتبہ برما، ایک مرتبہ بنگلہ دیش جانا ہوا۔

ملیشیا کے متعدد نوجوانوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور وہ اپنے صلاح و صلاحیت میں ممتاز رہے، انڈونیشیا کے بھی متعدد ندوی نوجوان فضلاء نے قرب مکانی اور زبان کے اتحاد و مناسبت کی وجہ سے ملیشیا ہی کو اپنی دینی و تعلیمی سرگرمیوں کا میدان بنایا، اس ملک میں ان دنوں اسلام سے دلچسپی اور اسلامی اُخوت کا احساس بڑھا ہوا ہے، ندوی فضلاء نے بھی اپنی سنجیدگی، ثقافت اور جذبۂ عمل سے وہاں کے اسلامی اور دعوتی حلقوں میں اچھا مقام پیدا کر لیا ہے، اور ان کو وہاں کی اسلامی تنظیموں اور تحریکوں کا خاصہ اعتماد حاصل ہو گیا ہے، ایک سال قبل دار العلوم ندوۃ العلماء کے دو استاد مولوی نذر الحفیظ ندوی و مولوی شمس الحق ندوی نے اس ملک کا دورہ کیا تھا، ان کے دورہ اور تعارف کی وجہ سے بھی وہاں ہمیں اس ملک کا دورہ کرنے کی دعوت دینے کا مزید تقاضہ پیدا ہوا، ملیشیا کے ندوی فضلاء نے مقامی جماعتوں اور تنظیموں سے مل کر ان کی طرف سے اور خاص طور پر وہاں کی سرگرم اسلامی تنظیم ابیم (ABIM)[1] کی طرف سے دعوت نامہ بھجوایا، اور اپنے تعلق کی بناء پر اصرار اور تقاضہ سے کام لیا، یہ تنظیم اسلامی تخیّل و مقاصد رکھنے والی اور جدید خطوط اور ذہن کے مطابق دعوت کا کام کرنے والی غالباً ملک کی سب سے زیادہ بااثر جماعت

---

[1] یہ ملیشیائی زبان کے الفاظ کا مخفف ہے، جس کا ترجمہ "مسلمان نوجوانوں کی تنظیم" سے کیا جا سکتا ہے۔

ہے، وہ کھلا ہوا ذہن رکھتی ہے، موجودہ حالات اور درپیش خطرات کا اس کے کارکنوں میں شعور پایا جاتا ہے، اور انھیں کے مطابق وہ اپنی پالیسی مرتب کرتے ہیں، اس کے سابق صدر انور ابراہیم اس وقت جدید کابینہ میں وزیر تعلیم بھی ہیں، ملک کی دوسری اسلامی تنظیموں "الحزب الإسلامی" وغیرہ اور مختلف مقامات پر دعوتی و تبلیغی کام کرنے والے حضرات نے بھی اس سفر اور اس کے پروگراموں کو کامیاب بنانے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں تعاون اور اس سے دلچسپی کا اظہار کیا، ان عزیز داعیوں اور کام کا نقشہ بنانے اور رفاقت کرنے والوں میں دو ندوی فضلاء احمد فہمی زمزم انڈونیشی، اور محمد علی رجب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دہلی سے کوالالمپور

ملیشیا کے سفر میں رفاقت کے لئے اصلاً عزیزی مولوی محمد رابع ندوی کا انتخاب کیا گیا تھا، جن سے ملیشیا کے ندوی فضلاء اور نوجوانوں کا خصوصی ربط بھی تھا، اور ان میں سے اکثر کا ان سے تلمذ اور استفادہ کا رشتہ بھی لیکن اپنی معذوریوں، ضعف اور عمر کے تقاضہ کی بنا پر یہ تجربہ ہوا کہ طویل سفروں میں دو رفیق زیادہ مناسب ہوتے ہیں، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی میں سالہا سال پہلے اس کی تاکید کی تھی کہ بیرونی سفروں میں دو رفیق ضرور ہوا کریں، اس وقت تو اس کی افادیت اور اہمیت واضح نہیں ہوئی تھی، لیکن اب اس ہدایت و مشورہ کی قدر آتی ہے،

اس سفر میں خدا کی طرف سے یہ غیبی مدد ہوئی کہ عزیزی سید غلام محمد حیدر آبادی کی جو عرصۂ دراز سے جدّہ ایرپورٹ پر بحیثیت انجینیر کے کام کر رہے تھے، اور اس زمانہ میں اپنے وطن حیدر آباد آئے ہوئے تھے، رفاقت حاصل ہو گئی، ان کی عرصہ سے خواہش تھی کہ بیرونی دعوتی سفروں میں ان کو کبھی رفاقت کا موقعہ ملے، ان کو جب اس پروگرام کا علم ہوا تو انھوں نے مخلصانہ اور رضاکارانہ طریقہ پر خود اپنے مصارف پر رفاقت کی پیش کش کی جو راقم نے اُن سے خصوصی مناسبت اور اپنی ضرورت کی بنا پر بخوشی منظور کی۔

پنجشنبہ ۲ راپریل ۸۷ء کو دہلی سے ایروفلوٹ (روسی کمپنی کے جہاز) سے صبح ہم تینوں ملیشیا کے دارالسلطنت کوالالمپور کے لئے روانہ ہوئے کہ یہی جہاز اس روز دہلی سے براہ راست ملیشیا کے دارالسلطنت کو جاتا تھا، کوالالمپور ایرپورٹ پر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی واقع کوالالمپور کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبد الرؤف مصری اور داعیوں کے نمائندہ اور متعدد ندوی فضلاء موجود تھے، جن میں خاص طور پر قدح کے تعلیمی ادارہ جمعیۃ التربیۃ الاسلامیۃ کے مدیر شیخ نعمت یوسف ملیشی اور ندوی فضلاء شامل تھے، داعیوں کے اثر رسوخ کی بنا پر کارروائی میں وقت صرف نہیں ہوا، اور دن کے ڈھائی بجے قیام گاہ پر پہنچ گئے (ملیشیا اور ہندوستان کے درمیان ڈیڑھ گھنٹے کا فصل ہے، جو گرمائی وقت کے لحاظ سے ایک گھنٹہ مزید بڑھا کر ڈھائی گھنٹے کا رکھا گیا ہے) دہلی سے کوالالمپور تک سفر میں اصلاً تو پانچ گھنٹے صرف ہوئے لیکن مقامی وقت کے فرق سے وہ ساڑھے سات گھنٹے شمار ہوئے، ہم لوگ صبح کو چلے ہوئے،

بعد ظہر پہونچے۔

کوالالمپور تقریباً دس لاکھ آبادی کا اور ملیشیا کا سب سے بڑا شہر ہے، اپنی صفائی، نظم وضبط اور تمدنی معیار کے لحاظ سے وہ یورپ کے کسی متوسط شہر سے کم نہیں ہے، اس کا ایرپورٹ بھی یورپ کے ایرپورٹوں کے معیار اور حال کے مطابق ہے، عمارتوں، سڑکوں، بازاروں اور مواصلات اور صفائی ونظم کے لحاظ سے بھی شہر کا یورپ جیسا معیار ہے، البتہ چونکہ آبادی کی اکثریت مسلمان ہے، اس لئے مسلمانوں کے انداز واخلاق کا مظاہرہ ملا، جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے توان کو زبان کے فرق کو مستثنیٰ کرکے وہاں کوئی اجنبیت نہیں معلوم ہوتی اور زبان کا فرق بھی تعلیم یافتہ طبقہ میں انگریزی کی مشترک واقفیت کی بنا پر معلوم نہیں ہوتا۔

کوالالمپور پہونچنے کے دن کوئی باقاعدہ پروگرام نہیں رکھا گیا تھا، لیکن بعد مغرب میزبان حضرات جو "ابیم" کے عموماً ذمہ دار حضرات تھے ملنے آگئے، ان کے ساتھ ایک دوستانہ نشست رہی، حاضرین کے داعیانہ مقام وکام کے لحاظ سے مسلمان داعی کے اخلاق وصفات اور دین ودعوت کے اصول وفہم کے سلسلہ میں اسلام کی دعوتی تاریخ کی بعض روشن مثالوں کے حوالہ سے کچھ عرض کیا گیا، گفتگو اور انفرادی تعارف پر مجلس برخاست ہوئی۔

ترنگانو کا سفر اور وہاں کے خطابات

اگلے روز ۳ اپریل کا پروگرام ملیشیا کے شمال مشرقی صوبہ ترنگانو جانے کا

رکھا گیا تھا، جہاں صبح طیارہ سے جا کر شام کو کوالالمپور واپس آنا تھا، فاصلہ تقریباً ڈھائی سو میل کا ہے، صبح سویرے ہی ترنگانو کے صدر مقام کوالاترنگانو کا سفر ہوا، وہاں ایک اہم داعی شخصیت شیخ عبدالہادی الحاج اوانج کی ہے، جنھوں نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم کی تکمیل کے بعد اپنے وطن میں دعوتی و تربیتی کام کے ذریعہ اچھا رسوخ حاصل کر لیا ہے، ہر جمعہ کو وہاں کی بڑی مسجد میں ان کا خطاب ہوتا ہے، جس میں قرب و جوار سے اچھی تعداد آ کر شریک ہوتی ہے، شیخ عبدالہادی نے پہلے سے ہماری آمد کا اعلان کر رکھا تھا، اس لئے مجمع خاصہ تھا، نماز جمعہ سے پہلے میرا عربی میں خطاب ہوا جس کی ترجمانی ملیشی زبان میں خود شیخ عبدالہادی نے کی، خطاب کا عنوان "إلى الإسلام من جديد" (اسلام کی طرف بازگشت تھا) جس میں مختلف مثالوں سے بتایا گیا کہ ہر چیز کی الگ افادیت اور ضرورت ہوتی ہے، اور اسی کے اعتبار سے اس کی قدر و قیمت معیّن کی جاتی ہے، حاضرین کو سمجھانے کے لئے ہاتھ میں جو عصا تھا، اور گھڑی کی مثال دے کر بتایا گیا کہ اگر یہ اپنا کام نہ کریں اور ان سے وہ فائدہ حاصل نہ ہو جن کے لئے ان کی صنعت عمل میں آئی ہے تو یہ بالکل بیکار ہیں، اور ان کے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں، پھر بتایا گیا کہ اُمّت مسلمہ کی تخلیق اور اس کے انتخاب و اعزاز کی وجہ کیا ہے؟ اس کا کیا منصب اور کیا فرائض ہیں؟ اور اس عہد اور پھر خود اس ملک کو اس کی کیا ضرورت ہے، اور اگر وہ اپنا فرض منصبی ادا نہ کرے تو اس سے زندگی میں کیا خلا پیدا ہوتا ہے، اور ملک و معاشرہ کن خطرات سے دوچار ہوتا ہے۔

پھر بتایا گیا کہ اگر مسلمان صحیح طرز زندگی اور اخلاق و معاشرت اختیار کریں تو اس کا ملکی و مقامی معاشرہ پر کیا اثر پڑے گا، اس سلسلہ میں صلح حدیبیہ کے بعد جب غیر مسلموں کو مدینہ منورہ ہجرت کر جانے والے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں، ہم زبان و ہم وطن و ہم نسب، بچھڑے ہوئے بھائیوں سے (معاہدۂ صلح کی بناء پر جب جان کا کوئی ڈر نہیں رہا تھا) آزادانہ ملنے چلنے اور قریب سے ان کے اخلاق، اور ان تبدیلیوں کو دیکھنے کا موقعہ ملا جو قبول اسلام اور صحبت نبوی کی برکت سے ان میں رونما ہوئی تھیں، اور جن میں وہ اپنی اور ان کی زندگی میں خون، زبان اور تہذیب و معاشرت کے اشتراک کے باوجود زمین و آسمان کا فرق دیکھتے تھے، تو وہ اس سے متاثر ہو کر اس کثرت سے مسلمان ہوئے کہ بقول محدّث جلیل اور تابعی مشہور امام زہری کے دو[۲] تین[۳] سال کے عرصہ میں اتنی بڑی تعداد مسلمان ہوئی جو پندرہ[۱۵] بیس[۲۰] برس کے عرصہ میں نہیں ہوئی تھی، آپ حضرات کو بھی اس ملک میں زندگی کے اسی امتیاز اور اخلاق و معاشرت کے اسی فرق کو نمایاں کرنا چاہیے جس سے لوگوں کے اندر اس دین کے مطالعہ کا شوق اور اس فرق کے سبب اور سرچشمہ سے واقف ہونے کا تقاضہ پیدا ہو جس نے ایک نسل، ایک زبان، ایک ملک ہونے کے باوجود آبادی کے دو[۲] حصّوں میں اتنا بڑا فرق پیدا کر دیا ہے۔

اس سلسلہ میں میں نے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مجاہدین کے اس لشکر کی مثال دی جس نے پشاور فتح کیا تھا، وہاں کے لوگوں نے بعض ہندوستانی اہلِ لشکر سے پوچھا کہ کیا تم لوگوں کی آنکھوں میں کوئی بیماری

ہے کہ تم دور کی چیز نہیں دیکھ سکتے؟ جب انھوں نے استفسار کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ تمہارا کوئی سپاہی باوجود سالہا سال اپنے گھر سے دور رہنے کے کسی نامحرم کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا، ایک دو ہوں تو اس کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے لیکن سارے لشکر کا یہ حال ہے اس کی توجیہ مشکل ہے؟ انھوں نے بتایا کہ یہ اسلام کی تعلیم اور ہمارے قائد وامام کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ ہم قرآن کی اس آیت پر عمل کرتے ہیں کہ :۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ (النور۔۳۰) اے اللہ کے رسول مسلمانوں سے کہئے کہ وہ اپنی نظر نیچی رکھیں۔

عصر تک شیخ عبدالہادی کے مہمان خانہ میں قیام رہا، عصر کی نماز پڑھ کر شہر سے باہر واقع زین العابدین ہال میں ایک جلسہ کو خطاب کیا گیا، تقریر کے بعد سوالات، جوابات ہوئے اور مغرب کے قریب پروگرام ختم ہوا۔

یہاں سے کوالا ترنگانو کے تبلیغی مرکز جانا ہوا، یہ ایک وسیع مسجد میں واقع ہے، جس کی تعمیر ایک ملیشی مخیر اور تبلیغی شخص الحاج مودہ مرحوم نے کی، یہاں تبلیغ کے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں، مسجد میں حفظ قرآن کا ایک مکتب بھی قائم ہے، میں نے طلبہ اساتذہ کو ایک مختصر خطاب کیا، جس میں علم دین کے حصول، حفظ قرآن کی سعادت اور دعوت دین کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور دعائے خیر کی، اور عشا کے وقت ہوائی جہاز سے کوالالمپور واپسی ہوئی۔

مسلم ممالک میں بے چینی اور عوام اور حکومتوں میں محاذ آرائی کی وجہ

دوسرے روز شنبہ ۴؍اپریل کے پروگرام میں دن کے اوقات میں

قومی یونیورسٹی کی شریعت اسلامی فیکلٹی میں جانے اور اساتذہ سے ملنے اور خطاب کرنے کا پروگرام تھا، اور شام کے وقت قیام گاہ سے قریب واقع ٹکنالوجی یونیورسٹی کی مسجد میں طلبہ واساتذہ کو خطاب کرنے کا۔

دن میں ۱۱ بجے قومی یونیورسٹی جانا ہوا، یہ ایک شاندار عمارت ہے، جس کا جائے وقوع بہت اچھا شہر سے باہر ایک مضافاتی مقام ہے، شریعت فیکلٹی (كلية الشريعة) کا اسٹاف استقبال کے لئے موجود تھا، یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں اجتماع تھا، حاضرین میں اساتذہ اور تحقیقی کام کرنے والے طلبہ تھے، تقریر تعلیمی موضوع پر تھی، تقریر میں خاص طور پر اس پر روشنی ڈالی گئی کہ ممالک اسلامیہ میں اسلام پسند اور اسلام بیزار طبقہ کی محاذ آرائی، اور پھر اس کے نتیجہ میں انقلابات (جن کی مثال خالص غیر مسلم ممالک میں کم دیکھنے میں آتی ہے) اس لئے پیش آتے ہیں کہ ہمارے اسلامی ملکوں کا نظامِ تعلیم مسلم اکثریت اور عوام کے عقائد، مسلّمات اور جذبات سے میل نہیں رکھتا، بلکہ اکثر اوقات متصادم ہوتا ہے، قوم اور مسلم عوام ایک دنیا کے ہوتے ہیں، اور برسرِ اقتدار اور برسرِ حکومت طبقہ اور ملک کی تعلیم، معاشرہ اور قانون کا نظام بنانے والے دوسری دنیا کے، اس لئے دونوں طبقوں میں ایک مسلسل بے اعتمادی، بے گانگی، اور رقابت رہتی ہے، صاحبِ اقتدار طبقہ عوام سے خائف و بدگمان اور ان کے دینی جذبہ کو مردہ یا سرد کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اور عوام یا اسلام پسند عنصر کو جب موقعہ ملتا ہے تو وہ دین کو برسرِ اقتدار لانے کے لئے انقلاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تقریر کے بعد اساتذہ اور طلبہ نے سوالات کئے جن کے جوابات دیئے گئے،

عشاء کے بعد ٹکنالوجی یونیورسٹی کی مسجد میں خطاب تھا۔

اگلے روز ۵ اپریل ۸۶ء کو شہر کے اہم اور وسیع ہال میں جو ملک کے پہلے وزیر اعظم ٹنکو عبد الرحمٰن کے نام سے موسوم ہے تقریر کا پروگرام تھا، ایک وسیع اور وقیع ہال، نیز اتوار کا دن ہونے کے باعث شہر کے دانشور طبقہ اور تعلیم یافتہ حاضرین کی اچھی تعداد آگئی تھی، ۱۱ بجے دن کو تقریباً ایک گھنٹہ تقریر رہی ترجمانی ابیم کے نائب صدر شیخ عبد الغنی شمس الدین نے کی جو اچھے فاضل اور عربی اور ملیشین زبان کے ماہر ہیں۔

قدح کا سفر اور خطابات

اگلے روز (۶ اپریل) دوشنبہ کا پروگرام قدح میں تھا، قدح مغرب میں ملک کا ایک اہم حصہ سمجھا جاتا ہے، یہاں پیدا ہونے والا چاول پورے ملک کی ضرورت پوری کرتا ہے، آبادی بھاری اکثریت کے ساتھ مسلمانوں کی ہے، ان مسلمانوں میں عصر جدید کی خرابیاں ابھی کم پہونچی ہیں، دین سے تعلق اور اسلامی تشخص یہاں زیادہ نمایاں ہے، عربی لباس اور عمامے عام طریقہ سے نظر آتے ہیں، اور لوگوں میں اسلامی اُخوت کا احساس بھی زیادہ ہے، تھائی لینڈ کی جنوبی سرحد جس کو فطانی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، یہاں سے خاصی قریب ہے، جہاں کی اکثریت مسلمان ہے، اور ملک کی غیر مسلم اکثریتی حکومت کی حق تلفیوں اور مظالم کی شاکی ہے۔

۵ اپریل کو بعد مغرب کوالالمپور سے قدح کے لئے پرواز تھی جس کا فاصلہ

دو ڈھائی سو میل ہے، ایرپورٹ پر استقبال کرنے والوں کا ایک بڑا مجمع اکٹھا تھا جس نے محبت و اخوت کے جذبہ سے استقبال کیا، قیام گاہ شہر سے فاصلہ پر ایک قصبہ میں تھی، دو رویہ لوگ استقبال کے لئے کھڑے ہوئے ملے، اس قصبہ میں "معهد التربية الاسلامية" واقع ہے، جس میں ہمارے ندوی فضلاء کا بڑا حصہ ہے، قصبہ میں پہونچکر معلوم ہوا کہ دور دور سے آئے ہوئے افراد ایک بڑے جلسۂ عام کی صورت میں موجود ہیں، بعد میں لوگوں نے بتایا کہ بیسیوں کاریں لوگوں کو دور دراز کے مقامات سے لے کر آئی تھیں، معہد کے دفتر کی عمارت کے سامنے اسی لان میں جلسہ تھا، دن بھر کی مشغولیت اور سفر کا بڑا تکان تھا، لیکن اس عظیم مجمع اور اس کے پُر محبت مظاہرہ کو دیکھ کر نشاط اور تازگی پیدا ہو گئی۔

دوسرے روز ۶؍ اپریل کو ۱۰ بجے "معهد التربية الاسلامية" کے اساتذہ اور طلبہ سے خطاب کیا گیا، پھر نئے قائم کئے جانے والے ذیلی ادارے "المعهد العالي للدعوة" کا سنگ بنیاد رکھا، شام کے پروگرام میں قدح کے مرکزی ادارۂ امور زراعت "مدا" میں (جو پورے ملک کا ایک اہم قومی سطح کا ادارہ ہے) خطاب ہوا، اس موقعہ پر متعدد سرکاری افسران اور ذمہ دار حضرات موجود تھے، اس لئے مناسبِ وقت اور مناسب حال باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی، اور مسلمانوں کی دعوتی و اخلاقی اور رفاہی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کیا گیا۔

رات قدح میں گذار کر سہ شنبہ ۷؍ اپریل کو بذریعہ ہوائی جہاز کوالالمپور واپسی ہوئی، اسی روز قبل ظہر ملیشین یونیورسٹی میں پروگرام تھا، اس لئے

ایرپورٹ سے سیدھے وہیں جانا ہوا، اسی دن بعد عصر دو پروگرام تھے، ایک شہر کے تبلیغی مرکز میں، دوسرے ابیم میں۔

دین کے نوجوان داعیوں اور علمبرداروں کے کام کی نزاکت، اور ایمانی زندگی کے مراحل

چونکہ یہ سفر اصلاً ابیم کی دعوت اور اس کی میزبانی میں کیا گیا تھا، اور اس کے ارکان سے ملک کے بدلتے ہوئے حالات اور جدید چیلنجوں کی موجودگی میں دین کی مؤثر دعوت اور اس کو عملی زندگی اور زندہ معاشرہ میں منتقل کرنے کی صلاحیت کی (ان کی ثقافتی سطح اور دینی جذبہ کی بناء پر) زیادہ امید کی جاسکتی تھی، اس لئے وہاں بہت سے دوسرے مواقع کے مقابلہ میں زیادہ طبیعت کھلی، اس جماعت کا مرکز شہر سے باہر ایک نواحی قصبہ میں تعمیر کیا جارہا ہے، وہ ایک وسیع اور کشادہ جگہ پر واقع ہے، جماعت کے ارکان و ذمہ دار مختلف جگہوں سے آئے ہوئے تھے، ان کا ایک تربیتی کیمپ چل رہا تھا۔

جماعت کے صدر استاد صدیق فاضل کے تعارف اور تمہیدی تقریر کے بعد (جس میں ملیشیا کے دوسرے جلسوں کے معمول کے مطابق مقرر کی اہم تصنیفات اور مخصوص خیالات کا تذکرہ بھی تھا) میں نے سورہ کہف کی آیت:۔

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ	وہ چند نوجوان تھے جو اپنے پروردگار
وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّرَبَطْنَا	پر ایمان لائے تھے، اور ہم نے ان کو
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا	اور زیادہ ہدایت دی تھی، اور
رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا،

لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝	جب وہ اُٹھ کھڑے ہوئے تو کہنے لگے کہ ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، ہم اس کے سوا کسی کو (معبود سمجھ کر) نہ پکاریں گے (اگر ایسا کیا) تو اس وقت ہم نے بعید از عقل بات کہی۔
سورہ کہف - ۱۳-۱۴)	

پڑھ کر ان نوجوانوں کے اس خطرناک اقدام کا ذکر کیا جو انھوں نے رائج الوقت مشرکانہ دین اور ایک باجبروت سلطنت کے (جس کے ان میں سے اکثر کے سرپرست اور اہلِ خاندان متوسّل اور ملازم تھے) خلاف کیا تھا، اور بتایا کہ اس آیت میں ان کے قبولِ حق، یقین و ہدایت کی ترقی اور ثبات و استقامت کے مراحل کو معجزانہ طریقہ پر ایک خاص ترتیب سے بیان کیا گیا ہے، اور وہی قیامت تک کے لئے صحیح ترتیب اور ایمان و دعوت کے مربوط و مسلسل مراحل ہیں، آیت میں کہا گیا ہے کہ پہلے انھوں نے ہمت کر کے ایمانی دعوت قبول کی "اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ" پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا، اس کے بعد جب ابتلا اور آزمائش کے مراحل سامنے آئے تو اللہ نے ان کے دلوں میں قوت اور قدموں میں ثبات و استقامت عطا فرمائی "وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ"

میں نے یہ بھی کہا کہ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جمع قلّت کا لفظ "فِتْيَةٌ" کا کلمہ استعمال کیا ہے[1]، اس لئے کہ ایسے جان بر

---

[1] اس وزن پر جمع قلّت کے چند ہی لفظ عربی زبان میں آئے ہیں جیسے فِتْيَةٌ (چند نوجوان) "غِلْمَةٌ" (چند لڑکے) صِبْيَةٌ (چند بچے)

کھیل جانے والے اور ترقیوں اور خوش حالیوں سے آنکھیں بند کر لینے والے نوجوان ہر زمانہ میں کم رہے ہیں، اس کے بعد میں نے متوجہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس موقعہ پر اسماءِ حسنیٰ میں سے ان کے تذکرہ میں "ربّ" کے کلمہ کو منتخب فرمایا:۔

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ — وہ چند نوجوان تھے جو اپنے "پروردگار" پر ایمان لائے تھے۔

اور

اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ — جب وہ اٹھ کھڑے ہوئے تو انھوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے۔

اس لئے کہ ان کے مستقبل، ان کی معاشی ضرورتوں کی تکمیل اور ضروریاتِ زندگی کا حصول حکومتِ وقت سے وفاداری، اور عہدوں اور ملازمتوں سے وابستہ سمجھا جاتا تھا، اور اس کے بغیر پُر راحت اور باعزت زندگی کے حصول کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا تھا، انھوں نے یہ کہہ کر کہ "ہماری پرورش کرنے والی کوئی حکومت یا مخلوق نہیں زمین و آسمان کا پروردگار ہے"۔

——— اس فاسد، جاہلی عقیدہ اور تصوّر پر ضرب کاری لگائی اور اعلان کیا کہ ان کا رزق، ان کی تقدیر اور ان کا ضرر و نفع خالقِ ارض و سماوات کے ہاتھ میں ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں حضرت صالحؑ کے واقعہ کی مثال تازہ کر دی اس کے خلاف ان کے خاندانوں میں وہی ردّ عمل ہوا ہوگا جو حضرت صالحؑ کے خاندان میں ہوا تھا کہ ان کے سرپرستوں اور بزرگانِ خاندان نے بڑی مایوسی اور حسرت کے ساتھ کہا:۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ۔ (سورۂ ہود۔۶۲) — اے صالحؑ تم سے تو اس سے پیشتر بڑی امیدیں تھیں (تم نے سب پر پانی پھیر دیا)۔

میں نے کہا کہ قرآن مجید کی ہر آیت مستقل معجزہ ہے لیکن اس آیت میں مراحلِ ایمان ودعوت، ثبات واستقامت اور اعلانِ حق کو اس ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جو ایک مستقل اعجازِ قرآنی اور ترتیبِ ربانی ہے۔

اس کے بعد میں نے ان سامعین کو جن میں بڑی تعداد نوجوانوں کی تھی اور وہ دعوت کے میدان میں تھے، داعی کے صفات اور دعوت کے سلسلہ میں پیش آنے والے مراحل و نزاکتوں کی طرف متوجہ کیا اور توجہ دلائی کہ ملت کی پوری زندگی اور معاشرہ کو اسلامی تعلیمات اور اسلامی زندگی کے سانچہ میں ڈھالنے اور اس کے رنگ میں رنگنے کی ضرورت ہے، اسلام میں "ریاست" و "کلیسا"، "اجتماعی" و "انفرادی" زندگی اور "عبادات" اور "احوال شخصیہ" (پرسنل لا) کی ایسی تقسیم نہیں کہ ان میں سے کوئی اسلامی تعلیمات کے مطابق اور کوئی بالکل آزاد اور خود ساختہ قوانین کے ماتحت ہو۔

خطاب کی ترجمانی جماعت کے نائب صدر شیخ شمس الدین نے کی جو عربی اور ملیشی زبان پر اچھا عبور رکھتے تھے، اور جلسہ تاثر اور کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔

کوالالمپور کا آخری دن

چہار شنبہ ۸ر اپریل ملیشیا کے سفر کا آخری دن تھا، اس روز کے پروگراموں میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی جانا اور شام کو الحزب الاسلامی کے مرکز میں ایک جلسہ کو خطاب کرنا تھا، دن میں ۱۲ بجے کے قریب اسلامک یونیورسٹی جانا ہوا، یہ نہایت خوبصورت، کشادہ جدید اسٹائل سے بنی ہوئی عمارت میں قائم کی گئی ہے، اس میں طلبہ نہ صرف ملیشیا کے بلکہ دنیا کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے ہیں،

اس یونیورسٹی کی سرپرستی مختلف اسلامی ملکوں کی طرف سے کی جاتی ہے، اس کے وائس چانسلر مشہور عرب فاضل ڈاکٹر عبدالرؤف مصری ہیں، جو ایک مدّت تک واشنگٹن کے اسلامک سنٹر اور مسجد کے ڈائرکٹر رہ چکے ہیں، اور غالباً ان سے واشنگٹن میں ملاقات ہوئی ہے، ڈاکٹر عبدالرؤف نے بڑی مسرّت کے ساتھ استقبال کیا، وہ یونیورسٹی کے جدید ووسیع ہال میں لے گئے، امتحانات کی وجہ سے اسٹاف کے کچھ لوگ نگرانی میں مشغول تھے، انھوں نے مقرر کا تعارف بھی کرایا اور تقریر کی ترجمانی بھی کی، تقریر کے بعد یونیورسٹی کی طرف سے لنچ تھا۔

بعد عصر "الحزب الاسلامی" کے مرکز کو روانگی ہوئی جو شہر سے ۳۰۔۴۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک قصبہ میں واقع ہے، تقریر میں دینی دعوتی کام کے لئے محبّت کے طریقوں کے اختیار کرنے کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی، مغرب کے بعد جلسۂ عام تھا، اس میں خاصا مجمع تھا، معلوم ہوا کہ دُور دُور سے لوگ آئے ہوئے ہیں، اس موقعہ پر جماعت کے اہم رہنما اور قائد موجود تھے۔

اگلے روز پنجشنبہ ۹ اپریل ۱۹۸۷ء کو ملیشین ایرلائن کے جہاز سے مدراس اور وہاں چند گھنٹے محبّ محترم عمادالدین خطیب صاحب کے دولت خانہ پر ٹھہر کر ایر انڈیا کی فلائٹ سے دہلی واپسی ہوئی۔[1]

---

[1] اس باب میں عزیزی مولوی محمد رابع ندوی کے مضمون سے استفادہ کیا گیا، اور بہت جگہ خود انہیں کے الفاظ میں واقعات کی سرگزشت اور سفر کی روئیداد آگئی ہے۔

بابِ دہم[1]

آیۃ اللہ خمینی صاحب کی مخالفت

فرقہ اثنا عشریہ کے بعض مشہور اور مسلّم عقائد پر تنقید اور "دو متضاد تصویریں" کی تالیف

ایرانی انقلاب اور اس کا سحر و اثر

جناب آیۃ اللہ روح اللہ خمینی صاحب نے جب پہلوی سلطنت کا تختہ الٹ کر (بقول خود) حکومت اسلامیہ قائم کی، اور ایک نئے دور کا آغاز کیا تو اس کی پوری توقع تھی (اور اس کے آثار و قرائن موجود تھے) کہ وہ اپنی دعوت کو عام کرنے اور اس کو مقبول بنانے کے لئے شیعہ سنی اختلاف کی قدیم و مسلسل تاریخ کا یہ نزاعی ورق نہ کھولیں گے، اور اگر اس کو کتاب سے جدا نہیں کر سکتے تو کم سے کم اس کو الٹیں گے نہیں، اور اگر فرقۂ امامیہ کے ان عقائد سے وہ کسی سیاسی یا تقاضی مصلحت سے براءت کا اعلان نہیں کر سکتے تو کم سے کم ان کا اظہار و اعلان نہیں کریں گے، بلکہ اس کی امید بھی کی جا سکتی تھی کہ وہ اخلاقی جرأت اور اتحاد بین المسلمین کی خاطر اور فکر و مطالعہ کی بنیاد پر یہ اعلان کر دیں گے کہ یہ عقائد اسلام کی بنیاد پر تیشہ چلاتے ہیں، اس کو دنیا میں بدنام اور بے اعتبار کرتے ہیں، اور غیر مسلمین کو دعوت دینے کے راستہ میں سنگ گراں ہیں، اس لئے کہ ان کا ماحصل یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کی اس جماعت میں جس کی تعداد صرف حجۃ الوداع میں ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے، اپنے پیغمبر کی آنکھ بند ہونے کے بعد صرف چار آدمی اسلام پر

قائم رہے، باقی سب نے معاذ اللہ ارتداد کا راستہ اختیار کیا، قرآن مجید سراپا محرّف اور تبدیل شدہ ہے، ائمۂ اہلِ بیت (از روئے تقیہ جو دینی فریضہ اور عزیمت ہے) (جماعت فری میسن کی طرح) حق کے چھپانے والے، اصل قرآن کو پوشیدہ رکھنے والے، ہر خطرہ اور اندیشہ سے دور رہنے والے اور اپنے متبعین کو اسی کی تلقین کرنے والے تھے[1] اور یہ کہ یہ سب عقائد و دعاوی قرنِ اول اور صحابہ کے عہد کی ایک دشمنِ اسلام چالاک سازش کے نتیجہ ہیں اور صدیوں کی قائم شدہ ایرانی شہنشاہی کے زوال کے انتقام کے جذبہ سے بروئے کار آئے تھے، اب نہ ان کی ضرورت ہے نہ گنجائش، ہم کو اسلام کا اقتدار قائم کرنے، ممالک اسلامیہ کی اصلاح اور مسلم معاشرہ سے فساد دور کرنے کے لئے اب ماضی کو بھول جانا چاہئے اور ایک نئے سفر کا آغاز کرنا چاہئے، جس میں اسلام کے ماضی کی تابناک تصویر اور سید المرسلین خاتم النبیّین صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی (جن کے متعلق نصرت خداوندی تائید ربّانی اور بے نظیر کامیابی کی کھلی ہوئی قرآنی شہادتیں ہیں) دعوت اور صحبت و تربیت کے اعجاز اور آدم گری، مردم سازی اور انقلاب آفرینی کی وہ درخشاں مثالیں سامنے آئیں جن کی مثال تاریخ انسانی کے کسی دور اور دعوت و اصلاح کی کسی تاریخ میں (اہل انصاف اور مؤرخین عالم کے اعلان و اعتراف کے مطابق) نہیں ملتی[2]، اسی طرح قرآن مجید ایک ایک حرف اور نقطہ کے ساتھ

---

[1] ملاحظہ ہو "اصول کافی" "فصل الخطاب" اور خود علامہ خمینی کی تصنیفات "کشف الاسرار" وغیرہ

[2] ملاحظہ ہوں، مغربی فضلاء کا تنانی، ڈاکٹر لیبان، ایڈورڈ گبن، فلپ ہٹی، سر ولیم میور اور جسٹس سید امیر علی کے بیانات اور ان کی کتابوں کے اقتباسات مندرجہ کتاب "دین اسلام اور اوّلین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں" ص ۲۶-۳۴ (از راقم سطور)

محفوظ و متواتر طریقہ پر چلا آرہا ہے، اور اس کے لئے (امت کے اجتماع و اتفاق سے قطع نظر) غیر مسلم فضلاء، مؤرخین و ناقدین کی کھلی ہوئی شہادتیں موجود ہیں۔[۱]

لیکن توقعات اور آثار و قرائن کے بالکل برعکس ان کے قلم کی خود وہ تحریریں و رسائل اور کتابیں سامنے آئیں جن میں انھوں نے پوری صفائی اور طاقت کے ساتھ انھیں عقائد کا اظہار کیا ہے، ان کی کتاب "الحکومۃ الإسلامیۃ، ولایۃ الفقیہ" میں امامت و ائمہ کے بارہ میں وہی خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، جو ان کو مقامِ ربوبیت تک پہونچاتے ہیں، اور ان کو ہر نبی اور ملک سے افضل ثابت کرتے ہیں، اور یہ کہ کائنات تکوینی طور پر ان کے تابع فرمان اور زیر اقتدار ہے[۲] اسی طرح ان کی فارسی کی کتاب "کشف الاسرار" میں صحابۂ رسول ﷺ بالخصوص خلفائے ثلاثہ کے متعلق جرح و تنقید ہی نہیں سبّ و شتم کے وہ الفاظ آئے ہیں، جو کسی بڑی سے بڑی ضال و مُضل، فاسق و فاجر، دنیا پرست اور سازشی جماعت کے لئے آسکتے ہیں۔[۳]

ایک غیر متوقع ردِّ عمل

اس صورت حال کے پیش نظر اس بات کی پوری توقع تھی کہ عقیدہ و بنیاد کے اس کھلے ہوئے اختلاف، اُمت کے بنیادی عقیدۂ توحید میں رخنہ اندازی،

---

[۱] ملاحظہ ہو سر ولیم میور، وھیری (WHLRRY) الین پول، یا سورت اسمتھ، پروفیسر آرنلڈ اور پروفیسر فلپ ہٹی کی تصریحات قرآن مجید کے محفوظ ہونے کے بارہ میں "دو متضاد تصویریں" ص ۷۸-۷۹

[۲] الحکومۃ الاسلامیہ ص ۵۲ [۳] ملاحظہ ہو "کشف الاسرار" (فارسی) ص ۱۱۳-۱۱۴

مشارکت فی النبوۃ (جو امامت کی تعریف اور ائمہ کے شیعی اوصاف کا لازمی و منطقی نتیجہ ہے) اور صحابۂ کرام کی شخصیتوں پر (جو مسلمانوں کے یہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ قابلِ احترام اور قابلِ محبت شخصیتیں ہیں) طعن و تشنیع کے بعد کم سے کم اس حلقہ میں جو سُنّی العقیدہ ہے ان کی دعوت مقبول نہیں ہوگی، اور ان کو اسلامی انقلاب کا علمبردار، حکومت اسلامی کا مؤسس و بانی اور مثالی رہنما اور قائد نہیں سمجھا جائیگا لیکن یہ دیکھ کر صدمہ بھی ہوا اور حیرت بھی کہ مسلمانوں کے ایک حلقہ میں ان سے ایسی عقیدت و محبت کا اظہار کیا جا رہا ہے، جو اس عصبیت کی حد تک پہونچ گئی ہے، جو تنقید کا ایک لفظ سننے کی روادار نہیں ہوتی، مدح و ذم اور تعریف و تنقید کا معیار کتاب و سنّت، اُسوۂ سلف اور عقائد و مسلک کی صحت نہیں، بلکہ اسلام کے نام پر مطلق حکومت کے قیام کا نعرہ، طاقت کا حصول کسی مغربی طاقت کو للکار دینا اور اس کے لئے (خواہ عارضی و ظاہری طور پر) مشکلات پیدا کر دینا، اس کو محبوب اور مثالی قائد بنا لینے کے لئے کافی ہے آیۃ اللہ خمینی صاحب کی اس کامیابی سے (جس کی مدتِ عمر معلوم نہیں) اور اس انقلاب سے جو ایک مخصوص شکل میں ایران کے معاشرہ میں رونما ہوا، ایرانی نوجوانوں کے جذبۂ قربانی اور اس کے ساتھ متعدد مسلم و عرب ممالک کی دینی و اخلاقی کمزوریوں و خامیوں اور وہاں کی ناپسندیدہ صورتِ حال[1] سے بّرِ صغیر کے

---

[1] جس پر راقم سطور اپنے مضامین اور خطبات میں برابر تنقید اور ان سربراہانِ مملکت سے جن سے ملاقات ہوئی صفائی سے اس کا اظہار کرتا رہا ہے، ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "حجاز مقدس و جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان" نیز "عالم عربی کا المیہ"۔

مسلمان نوجوانوں کے اس حلقہ میں جو موجودہ حالات سے بیزار تھا، اور جو ہر اُس حوصلہ مندی اور مہم جوئی سے مسحور ہوتا ہے جس میں اسلامی حکومت کا نام شامل ہوجائے، خمینی صاحب اس طرح بلکہ اس سے زیادہ مقبول ہو رہے ہیں جیسے کسی زمانہ میں ہندوستان میں کمال (اتاترک) اور عرب قوم پرستوں کے حلقہ میں جمال عبدالناصر تھے۔

سحر و دلکشی کے اسباب

تاریخ کی شہادت اور انسانی نفسیات کا بار بار کا تجربہ ہے کہ جب بھی بڑے سے بڑے فسادِ عقیدہ ضلالت اور کج روی کے ساتھ حوصلہ مندی، مہم جوئی اور تقشّف و جفاکشی کے مظاہر جمع ہو جاتے ہیں تو اس تحریک و دعوت میں ایسی دلکشی اور ساحری پیدا ہو جاتی ہے کہ اچھے اچھے عاقل و ذکی، دین پسند اور صاحبِ مطالعہ و نظر اشخاص کو اس کے اثر سے محفوظ رکھنا اور اس کی ثناخوانی اور مدّاحی سے روکنا مشکل ہو جاتا ہے، قرنِ اوّل کے خوارج کی تحریک، چھٹی ساتویں صدی میں باطنیوں کی تحریک، اور حسن بن صبّاح اور قلعۂ اَلَموت کے فدائیوں کے کارناموں اور خود ہندوستان کی بعض نیم عسکری تحریکوں اور تنظیموں کے بارہ میں حوصلہ مند نوجوانوں اور اقتدار و سیاسی طاقت کی شمع کے پروانوں کی والہانہ و خود فراموشانہ کیفیات (جن کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا) اس کی گواہ ہیں، اور یہی مرحلہ حق و ہدایت کو معیار سمجھنے والوں اور عقیدۂ صحیحہ اور منصوصاتِ قرآنی کے بارہ میں حمیّت و غیرت رکھنے والوں کے لئے امتحان کا موقعہ ہوتا ہے، اور ان کو اس اعلانِ حق کی دعوت دیتا ہے جو سحر انگریزی کی

اس فضا میں "کلمۃ حقٍّ عند سلطان جائرٍ" کا ثواب و مقام دلانے کا ضامن ہوتی ہے۔

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی کتاب "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت"

۱۹۸۴ء میں برصغیر ہند و پاکستان میں خمینی صاحب کی دعوت اور ایرانی انقلاب کے سلسلہ میں حوصلہ مند طبیعتوں اور عالم اسلام کے جمود، متعدد مسلم ممالک میں دینی تحریکوں کی مخالفت اور دنیا کی دو عظیم طاقتوں (امریکہ اور روس) سے اپنی قسمت کو وابستہ کرنے اور ان کے سایہ میں زندگی گذارنے والے متعدد عرب و مسلم ممالک کے حالات سے بیزار مسلمانوں کی نفسیاتی کیفیت یہی ہو گئی تھی کہ انھوں نے علامہ خمینی کو اس افسردہ اور تاریک فضا میں روشنی اور امید کا ایک روشن ستارہ اور "امام منتظر" کی حیثیت دینی شروع کر دی اور بہت سے سنجیدہ اور اسلامی الفکر اہلِ قلم اور داعیوں نے عقیدہ و مسلک اور ضلالت و ہدایت کے فرق و امتیاز اور اس حقیقت سے آنکھیں بند کر کے کہ خمینی صاحب کی اس دعوت و تحریک کا اثر اسلام کے پورے ذخیرۂ نبوت محمدی کی مساعی اور نتائج اور اسلام کے پورے تاریخی کردار پر کیا پڑے گا، ان کی حمایت شروع کر دی۔

اس صورتِ حال سے متاثر ہو کر رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی

---

[1] کبھی کبھی رجحان عام، ایک بڑے طبقہ کی پسندیدگی اور طاقتور تاثر اور بہت سے اہلِ علم اور اہلِ قلم کی کسی تحریک کی تائید "سلطان جائر" کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جس سے اختلاف اور تنقید کسی سلطنت اور اقتدار سے اختلاف و تنقید سے کم خطرناک نہیں ہوتی۔

نے جوادیان وفرق کے تقابلی مطالعہ کے پرانے ماہر اور میدان مناظرہ کے ایک تجربہ کار سپاہی اور مجاہد تھے، اور عرصہ تک امام اہلِ سنّت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کی زندگی میں دارالمبلغین میں تدریس و تربیت کی خدمت انجام دے چکے تھے، اپنے امراض و پیرانہ سالی کے باوجود "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" کے عنوان سے ایک مدلّل اور مفصل کتاب لکھی، جس میں صحابۂ کرام، خلفائے راشدین، امامت اور ائمہ کے عقیدہ اور تحریفِ قرآن کے دعوی کے سلسلہ میں فرقہ اثنا عشریہ کی مستند اور متفق علیہ کتابوں کی شہادتیں پیش کیں، پھر ثابت کیا کہ آیت اللہ خمینی صاحب بھی انھیں عقائد کے قائل اور داعی ہیں، اور اس کے ثبوت میں ان کے رسائل وکتب کے (جن کا ان کی تصنیف ہونا ان کے حامیوں اور ان کتابوں کے مترجمین کو بھی تسلیم ہے) اقتباسات پیش کئے۔[1]

مولانا نے اپنے قدیم تعلق ومعمول کے مطابق راقم سطور سے اس پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی، میں نے اواخر اکتوبر، اوائل نومبر ۱۹۸۴ء میں اپنے بمبئی کے قیام میں یہ خدمت انجام دی، اور کتاب کا اجمالی تعارف کرایا۔

"دو متضاد تصویریں"

لیکن مجھے کتاب کے مطالعہ کے دوران بشدّت اس کا احساس ہوا کہ

---

[1] اس کتاب کے اردو میں ہندوستان اور پاکستان میں متعدد ایڈیشن نکلے، خاص طور پر پاکستان میں اس کی وسیع پیمانہ پر ایک تحریک ودعوت کی شکل میں اشاعت ہوئی، عربی اور بعض دوسری زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے۔

اس تقابلی اور مباحثانہ انداز سے ہٹ کر ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو خالی الذہن سلیم الفطرت اور عقلِ عام رکھنے والوں کے لئے رہنما اور فیصلہ کن ہو، جس میں تشیعیت اور آیت اللہ خمینی صاحب کے ان عقائد کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ، عقل سلیم، فطرتِ انسانی، مذاہب اور ادیان کی تاریخ کے مطالعہ، اقوام وملل اور افراد انسانی کی نفسیات سے واقفیت اور تاریخ انسانی کی انقلابی واصلاحی کوششوں اور تحریکوں کے نتائج کے بے لاگ جائزہ پر منحصر ہو، اور جو فیصلہ کر سکے کہ جو دین پوری نوع انسانی کو مخاطب کرتا، اس کو صحیح اعتقاد وعمل، اعلیٰ اخلاق وکردار کی دعوت دیتا، اور تمدّن ومعاشرۂ انسانی کی نئی تنظیم وتشکیل کا داعی ومدّعی ہو، اسی کے ساتھ وہ خدا کا آخری دین اور پیغام ہو جس کو قیامت تک باقی رہنا اور انسانوں کی تعلیم وتربیت کا فرض انجام دینا ہے، اس کی زندگی اور تاریخ کا عہد اوّل اور اس کے صاحب معجزات، نبیؐ صادق اور مؤیّد من اللہ پیغمبر کی صحبت وتربیت کا پہلا نمونہ اور اس کے دامنِ عاطفت اور آغوشِ نبوت میں براہ راست تربیت پانے والوں کا کردار کیا ہونا چاہیئے؟ اس کا اپنے اہل بیت کے ساتھ معاملہ اَللّٰھُمَّ لَاعَیْشَ اِلَّاعَیْشُ الْاٰخِرَۃِ (اے اللہ زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے) کہنے والے اور اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا (اے اللہ آل محمد کا رزق اتنا ہی رکھ کر جسم وجان کا رشتہ قائم رہے) کی دعا مانگنے والے کی طرح ہونا چاہیئے؟ یا ان بانیانِ سلطنت، خاندان پرور اور نسل پرست فاتحین کا سا جن کی ساری کوششوں اور مہم جوئیوں کا ماحصل اپنے خاندان کے لئے صدیوں تک کے لئے

سلطنت واقتدار، عیش وعشرت اور پیشوائی وسربراہی کے مستقبل کا تحفظ کر دینا ہوتا ہے، جس کی روشن مثالیں ایران کے ساسانی خاندان کے حکمرانوں اور مجوسیت کے دینی پیشواؤں کی تاریخ میں پائی جاتی ہیں؟ اس کے لئے قرآنی نصوص، معتبر تاریخ کی شہادتیں اور مؤرخین وفضلائے مغرب کے بیانات سے کام لیا گیا، اور پھر سلیم الطبع ناظر کتاب سے پوچھا گیا کہ سید المرسلین خاتم النبیین (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علوئے شان، بعثت عظمٰی کے مقاصد ونتائج، انسان کی فطری صلاحیت اور اصلاح پذیری کی رُو سے اور غیر جانب دار تاریخ کی شہادت کی روشنی میں کون سی تصویر حوصلہ افزا اور ہمت آفریں، اور ایک صاحبِ انصاف کے لئے قابلِ قبول اور مطابقِ واقعہ ہے۔ ع

خود تو منصف باش اے دل این نکو یا آن نکو!

اس کتاب کی اس طرز پر تصنیف کا ایک محرّک یہ بھی تھا کہ مصنّف کو اپنے ذاتی مشاہدہ اور مطالعہ اور دعوتی کاموں کے سلسلہ میں اس کا عملی تجربہ ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کی جدید نسل کے تعلیم یافتہ اصحاب کی ایک بڑی تعداد نے (جدید تعلیم اور ماحول کے اثر اور اردو کے بلند پایہ لٹریچر سے بیگانگی کے نتیجہ میں) سیرتِ نبوی، اسلام کے عہد اول اور سیر صحابہ کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے، ان میں سے ایک بڑی تعداد نے نہ علامہ شبلی کی معرکۃ الآرا کتاب "الفاروق" پڑھی ہے، نہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی دل آویز تصنیف "سیرۃ الصدیق" نہ مولانا عبد السلام ندوی کی فاضلانہ کتاب "اسوۂ صحابہ" اور دار المصنّفین کے "سیر الصحابہ" کا سلسلہ،

وہ جب فرقۂ اثنا عشریہ کے ائمہ و مصنفین کی کتابوں کے صحابۂ کرام کے بارہ میں طویل اقتباسات اور نقول پڑھیں گے تو اس میں سے بہت سے صحابۂ کرام کے مرتبہ و مقام کے بارہ میں متشکک و متزلزل ہو جائیں گے[1] اس لئے ضرورت ہے کہ قطعی الثبوت اور متواتر اور مستفیض تاریخ سے نیز چند انصاف پسند شیعہ مصنفین اور اہل قلم اور بلند پایہ مستشرقین اور فضلائے مغرب کے صحابۂ کرام اور اسلام کے عہد اول کے بارہ میں بیانات اور شہادتیں پیش کی جائیں، ان دونوں مقاصد کے پیش نظر اس کتاب کی ترتیب عمل میں آئی، اور "دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں" کے نام سے ۱۹۸۵ء کے اوائل میں یہ کتاب اردو میں شائع ہوئی عربی میں اس کا ترجمہ "صورتان متضادتان" کے نام سے اور ISLAM AND THE EARLIEST MUSLIMS TWO CONFLICTING PORTRAITS کے نام سے انگریزی میں "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ" کی طرف سے ان کے تراجم کی طباعت و اشاعت عمل میں آئی پھر بہت جلد عمان اور قاہرہ سے اس کے عربی ایڈیشن اور متعدد مغربی زبانوں میں متعدد مقامات سے اس کے ترجمے شائع ہوئے، اور ایک ایسے علمی حلقہ کو اس کتاب نے متاثر و مطمئن کیا جو بحث و تردید کے متعارف اور قدیم طرز سے نامانوس بلکہ کسی حد تک متوحش تھا۔

بعض اہلِ تعلق کا استعجاب اور مصنّف کا اطمینان

یہ کتاب اگرچہ متکلمانہ اور مناظرانہ طرز پر نہیں لکھی گئی تھی، اور اس میں ادبی اور تاریخی ذوق رکھنے والوں کے لئے دلچسپی اور دل آویزی کا سامان بھی تھا،

---

[1] چنانچہ اس سلسلہ میں مصنف کے پاس اس تاثر کے بعض خطوط بھی آئے۔

پھر بھی راقم کے ان چند دوستوں کو میرا اس موضوع پر قلم اٹھانا پسند نہیں آیا جو مجھے دین کا ایک مثبت و ایجابی داعی "تاریخ دعوت و عزیمت" کا مصنّف اور ممالک عربیہ و اسلامیہ کو دعوتِ اصلاح و انقلاب دینے والا اہلِ قلم سمجھتے تھے، چنانچہ کئی دوستوں نے اس پر اظہارِ حیرت کیا، اور اپنی اس توقع کا اظہار کیا کہ میں ایسے قدیم متنازع فیہ مسائل پر قلم اٹھانے کے بجائے جس پر سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، دعوتی و اصلاحی، تاریخی و ادبی، اور اجتماعی و معاشرتی موضوعات کے دائرہ میں اپنی مساعی اور تحریری کاوشوں کو محدود رکھوں گا، میں نے اس پر نہ اُس وقت جب بعض حلقوں کی طرف سے اس پر سوال کیا گیا، ندامت کا اظہار کیا، اور نہ معذرت کا، اور نہ اِس وقت نادم اور معذرت خواہ ہوں، "کاروانِ زندگی" کی پہلی جلد کا مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہے کہ میں نے اپنی ساری ادبی و تاریخی مشغولیتوں اور دلچسپیوں اور دعوتی و تصنیفی مشغولیتوں کے باوجود ۱۹۵۶ء میں قادیانیت کے موضوع پر قلم اٹھایا[۱]، اور میری وہ کتاب اردو، عربی اور انگریزی میں شائع ہو کر مقبول و مشہور ہوئی، اور وہ اس موضوع کی مقبول و مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ شیعیت و قادیانیت دونوں میں ختمِ نبوّت کے انکار کی روح مشترک ہے[۲]، پھر جب اسلام کے سرحدی خط (LINE OF DEMARCATION) کو کوئی دعوت و تحریک یا فرقہ و مسلک پھلانگ جائے تو پھر ایک داعی اور مصنف و اہلِ قلم کا رویہ اور

۱؎ ملاحظہ ہو "کاروانِ زندگی" حصہ اول باب شانزدہم (۱۶) ص ۴۴۷-۴۵۰

۲؎ ملاحظہ ہو امامت و ائمہ کے بارہ میں شیعی عقیدہ اور نقطۂ نظر، اور اس کا وحدتِ نبی اور ختمِ نبوت کے منافی ہونا "دو متضاد تصویریں" ص ۸۳-۸۶-۸۸

طرزِ عمل (خواہ وہ کتنا ہی فراخ دل اور وسیع النظر ہو) سکوت اور غیر جانب داری سے ہٹ کر بے لاگ اظہارِ حق اور آزادانہ احتساب کی طرف ہو جانا چاہیئے، امام ابوالحسن اشعری، امام غزالی، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیز صاحب تک سب کا طرزِ عمل یہی رہا ہے، ملیشیا اور انگلستان کے تازہ سفروں اور انڈونیشیا کے بعض علماء اور دین کے داعیوں کے خطوط نے اس کی توثیق کر دی اور اس سلسلہ میں اطمینان پیدا کیا کہ یہ فتنہ انتہائی شدید اور یہ مغالطہ (ان عناصر کے شامل ہو جانے کی وجہ سے جن کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے) اتنا ہی عمیق تھا کہ اس کا ناقدانہ جائزہ لینے اور دینی و علمی احتساب کرنے کی ضرورت تھی، اور الحمد للہ کہ یہ کام اپنے وقت پر ہوا، اور اب بھی اس کی افادیت و اہمیت باقی ہے کہ ایران کے انقلاب کی نوعیت اور جس خوں ریزی اور تشدّد کے ساتھ وہ رونما ہوا، پھر ایران و عراق کی مسلسل جنگ جس کو سات سال کی مدت ہو رہی ہے، خلیج کی پوری پٹی کے لئے خطرہ، پھر اس سب سے بڑھ کر ۱۴۰۷ھ (۱۹۸۷ء) کے حج کے موقعہ پر مکہ معظمہ میں ایرانیوں کے جارحانہ مظاہرہ اور حرمین کے سلسلہ میں ان کے خطرناک منصوبہ نے (جس کو فی الحال ناکام بنا دیا گیا) اس تنقید و احتساب کے کام کو جاری رکھنے اور ایران اور اس کی ذمہ دار حکومت کے اس رویّہ کی تنقید کی ضرورت پیدا کر دی ہے، جو عالم اسلام کے لئے خطرہ بن گیا ہے، اور جو اسلام کی تصویر غیر مسلموں کی نظر میں بگاڑنے اور اسلام اور تاریخ اسلام کے بارہ میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔

بابِ یازدہم[۱۱]

میرٹھ کا ہولناک فساد، اندرون و بیرون ملک کے چند سفر

میرٹھ کا ہولناک فساد

یوں تو ۱۹۴۷ء کے بعد فرقہ وارانہ فسادات ملک کے لئے کوئی غیر معمولی واقعہ اور نادر الوقوع حادثہ نہیں رہے، ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں مختصر اور طویل وقفوں کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوتے رہے ہیں، جن میں سے مراد آباد کے اس فساد کا تذکرہ جو ۱۳ راگست ۱۹۸۰ء کو عید کے روز عید گاہ میں عین عید کی نماز کے اختتام پر پیش آیا تھا، اور جس میں بڑی تعداد میں کم سن اور معصوم بچے جو نئے کپڑے پہن کر اپنے بزرگوں اور عزیزوں کے ساتھ عید گاہ آئے تھے، فساد کا نشانہ بنے، "کاروانِ زندگی" کی دوسری جلد میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے[۱]، اس کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر محدود اور وسیع پیمانہ پر فسادات ہوتے رہے۔

لیکن میرٹھ کا فساد جو مئی ۱۹۸۷ء میں ہوا، وہ غالباً سب سے لرزہ خیز اور ہولناک فساد تھا، سوءِ اتفاق کہ یہ رمضان کا مبارک مہینہ بھی تھا اور بہت سے وہ مسلمان جو فساد کی زد میں آئے روزہ سے تھے، یہ فساد اس تحریر کے وقت تک (جبکہ اس پر چار[۴] مہینے گذر چکے ہیں) ابھی تک فریقین کی تنظیموں کے ذمہ داروں

---

[۱] ملاحظہ ہو "مراد آباد کا المیہ" ص ۳۱۵-۳۱۹

اور ملک کے بہی خواہوں اور دردمندوں کا موضوعِ سخن اور مرکزِ فکر بنا ہوا ہے،
فساد کے پس منظر، محرکات واسباب اور اس میں پیش آنے والے لرزہ خیز مظالم اور
ان کے اثرات کے بیان کرنے کے لئے مضمون کے بجائے ایک پوری کتاب درکار
ہے، اور ممکن ہے وہ مختلف گوشوں میں وجود میں بھی آئی ہو، اس پر تفصیلی بحث
اور ذمہ دارانہ تبصرہ اس کتاب کے حدود سے خارج ہے، لیکن اپنی ہی ریاست
میں ایک ایسے شہر میں پیش آنے کی وجہ سے جو ایک اچھی علمی، دینی اور وطنی تاریخ رکھتا
ہے، جہاں سے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا پہلا شرارہ بلند ہوا جس کے گرد و نواح
میں برصغیر ہند و پاک کے عظیم ترین تعلیمی مرکز[1] اور شہرۂ آفاق روحانی و تربیتی مراکز
(خانقاہیں) اور مردم خیز قصبات ہیں[2]، اور پھر وہ دارالسلطنت دہلی سے
تھوڑے ہی فاصلہ پر واقع ہے، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں پر نہایت اختصار کے ساتھ ممتاز غیر مسلم اہلِ قلم اور صحافیوں کے
تین بیانات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مسٹر نکھل چکرورتی نے جو ہندوستان کے ایک سینیر صحافی اور مصنف ہیں،
اپنے ہفت روزہ اخبار (MAIN STREAM) میں جو پڑھے لکھے طبقوں میں بہت
مقبول ہے، لکھا کہ:۔

---

[1] دارالعلوم دیوبند (جو ازہر ہند کی حیثیت رکھتا ہے) اور مظاہر علوم سہارن پور واقع ہے،

[2] مثلاً خانقاہ امدادیہ، تھانہ بھون، گلشن رحیمی قصبہ رائے پور (ضلع سہارنپور) خانقاہوں
میں، قصبات میں نانوتہ، تھانہ بھون، گنگوہ کیرانہ وغیرہ ہیں، جو ہمسایہ اور متصل اضلاع مظفر نگر
اور سہارنپور میں واقع ہیں۔

"میرٹھ میں جو کچھ مئی کے مہینہ میں ہوا وہ فرقہ وارانہ فساد کے اس روایتی اور عام انداز سے بہت مختلف ہے، جب کرفیو کم ہوا اور علاقہ سے باہر والوں کے رابطہ ٹوٹ جانے کا خاتمہ ہوا تو وہاں سے ہیبت ناک کہانیاں باہر آنے لگیں، اور میرٹھ کی ۱۹۸۷ء کی داستان آہستہ آہستہ ہمارے شعور کی تہوں میں پڑنے لگی لیکن اب بھی یہ پوری داستان سامنے نہیں آئی، اور کم لوگ ایسے ہیں، جن کو اس کے مضمرات کا پوری طرح احساس ہے، ایک خاص جگہ پر P.A.C کے دستے اچانک نازل ہوئے، غریب مسلمانوں کے دروازے کو کھٹکھٹا کر اندر گھس گئے، جن کو (خاص طور سے نوجوانوں کو) پکڑ سکے پکڑ لے گئے، ان کو P.A.C کی ٹرکوں میں بھرا، دور دراز جگہ پر لے گئے، ٹرکوں سے اتارا، لائن میں کھڑا کیا، پھر ان کو گولی مار کر لاشیں دریا میں ڈال دیں۔"

(ٹائمز آف انڈیا ۱۴ رجون ۱۹۸۷ء)

انگریزی اخبار (THE TELEGRAPH) میں شری شنکر کرشن ٹھاکر کی ایک رپورٹ کا اقتباس:۔

"آج ملیانہ کی حالت قابل رحم ہے، یہاں کے وہ مرد عورتیں اور بچے جو پناہ لینے کی غرض سے گاؤں کے اندرونی علاقوں میں بھاگے ان کو رگید اگیا اور گولیوں سے بھون دیا گیا، پی، اے، سی کے جوان مسلمانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے اور صحنوں میں پناہ گزیں نہتے مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا، بہت سے افراد کو زندہ جلایا گیا، تین ۳ گھنٹوں کی

ایک خون آشام آتش زنی، فائرنگ اور لوٹ مچاتے کے بعد پی اے سی کے جوان چلے گئے، تو دیکھا گیا کہ چھبیس ۲۶ مکانات ملبوں کا ڈھیر ہو چکے ہیں اور چالیس ۴۰ افراد ہلاک ہو گئے ہیں (ہلاک شدگان کی صحیح تعداد کا اب تک پتہ نہیں لگایا جا سکا ہے، کیونکہ یہاں کے لوگ بڑی تعداد میں غائب ہیں)"

مشہور صحافی کلدیپ نیر لکھتے ہیں:-

"میرٹھ شہر کے نزدیک ملیانہ گاؤں میں جو گھناؤنے قتل ہوئے انھیں الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، ایسا کوئی گھر نہیں جس پر گولیوں کے نشان نہ ہوں، اور ایسا کوئی کنبہ نہیں جن کا کم از کم ایک فرد نہ مارا گیا ہو، میں اس المیہ کے چوبیس ۲۴ گھنٹے کے اندر وہاں گیا، یہ علاقہ یوں دکھائی دیتا تھا، گویا جنگ میں تباہ ہو گیا ہو، مرد لوگ پناہ کے لئے بھاگ گئے تھے، تقسیم ملک کے وقت میں نے سرحد کے دونوں طرف جو مظالم دیکھے تھے، وہ یہاں دہرائے گئے تھے۔"

ٹائمز آف انڈیا نے اپنی اشاعت (۱۴ر جون ۱۹۸۷ء میں) مسٹر نکھل چکرورتی کے مقالہ کا عنوان (HITLER BARBARIES IN MEERUT) (میرٹھ میں ہٹلری بربریت) دیا ہے۔

اس فساد پر کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد بھی ایسے وحشیانہ اور انسانیت سوز واقعات پیش آتے رہے، جن کو سن کر ہر محب وطن ہندوستانی اور انسانیت دوست انسان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے، اخباروں کی مصدقہ رپورٹ کے مطابق ۲۲ر جولائی ۱۹۸۷ء کو شب میں دو مختلف بسوں کے مسلمان مسافروں کو اتار کر

مارا پیٹا گیا جس کی وجہ سے بارہ[۱۲] مسلمان جن میں عورتیں اور بچے شامل ہیں،
شہید ہوئے غیر سرکاری رپورٹوں میں مرنے والوں کی تعداد پندرہ[۱۵] سے زیادہ
بتائی جاتی ہے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے بیان کے مطابق جو ٹائمز آف انڈیا
مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا نفیس احمد نے جو ایک بس پر دہلی سے
بجنور کے لئے سفر کر رہے تھے، رپورٹ کی کہ رات کو ۱۰ بجکر ۴۵ منٹ پر پینتیس[۳۵] یاترپوں
نے ولید پور سے کچھ پہلے بس کو روکا، اور بس میں زبردستی داخل ہو گئے، ولید پور
پہونچنے پر عید گاہ کے قریب ایک مشتعل مجمع نے بس کو روک کر حملہ کر دیا، ایک ہی
فرقہ کے مسافروں کو تحقیق کر کے اتارا گیا، اور بری طرح سے پیٹا گیا، اس کے
نتیجہ میں آٹھ[۸] آدمی اسی جگہ شہید ہو گئے۔

اسی طرح کے (بس کے مسافروں پر حملہ کے) دو[۲] اور لرزہ خیز واقعات پیش آئے،
جن کا بعض سرکاری رپورٹوں میں حوالہ، اور اسپتال میں داخل ہونے والے
بعض زخمیوں کے بیانات میں تذکرہ ہے۔

حکومت نے میرٹھ کے فساد کی تحقیق کے لئے ایک سہ رکنی سرکاری کمیٹی
کا تقرر کیا، ہندوستان ٹائمز کے بیان کے بموجب کمیٹی کا اندازہ یہ ہے کہ فسادات
پوری طرح سے پہلے سے تیار کردہ منصوبہ کے تحت ہوئے، اور ضلع انتظامیہ نے
قطعاً پیش بینی اور منصوبہ بندی سے کام نہیں لیا، کہ وہ صورت حال سے نپٹ
سکتی، چنانچہ اس نے سنگین رخ اختیار کر لیا، کمیٹی نے جو رپورٹ ۱۸ ستمبر کو
حکومت کو پیش کی اس میں کہا گیا ہے کہ رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے معاملہ کو
فرقہ وارانہ جذبات بھڑکانے کے لئے استعمال کیا گیا، ۱۸ مئی سے قبل ہی فریقین

شدید اختلافات کا شکار ہو چکے تھے، کمیٹی نے اس بات کی تردید کی ہے کہ فساد میں کسی پاکستانی کا ہاتھ تھا، یا غیر ملکی ساخت کے اسلحہ استعمال کئے گئے، بہت سے مقامات پر بہت زیادہ طاقت گرفتاریاں کرنے اور پوچھ گچھ کرنے کے درمیان استعمال کی گئی، ہاشم پورہ کے علاقہ میں کہا جاتا ہے کہ پولیس نے طاقت کا بہت زیادہ استعمال کیا، کمیٹی کا کہنا ہے کہ آئندہ فسادات کی روک تھام کے لئے ضروری ہے کہ بابری مسجد، رام جنم بھومی تنازعہ جلد سے جلد حل کیا جائے، اور اقلیتی فرقہ میں تحفظ کا احساس پیدا کرنے کے لئے مؤثر اقدام کئے جائیں۔[1]

ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ میں بھی اُتر پردیش پی، اے، سی کے کردار کو میرٹھ کے فسادات کے سلسلہ میں آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے، اور کہا گیا ہے کہ اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ اس نے درجنوں نہتے لوگوں کو دانستہ سازش کے تحت موت کے گھاٹ اتار دیا۔[2]

علالت اور دہلی و بمبئی کا سفر

تقدیری بات تھی کہ رمضان مبارک کے دوسرے عشرہ کے اخیر دنوں میں (ٹھیک انھیں دنوں میں جب میرٹھ کا فساد شروع ہوا) میں شدید طور پر علیل ہو گیا جس کی وجہ سے عشرۂ اخیر کے روزے بھی چھوڑنے پڑے، اور قربِ مکانی کے باوجود میں عید کی نماز میں بھی شریک نہیں ہو سکا، ڈاکٹروں نے جن میں سے کئی تجربہ کار ڈاکٹر اور مخلص دوست تھے[3]، خون کی شدید کمی کی بنا پر جس نے خطرناک صورت حال اختیار کر لی تھی، خون چڑھانے کے لئے اصرار کیا، لیکن میں اس کے لئے تیار نہیں ہوا، اور خارجی علاج پر اکتفا کیا گیا،

---

[1] منقول از "قومی آواز" لکھنؤ۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۸۷ء۔ [2] "قومی آواز" ۲۱ نومبر ۱۹۸۷ء باختصار۔

[3] مثلاً محترمی ڈاکٹر سید قمر الدین صاحب سول سرجن نانڈیر (مہاراشٹر) اور کرنل محسن شمسی صاحب۔

عید کے بعد محبّ گرامی ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین صاحب قریشی نے اصرار کر کے علاج و آرام کے لئے اپنے مکان واقع اکبری گیٹ لکھنؤ میں ٹھہرایا، اور بڑی توجہ اور دل سوزی سے علاج و آرام کی فکر رکھی۔ ۱۰-۱۲ دن ان کے یہاں ٹھہر کر دار العلوم کے مہمان خانہ میں منتقل ہو گیا۔

اسی دوران محترمی جناب حکیم عبد الحمید صاحب (ہمدرد فاؤنڈیشن دہلی) نے دہلی آنے کی بہ اصرار دعوت دی، تاکہ وہ اپنی نگرانی میں طبی امتحانات اور جانچیں کرائیں اور ٹسٹ اور اکسرے کے ذریعہ مرض کی نوعیت معلوم کی جائے، حکیم صاحب اور محترمی سید حامد صاحب (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) دونوں دہلی ایرپورٹ پر تشریف لے آئے، اور طے ہوا کہ اگلے ہی روز مجیدیہ ہاسٹل تغلق آباد منتقل ہو جایا جائے، جہاں حکیم صاحب اپنی نگرانی میں ہر طرح کے طبی انتظامات فرمائیں گے، چنانچہ اس پر عمل کیا گیا، اور اسپتال، کالج اور اس اہم طبی مرکز کا پورا عملہ حکیم صاحب کی خصوصی توجہ کی وجہ سے سرگرم عمل ہو گیا، اور اس نے زیادہ سے زیادہ راحت و طبی سہولت پہونچانے کی کوشش کی، جو کسی طبی ادارہ اور مرکز میں ممکن ہے، وہاں ضروری مدت تک قیام کر کے، عزیز گرامی مولوی معین اللہ صاحب ندوی اور عزیزی عبد الرزاق اور عزیزی مولوی نثار الحق ندوی کی معیت میں بمبئی کا سفر اختیار کیا کہ دہلی میں شدید گرمی پڑ رہی تھی، اور بالکل بارش نہ تھی، بمبئی میں معمول قدیم کے مطابق محبّی الحاج غلام محمد (محمد بھائی) مالک بمبئی آندھرا ٹرانسپورٹ کی وسیع فرودگاہ سہاگ پیلیس واقع مدنپورہ کی نویں منزل میں دو ہفتے قیام رہا، صرف جمعہ کی نماز کے لئے دو مرتبہ

باہر نکلنا ہوا، ضعف اور ناطاقتی اتنی محسوس ہوتی تھی کہ اس منزل میں بھی چند قدم چلنا اور ٹہلنا بار معلوم ہوتا تھا، فرائض پنجگانہ کی ادائیگی، اور آرام و خورد و نوش کے علاوہ "کاروانِ زندگی" کی اس تیسری جلد کی تسوید کا کام صبح ۸ بجے سے ۱۲ بجے تک جاری رہتا جس میں عزیزی مولوی نثار الحق ندوی معاون اور شریک کار تھے، ۳۰ جولائی ۱۹۸۷ء کو عید الاضحیٰ کے قرب کی وجہ سے عزیز میزبان کے مزید قیام کے لئے اصرار کے باوجود لکھنؤ واپسی ہوئی۔

لندن اور کویت کا سفر

اگست کے دوسرے ہفتہ میں اسلامک سنٹر آکسفورڈ یونیورسٹی کے ڈائرکٹر عزیز گرامی ڈاکٹر فرحان احمد نظامی آکسفورڈ سے سفر کر کے لکھنؤ پہونچے اور انھوں نے اسلامک سنٹر کے ٹرسٹیز کی اس سالانہ میٹنگ میں شرکت کے لئے اصرار کیا جو ۲۷ اگست ۸۷ء کو آکسفورڈ میں منعقد ہونے والی تھی، جس کا نوٹس تمام ارکان کو بھیج دیا گیا تھا، اور جس میں میرے شرکت نہ کرنے کی وجہ سے قانونی کمزوری پیدا ہو جاتی، اس لئے کہ اس مرحلہ پر صدر کا شریک ہونا بہت اہمیت رکھتا ہے، میں نے اپنے ضعف و علالت کا عذر کیا، لیکن انھوں نے بھی اور اہلِ تعلق نے بھی اس سفر کی افادیت پر اس حیثیت سے بھی زور دیا کہ وہاں ماہرین فن اور اہلِ اختصاص (SPECIALISTS) سے مرض کی تشخیص بھی کرائی جا سکتی ہے، اور طبی مشورہ بھی لیا جا سکتا ہے، پھر موسم کے فرق کی وجہ سے وہاں پہونچ کر یہاں کی گرمی سے نجات بھی ملے گی اور آرام کا موقعہ بھی، اپنی طبعی کمزوری کی

بناء پر بھی کہ میں احباب کے خواہشات اور فرمائشوں کی زیادہ زور اور ثابت قدمی کے ساتھ مقاومت (RESIST) نہیں کر سکتا، پھر کچھ احساس ذمہ داری اور مخلصین کی تائید اور ہمت افزائی سے سفر پر آمادہ ہو گیا، فرحان صاحب نے آکسفورڈ ہی سے میرے اور عزیزی مولوی محمد رابع حسنی کے لئے (جو سنٹر کے رکن اور ایک ٹرسٹی بھی ہیں) B. O. A. C. کی پرواز ۲۶ راگست کی دو۲ فرسٹ کلاس سیٹیں ریزرو کرالیں، اور برطانوی سفارت خانہ میں ویزا کے لئے ہدایت بھی آگئی۔

ڈاکٹر فرحان نظامی نے یہ فرمائش بھی کی کہ میں اسلام مسلمانوں اور علم کے تعلق پر کوئی مقالہ بھی تیار کر کے لاؤں، جو یونیورسٹی میں پڑھا بھی جا سکے، میں نے عجلت میں "صحیح علم کی اشاعت و ترقی اور اس کے ذریعہ سے انسانیت کی رہنمائی اور اصلاح میں اسلام کا تاریخی کردار" کے عنوان سے ایک مضمون تیار کیا، جس کا ترجمہ بڑی عجلت اور نہایت خوبی کے ساتھ محب گرامی سید محی الدین صاحب نے تیار کر دیا۔

۲۶ راگست کو صبح ۷ بجے B. O. A. C. کے طیارہ سے براہ دبئی و کویت لندن روانگی ہوئی، اس سفر میں (پچھلے سفر کی طرح) اللہ نے عزیزی محمد اسحاق سلمہ مالک ایرانڈ بائیٹری کانپور کی شکل میں ایک رفیق بھی عطا فرما دیا جن کو اصلاً چند روز بعد انگلینڈ و جرمنی کا اپنے تجارتی مقاصد کے لئے سفر کرنا تھا، لیکن انھوں نے میرے اشارہ پر اور میری راحت کے خیال سے سفر کو مقدم کر کے رفاقت اختیار کی، سفر جہاز کے دبئی و کویت لینڈ کرنے کی وجہ سے بہت طویل ہو گیا اور پورے چودہ ۱۴ گھنٹے طیارہ میں بیٹھنے کے بعد انگلستان کے وقت کے لحاظ سے

۴ بجے شام کو اور ہندوستان کے حساب سے ۸½ بجے رات لندن پہونچنا ہوا، ڈاکٹر فرحان احمد نظامی، ڈاکٹر براؤننگ کے ساتھ (جو سنٹر کے ایک ممتاز کارکن و ذمہ دار ہیں، اور یونیورسٹی کے ایک اہم کالج کے سابق وائس پرنسپل رہے ہیں) ان کی کار میں جس کو خود ڈاکٹر براؤننگ ڈرائیو کر رہے تھے، کچھ وقفہ کے ساتھ ایرپورٹ پر ملے، اور ہم عصر کی نماز پڑھ کر ان کے ساتھ آکسفورڈ روانہ ہو گئے، جو لندن سے تقریباً ۷۰-۵۰ کلومیٹر ہے (تقریباً وہی فاصلہ جو لکھنؤ، کانپور یا لکھنؤ رائے بریلی کے درمیان ہے) آکسفورڈ پہونچا تو جسم تکان سے چور چور تھا، علالت کے قرب اور اس کے بقیہ اثرات اور ۱۴ گھنٹے کی مسلسل نشست کی وجہ سے (جس میں فرسٹ کلاس ہونے کی وجہ سے تھوڑی دیر لیٹنے کا ضرور موقعہ ملا تھا) غیر معمولی تکان محسوس ہوا، لیکن عزیزی فرحان نظامی کے گھر والوں کی محبت و مہمان نوازی جو بالکل اہل خاندان جیسی تھی، اور خاص طور پر فاضل گرامی محترمی پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کی موجودگی، بزرگانہ شفقت اور مفید و معلومات افزا صحبتوں اور مجلسوں نے سفر کی طوالت کے احساس اور تکان کو بہت کم کر دیا۔

آکسفورڈ اور لندن میں

۲۷ راگست کو ٹرسٹیز کی میٹنگ ہوئی، اور معلوم ہوا کہ میرا آنا اس حیثیت سے وصول ہو گیا کہ متعدد بلند مرتبہ ارکان (جن میں رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف، اور جامعۃ الامام محمد بن سعود کے

وائس چانسلر شیخ عبداللہ عبدالمحسن ترکی خاص طور پر قابل ذکر ہیں) اپنی اہم مصروفیتوں کے باوجود اس توقع پر آئے کہ میں (اپنی علالت و مصروفیت کے باوجود) جلسہ میں شریک ہو رہا ہوں، یونیورسٹی کے نمائندوں کے علاوہ ڈاکٹر کامل الباقر سابق وائس چانسلر اُمّ درمان اسلامک یونیورسٹی اور کویت کے ممتاز ذی علم اور مخیّر تاجر شیخ عبدالعزیز العلی المطوّع بھی موجود تھے، جلسہ میں ساری اہم باتیں بڑی سہولت اور اعتماد و تعاون کی فضا میں طے ہوگئیں، میں نے اپنی صحت، عمر، اور موانع کو پیش نظر رکھ کر مناسب سمجھا کہ ایک نائب صدر کا انتخاب ہو جائے جو میرے نہ پہونچ سکنے پر مجلس کی صدارت کے فرائض انجام دے سکے، میں نے اس منصب کے لئے ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف صاحب کو موزوں سمجھا اور رفقاء سے مشورہ کرکے نیابت صدارت کے لئے ان کا نام پیش کیا، جو بالاتفاق منظور ہوا۔

۲۹ اگست ۱۹۸۷ء کو سینٹ کراس کالج ST. CROSS COLLEGE آکسفورڈ OXFORD UNIVERSITY میں شیخ عبدالعزیز المطوّع لکچرز سیریز کا افتتاح میرے اس مقالہ سے ہوا، میں نے ابتدا میں عربی میں ایک تمہیدی تقریر کی اس لئے کہ جلسہ میں متعدد عرب فضلاء موجود تھے، اس کے بعد ڈاکٹر فرحان نظامی سے درخواست کی کہ وہ میرا مقالہ پڑھ کر سنائیں، انھوں نے بڑی برجستگی کے ساتھ مقالہ پڑھا، اور لوگوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ سُنا، مقالہ کے ذیلی عنوانات سے اس کے مندرجات کا اندازہ ہو جائیگا، پھر آخری ٹکڑا اپنی خاص اہمیت کی وجہ سے ناظرین کے سامنے پیش کیا جائیگا۔

نبوت محمدی کا اعجاز اور انقلابی کارنامہ، غیر متوقع آغاز، انفس وآفاق اور اقوام وملل کے ماضی پر غور وفکر کی دعوت اور اس کے فائدے، علمی منتشر اکائیوں میں وحدت وربط، مغرب کی بیداری اور علم وتہذیب کے نئے دور کے آغاز میں اسلام کا حصہ، قدیم دنیا میں مسلمانوں کا علمی تفوّق اور مفید اور تجربی علوم میں ان کی قیادت، مسلمان مُوجدینِ فن اور ماہرینِ علوم۔

آخر کے ٹکڑہ کا ایک مختصر اقتباس پیش ہے:۔

"اس مقالہ کے اختتام سے پہلے میں آپ کی توجہ اس بنیادی حقیقت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ہمیں یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے، انسان اپنی ذات سے علم کا نہ منبع ہے، اور نہ منتہیٰ، وہ صرف اللہ کی مرضی کو پورا کرنے والا، نائب یا نمائندہ ہے، قرآن مجید نے حضرت آدم کو "تعلیم اسماء" (جو علم کی بنیاد ہے) کا ذکر، ان کے زمین میں خلافت الٰہی کے منصب پر سرفراز ہونے کے تذکرہ کے بعد اور اس سیاق وسباق (CONTEXT) میں کیا ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے علم کا استعمال "خلیفۃ اللہ" کی حیثیت سے کرنے پر مامور تھے، علم کی تاریخ بلکہ تاریخ عالم کا یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ انسان نے یہ فراموش کر دیا کہ وہ خالقِ کائنات کا نائب اور خلیفہ ہے، اسے اس دنیا کی امانت سپرد کی گئی تھی، مالک اور آقا بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا کہ وہ زمین کے اوپر اور اس کے اندر پائے جانے والے

خزانوں کو اپنے ذاتی، قومی، نسلی اور طبقاتی مفاد کے لئے، یا سیاسی برتری حاصل کرنے کے لئے استعمال کرے۔

انسانیت کی تاریخ اور علم دونوں کے لئے وہ منحوس ترین دن تھا، جب اس نے تباہی کے اس راستہ کا انتخاب کیا، صرف یہ احساس کہ انسان اس دنیا کا مالک ہونے کے بجائے، خدا کا خلیفہ یا نائب ہے، اسے صراط مستقیم پر قائم رکھ سکتا ہے، کیونکہ اس حقیقت کا عرفان ہی اسے من مانی کارروائی کرنے میں مانع ہو سکتا ہے"۔

آکسفورڈ میں فرحان نظامی صاحب کے مکان پر تین روز قیام رہا، جس کا سب سے بڑا فائدہ اور سب سے بڑی لذت پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کی علمی صحبتیں تھیں، اس لئے کہ ان دو نشستوں کے بعد وہاں کوئی اور کام نہ تھا، ہندوستان کی اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے عہد پر جیسی وسیع اور عمیق خلیق صاحب کی نظر ہے، برصغیر میں کم لوگوں کی ہوگی، چونکہ راقم کا بھی یہ محبوب موضوع ہے، اس لئے ان مجلسوں کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔

لندن میں عرصۂ دراز سے عزیزی مسعود احمد لکھنوی کے مکان پر قیام رہتا ہے، وہ ادھر کچھ عرصہ سے بیمار چل رہے تھے، اس لئے ان کو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا، لیکن وہ خود گاڑی لے کر آئے اور ہم تینوں (راقم، محمد رابع، اور محمد اسحاق) کو ساتھ لے گئے، اور باوجود اپنی طویل بیماری، ضعف اور تنہائی کے انھوں نے میزبانی اور آرام پہونچانے میں کوئی کمی نہیں کی۔

ڈاکٹر فرحان نظامی نے لندن کے مشہور اسپتال کراموِل ہاسپٹل

CRONWELL HOSPITAL کے ایک مشہور اسپشلسٹ (DR. BRIAN G. GAZZARD) سے طبی معائنہ اور مشورہ کے لئے وقت مقرر کر رکھا تھا، انھوں نے دو مرتبہ کی حاضری میں طبی جانچیں کیں، اور موجودہ صورت حال پر کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا، کچھ طبی مشورہ دینے اور رپورٹ بعد میں بھیجنے کا وعدہ کیا، جو ہندوستان پہنچ کر ملی، اور جو اطمینان بخش تھی، والغیب عند اللہ تعالیٰ۔

ہندوستان واپسی

علالت کے اثرات اور عام ضعف کی وجہ سے میں نے اپنے میزبانوں اور احباب کو تاکید کر دی تھی کہ لندن میں کوئی پروگرام نہ رکھا جائے، انھوں نے اس پر عمل کیا، عزیزی اسحاق نے تو لندن پہنچ کر اپنی تجارتی ضرورتوں سے اجازت لی، ان کو یہاں کام ختم کر کے جرمنی جانا تھا، میں اور محمد رابع یوم یکشنبہ ۶ ستمبر کو کویت ایرویز سے ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے، اور سفر کے تسلسل اور طوالت سے بچنے کے لئے دو روز کے لئے کویت ٹھہر گئے، وہاں بھی کوشش کی گئی کہ پروگرام نہ ہوں لیکن محبّ قدیم کویت کی سربرآوردہ و باوجاہت دینی شخصیت اور تاجر شیخ عبداللہ العلی المطوّع کی دعوت میں شرکت کرنی پڑی، جو انھوں نے بڑے شاندار اور وسیع پیمانہ پر اپنی کوٹھی میں کی، اور کویت کے متعارف و واقف احباب کو مدعو کیا، دوسرے اسی دن جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی میں رسالہ "المجتمع" کی طرف سے منعقد کئے ہوئے مکالمہ اور مجلس میں شرکت کرنی پڑی جس میں اس وقت مختلف مسلم ممالک میں

اسلامی بیداری اس کو زیادہ مؤثر اور کامیاب بنانے کے سلسلہ میں مدیر المجتمع کی طرف سے سوالات کئے گئے، جن کا زیادہ تر روئے سخن راقم کی طرف تھا، دو دوسرے عرب فاضل اور اہلِ فکر مہمانوں نے بھی حصہ لیا، اس کی روئیداد "المجتمع" میں شائع ہوئی۔

کویت میں دو دن عزیزی سید ابراہیم حسنی ندوی، اور عزیزی سید منظر عالم ندوی کے یہاں ہو کر ہم لوگ ۸ ستمبر کو برٹش ایرویز سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے، اور بخیر و براحت تمام ۹ ستمبر ۴ بجے دہلی پہونچ گئے، وہاں چند گھنٹے قیام کرکے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوگئے۔

والحمد للہ اولاً و آخراً۔

باب دوازدہم

حجاز کا سفر، رابطہ کے مؤتمر اسلامی عام سوم میں شرکت، حجاز کی مصروفیات و محاضرات

رابطہ کی تیسری عمومی اسلامی کانفرنس

رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ (جس کی مجلس تاسیسی کا راقم سطور شروع سے بنیادی ممبر ہے) کے سکریٹریٹ (امانت عامہ) نے طے کیا تھا کہ وسط اکتوبر ۱۹۸۷ء میں (۱۱ر-۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۷ء - ۱۸ر-۲۲ر صفر ۱۴۰۸ھ) میں اپنی تیسری عمومی اسلامی کانفرنس منعقد کرے، جس میں عالمِ اسلام کے موجودہ حالات و مسائل اور مشکلات و ضروریات کا جائزہ لیا جائے اور ان تدابیر و مساعی پر غور کیا جائے، جو ان کے حل کرنے میں مدد دے سکتی ہیں، اس مؤتمر کا (جو ایک طویل وقفہ کے بعد اس پیمانہ پر ہو رہی تھی) خاص موضوع زمانۂ حال اور مستقبل کے حقائق کی روشنی میں دعوت اسلامی کے کام کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانا بھی تھا، مختلف ممالک اسلامیہ کے مسائل و ضروریات اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی صورتِ حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے اس سلسلہ میں رابطہ کی مساعی اور اس کے تعاون و رہنمائی کی روئیداد پیش کرنے کی ضرورت کے علاوہ، غالباً حرم کے

نامبارک حادثہ نے (جو ایرانیوں کی ہنگامہ آرائی کے نتیجہ میں عین ایام حج میں ۶ ذی الحجہ کو مکہ معظمہ میں پیش آیا تھا) اس عمومی کانفرنس کے منعقد کرنے کے خیال کو تقویت پہونچائی تھی، جس میں بڑی سے بڑی تعداد میں عالمِ اسلام کے علماء و فضلاء، ممالک اسلامیہ کے موقّر نمائندے اور اسلامی تحریکوں اور مسلم تنظیموں کے ذمہ دار شریک ہوں، اور وہ اس سلسلہ میں اپنے تاثرات کا اظہار اور حرمین شریفین کے تقدّس وحرمت اور وہاں فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے بے خطر اور پُرسکون ماحول اور بے نظیر امن وامان کی فضا قائم رکھنے کی جو ذمہ داری نہ تنہا حکومت سعودیہ بلکہ پورے عالمِ اسلام پر عائد ہوتی ہے، اس کا اظہار کر سکیں۔

مجھے کچھ تو اپنی صحت کی کمزوری اور کچھ عظیم و وسیع کانفرنسوں کے تجربہ کی بنا پر (جن کا عملی اور مفید نتیجہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے) اس مؤتمر میں اپنی شرکت کے بارہ میں خاصہ تردّد تھا، لیکن اخیر وقت میں اس بنا پر اس طویل سفر کے گوارہ کرنے اور کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ کیا کہ اس اہم موقعہ پر جب ممالک عربیہ بالخصوص سعودی عرب کی اہم علمی وفکری شخصیتیں، قائدین ورہنما اور خصوصیت کے ساتھ حکومت سعودیہ کے متعدّد ذمہ دار حضرات شریک ہوں گے، اس نازک اور پیچیدہ صورتِ حال میں جو ایرانی انقلاب اور خلیجی جنگ کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے، اور ان خطرات کے پیشِ نظر جو اُن عرب ممالک اور سعودی عرب کو درپیش ہیں، جہاں دولت کی فراوانی ہے، معیارِ زندگی انتہا درجہ کو پہونچ گیا ہے، اور تنہا بڑی طاقتوں کی امداد و حفاظت پر تکیہ اور انحصار ہے، کوئی دینی وایمانی تحریک ودعوت بھی موجود نہیں جس میں

خطر پسندی، مہم جوئی، جاں بازی، اور ایثار و قربانی کا جذبہ ہو، اس وقت ان ممالک بالخصوص سعودی عرب کو چند حقیقت پسندانہ وجرأت مندانہ مشورے دینے اور صفائی کے ساتھ حقائق وخطرات سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے، (جس کی توقع مسلسل تجربوں کی بنا پر دوسرے شرکائے مؤتمر سے بہت کم تھی) اخیر وقت میں اس سفر اور مؤتمر میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا اور نہایت عجلت ومصروفیت کی حالت میں "عصر حاضر میں دعوتِ اسلامی کے فیصلہ کن محاذ اور مرکزی میدان" کے عنوان سے ایک مضمون تیار کر لیا گیا۔

رابطہ کے سکریٹریٹ (امانت عامہ) نے اپنی اور مدعوین کی سہولت کے پیش نظر رابطہ کی مجلس تاسیسی اور "المجلس العالمی للمساجد" کے جلسے مؤتمر سے متصل ابتداء میں اور "المجمع الفقہی" کا اجلاس مؤتمر کے معاً بعد رکھا تھا، تاکہ وہ ارکان اور مدعو حضرات جو تینوں مجلسوں کے رکن ہیں، ایک ہی سفر میں تینوں میں شرکت کر سکیں، اور جو کسی ایک مجلس کے رکن ہیں وہ اس مؤتمر اور مجلس میں شرکت کر سکیں، میں اتفاقاً تینوں مجلسوں کا رکن ہوں لیکن تاخیر سے پہونچنے کی بنا پر صرف مؤتمر میں جو ۱۱ر اکتوبر سے شروع ہوئی تھی شرکت کر سکا، اور وقت کی کمی کی وجہ سے "المجمع الفقہی" کی صرف ایک نشست میں شریک ہوا۔

مکہ معظمہ کا سفر اور مؤتمر کی مصروفیت

میں ۹ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو عزیزی مولوی محمد رابع ندوی کی معیت میں

(جو رابطہ کے اکثر جلسوں اور سعودی عرب وحجاز کے مجالس وتقریبات میں زیادہ تر میرے ہم سفر اور معاون رہے ہیں، اور وہاں کی شخصیتوں اور حالات سے سب سے زیادہ واقف ہیں) جمعہ کے دن لکھنؤ سے صبح کی پرواز سے دہلی روانہ ہوا، چونکہ قریبی تاریخوں میں دہلی سے سعودی عرب کے لئے کوئی ایسی پرواز نہ تھی جس سے میں اتوار ۱۱ر اکتوبر کے ابتدائی وتمہیدی جلسہ میں شریک ہو سکتا جس سے مؤتمر کا افتتاح ہونے والا تھا، اس لئے دہلی سے بمبئی کا راستہ اختیار کیا اور ہفتہ ۱۰ر اکتوبر کو وہاں چند گھنٹے گذار کر شام کی پرواز سے جو بعد مغرب متصلاً وہاں سے چلتی ہے جدّہ کے لئے روانہ ہوا، بڑی فکر تھی کہ ریاض کے ہوائی اڈہ پر اترنا ہوگا، اور کاغذات کی جانچ کے لئے بڑی مسافت طے کرنی ہوگی، جو صحت کی موجودہ صورت حال اور پیدل چلنے کی دقّت کی صورت میں میرے لئے بہت دشوار تھا، لیکن اللہ جزائے خیر دے محمد عثمان صاحب حیدرآبادی کو (جو جدّہ کے ہوائی اڈہ پر انجینیر کی حیثیت سے ایک ذمہ دارانہ عہدہ پر مامور ہیں) کہ وہ خاص طور پر اسی غرض کے لئے دن ہی میں جدّہ سے ریاض پہونچ گئے تھے، اور انھوں نے WHEEL CHAIR کا انتظام کر رکھا تھا، خود ہی سب کاغذات لے کر ضابطہ کی خانہ پُری کروادی اور مجھے ہر طرح کی دقّت سے بچا لیا، بمبئی سے محترمی محمد یونس سلیم صاحب اور سید شہاب الدین صاحب ایم، پی بھی ہم سفر ہو گئے تھے۔

ریاض سے چل کر تقریباً ۱۰ بجے شب کو جدّہ پہونچنا ہوا، جہاں ہمارے میزبان عبدالغنی نورولی خاندان کے افراد الحاج محمد نور صاحب کی سربراہی میں اور

جدہ، مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے احباب واعزہ موجود تھے، ہم لوگوں نے احرام بمبئی سے باندھ لیا تھا، لیکن صبح ۹ بجے ہی مکہ معظمہ کے انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کے قاعة التضامن الإسلامي میں ہونے والے افتتاحی جلسہ میں شرکت کرنی تھی جس میں سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف اپنی رپورٹ پیش کرنے والے تھے، اس لئے عمرہ کی ادائیگی کو شام تک کے لئے ملتوی رکھا گیا اور بعد نماز فجر کچھ دیر جدہ میں آرام اور ناشتہ کر کے مکہ معظمہ کے لئے روانگی ہوگئی، ہوٹل جس کے ہال میں جلسے ہونے والے تھے، مکہ معظمہ کے راستہ ہی میں پڑتا ہے اس لئے پہلے وہیں جانا ہوا، وہاں نماز ظہر تک شرکت کر کے اپنی قدیم قیام گاہ عزیزگرامی ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی کے مکان واقع شارع منصور پر آگئے مؤتمر کے تمام مہمان انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل اور فندق الجیاد میں قیام پذیر تھے، ان کے لئے رابطہ کی طرف سے سواریوں کا بھی انتظام تھا۔

عصر و مغرب کے درمیان ہم نے عزیزگرامی سید حسن طارق کی رہنمائی اور رفاقت میں عمرہ ادا کیا۔

مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی حرمت پر تقریر

اگلے دن دوشنبہ ۱۹ صفر ۱۲ اکتوبر ۸½ بجے صبح سے مؤتمر کی دوسری نشست شروع ہوئی، اندازہ ہوا کہ عالم اسلام میں رباط و مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک اور بیرونی دنیا میں یورپ اور امریکہ سے لے کر مشرق اقصیٰ تک کے مسلمان فضلاء، مسلم تنظیموں کے ذمہ دار، اور دینی دعوت کے قائدین و کارکن

اور بہت سے مدعو حضرات بڑی تعداد میں آئے ہوئے ہیں، جو سات سو تک پہونچتی ہے۔

مجھے مکہ معظمہ پہونچنے پر معلوم ہوا کہ دوسرے دن (آج کے) اجلاس میں مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کی حرمت پر میری تقریر چھپے ہوئے پروگرام میں شامل ہے، مجھے اس عنوان کی اہمیت و موزونیت کی وجہ سے اطمینان و خوشی ہوئی کہ میں اس عنوان سے کچھ کام کی باتیں عرض کر سکوں گا، مختلف موضوعات پر دوسرے فضلاء کی تقریروں کے بعد اس موضوع پر میری تقریر شروع ہوئی، اس تقریر میں مجھے صاف محسوس ہوا کہ اس میں مقام کی برکت، حرم کے جاں نواز، روح پرور اور خیال افروز جھونکوں کی کارفرمائی بھی شامل تھی، میں نے قرآن مجید کی سورۂ حج کی اس آیت سے اپنی تقریر کا آغاز کیا:۔

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ	اور جو کوئی بھی (حرم کے اندر) کسی
نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ	بے دینی کا ارادہ ظلم سے کریگا ہم اسے
(سورۂ حج۔ ۲۵)	عذاب دردناک چکھائیں گے۔

میں نے عرض کیا کہ یہ آیت قرآن مجید کا مستقل معجزہ اور خدا کے علم محیط و ازلی کی ایک نشانی ہے، چھٹی، ساتویں صدی عیسوی تک متمدن دنیا بالخصوص جزیرۃ العرب کو صرف ایک ہی خطرہ اور ایک ہی طرح کے حملہ کا تجربہ تھا، اور وہ میدانی جنگ کا خطرہ اور کھلے ہوئے فوجی حملہ کا تجربہ تھا، اس کا ایک نمونہ اسی مقدس سرزمین نے ابرہہ کی لشکر کشی اور اصحاب فیل کی فوجی پیش قدمی کی صورت میں دیکھا، جس کو اللہ تعالٰی نے بُری طرح سے پسپا اور ناکام بنا دیا، اور

اس کے بارہ میں ایک پوری سورہ (سورۃ الفیل) نازل فرمائی، لیکن اس بلدِ امین بیت اللہ اور مرکزِ عالم کے خلاف گہری سازشوں، معنوی تحریفات اور ملحدانہ منصوبہ بندیوں کا کوئی تجربہ نہ تھا، لیکن اس علیم و خبیر خدا نے جس نے یہ آخری کتاب نازل کی اس کی طرف سے بھی آگاہی دے دی کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے، اور اس سے بھی خبردار رہنا چاہیے، اور اس کی سزا اور انجام بھی بتادیا کہ "نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ"۔

میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی تعریف میں "قِيَامًا لِّلنَّاسِ" فرمایا ہے، جو ایک بہت عمیق اور وسیع المعنیٰ لفظ ہے، اس کی وسعت و معنویت کی (جیسا کہ میں نے امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیلؒ اور رابطہ کے امین عام ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کی موجودگی میں لکھنؤ کے عظیم استقبالیہ جلسہ میں کہا تھا) تشریح و ترجمانی مشکل ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مستقبل انسانیت، اور امن عالم کے بہت سے انتظامات اور اس کی ضمانتیں اس بیت عتیق سے وابستہ ہیں، اور جب تک یہ اس عظمت و حرمت اور تحفظ و تقدس کے ساتھ قائم ہے، انسانیت کے روحانی و معنوی مفادات محفوظ ہیں[1]، جو اس تقدس و تحفظ پر دست اندازی کرے گا، اور اس مرکز توحید و عبادت و حفاظت انسانیت کو اپنے سیاسی اغراض اور اپنے اقتدار و قیادت کی بازی گاہ اور

---

[1] اس موقعہ پر بے اختیار فارسی کا وہ شعر یاد آتا ہے، جس کا مفہوم عربی میں سمجھانا مشکل اور نازک تھا، لیکن باذوق قارئین کے لئے اس کا نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا ؎

از صد سخن پیرم یک نکتہ مرا یاد است ۔۔۔ عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

میدان بنائیگا، اس کو اللہ تعالیٰ خائب و خاسر بنادے گا۔

حضرات ایہیں سے (پرانے محاورہ کے مطابق) (ایک پرتاب تیر کے فاصلہ پر) سردار قریش اور جدّ رسول اعظم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حملہ آور ابرہہ سے کہا تھا کہ "اِنَّ للبیت ربًّا یحمیہ" (اس گھر کا بھی ایک مالک و پاسبان ہے، جو اس کی حفاظت کرے گا) یہ اس وقت بھی ایک حقیقت اور امر واقعہ تھا جس کا ظہور ہوا، اس وقت بھی ہے، اور قیامت تک بھی رہے گا۔

میں نے یہ بھی کہا کہ یہ بھی اس موضوع کے عالمگیر ہونے اور پوری اُمت مسلمہ سے تعلق کی دلیل ہے کہ اس موضوع پر تقریر کرنے کی خدمت وسعادت ایک ہندی نژاد کے سپرد ہوئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ بیت اللہ کا احترام اور مدینہ طیّبہ سے عقیدت ومحبت اسلامی شعور، ایمان اور اسلام سے وابستگی کا ایک نشان اور اس کی ترقی و نقص کو معلوم کرنے کے لئے مقیاس الحرارت (BAROMETER) کا کام دیتا ہے، جب تک ان دونوں مقامات سے مسلمانوں کا والہانہ تعلق اور قلبی وجذباتی لگاؤ ہے، اور وہ ان دونوں محبوب ومحترم مقامات پر کسی کی غلط نگاہ پڑنے کے روادار نہیں اس وقت تک ان کا رشتہ اسلام سے مستحکم اور ان کا دین محفوظ ہے، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اسی جاں نثارانہ جذبہ اور قلبی ربط و شیفتگی کی بدولت جو ملّت اسلامیہ ہندیہ کی پوری تاریخ میں کارفرما نظر آتی ہے) نعت کا بہترین کلام اسی برِصغیر میں فارسی اور اردو میں وجود میں آیا جس کی مثال (میرے علم ومطالعہ میں) کسی دوسری اسلامی زبان میں نہیں پائی جاتی، اور حرمین کی زیارت کے شوق میں، اور

وہاں آنکھوں اور پلکوں کے بل پہونچنے کے ارمان میں بہترین اور مؤثر ترین اشعار کہے گئے، اسی نے ملت اسلامیہ ہندیہ کو اپنے تشخص و ایمان سے دستبردار اور لادینی، قومی تحریکوں کا شکار ہونے سے بچایا اور اس کی حفاظت کی درحقیقت حرمین ہی کی حفاظت کا جذبہ تھا جس نے ہندوستان کی تحریک خلافت میں وہ جوش پیدا کر دیا تھا جس کی مثال کسی دوسری تحریک میں دیکھنے میں نہیں آئی، یہی جذبہ ترکوں میں بھی کارفرما تھا جب سلطان ترکی وحید الدین سے کہا گیا کہ آپ کی فوجی قیادت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب سے صرفِ نظر کر لیا جائے کہ ترکی فوجیں اب اتنے وسیع رقبہ اور مملکت کے اپنے دور دراز حصوں کی حفاظت نہیں کر سکتیں تو سلطان ترکی نے رقت آمیز لہجہ میں کہا کہ پھر ہمارا ترک سپاہی کس شوق اور جوش میں میدان جنگ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے گا، اور اپنی جان پر کھیل جائے گا؟

میں نے اس موقعہ پر علامہ اقبال کا ایک اردو شعر یہ کہتے ہوئے پڑھا کہ میں اس موقعہ پر شاعر اسلام ڈاکٹر محمد اقبال کا ایک شعر پڑھنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ یہاں پاکستان و ہندوستان کے متعدد سربرآوردہ اردو داں حضرات موجود ہیں، اقبال نے اسی جذبہ سے سرشار ہو کر کہا ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

پھر میں نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔

الحمد للہ اس تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا، اور بعض بلند پایہ حضرات نے راقم سے اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا۔

دوسری نشستیں، مقالہ اور آخری تقریر

کانفرنس میں بہت بڑی تعداد میں مندوبین آئے تھے، جن میں سے (خاص طور پر ممالک عربیہ کے بہت سے فضلاء اور نوجوان راقم کی عربی تصنیفات کے ذریعہ متعارف تھے، وہ بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملتے تھے، اپنے ملکوں میں آنے کی دعوت دیتے تھے، اور ان میں سے بہت سے سوال و جواب کرتے اور ریکارڈ بھی کرتے جاتے، ہر نشست کے بعد (بعد نماز ظہر) کسی معزز میزبان کی طرف سے بہت بڑے پیمانہ پر ایک دعوت ہوتی جس میں شرکت سے انھیں تاثرات کا اظہار ہوتا جن کا تمہید میں اظہار کیا گیا ہے، اور اندازہ ہوتا کہ معیار زندگی اور دعوتوں کا پیمانہ یہاں کس نقطۂ عروج تک پہونچ گیا ہے، عصر کے بعد کمیٹیاں اپنا کام کرتیں، جن میں میں شریک نہیں ہو سکا، رات کو جدّہ میں کسی معزز عہدہ دار مملکت اور با وجاہت شخصیت کی طرف سے دعوت ہوتی جس سے واپسی قدرۃً دیر رات میں ہوتی، میں اسی دشواری کی وجہ سے جدّہ کی کسی دعوت میں شریک نہیں ہو سکا۔

مؤتمر کے چوتھے دن چہار شنبہ ۱۲؍ صفر ۱۴۰۰ھ ۱۴؍ اکتوبر کو بعد نماز مغرب مجھے اپنا مضمون پڑھنے کا موقعہ ملا، جس میں شروع میں عوام و خواص کے مختلف میدانوں میں اسلامی شعور اور دینی بیداری پیدا کرنے اور پھر اس کی تربیت اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے نمبروار کچھ نقاط (POINTS) پیش کئے گئے تھے، جو تقریباً میری پرانی تقریر "القرن الخامس عشر الهجري الجديد"

فی ضوء التاریخ والواقع[۱] سے ماخوذ تھے، لیکن اس مضمون کا سب سے اہم حصہ جس کے لئے درحقیقت اس سفر کی صعوبت گوارہ کی گئی تھی، اس کا آخری حصہ تھا جس کو ممالک عربیہ بالخصوص مرکز اسلام کی موجودہ صورت حال، حقائق اور پیش نظر خطرات کی روشنی میں لکھا گیا تھا، اس ٹکڑے کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے[۲]۔

"آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ اسلام کی فطرت، اس کی تابناک تاریخ فطرتِ سلیم کا تقاضہ، اور بنی نوع انسان کی طبعی خصوصیت کا یہ مطالبہ ہے کہ ایک دعوتی، ایمانی حرکت مسلمانوں میں ضرور قائم رہے جو ایجابی انداز کی ہو اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہو، داعیوں میں مردانہ صفات ہوں، بلند حوصلگی ہو، ان کی نگاہیں بلند اور حقیقت رس ہوں، اور وہ دنیا کی عظیم طاقتوں سے آنکھیں ملا سکیں، وہ طاقتیں جو (بزعم خود) مسلم وغیر مسلم قوموں اور ملکوں کی تقدیر کی بنانے والی اور ان کے مسائل کا فیصلہ کرنے والی بن گئی ہیں، لیکن یہ بات کہ داعی الی اللہ ان صفات کا حامل ہو یا ان کے اندر یہ صفتیں پیدا ہو جائیں اس وقت ممکن ہے جب کہ وہ پورے یقین اور اطمینان قلب کے ساتھ ایک طاقتور دعوتی تحریک میں شریک ہوں، ان کے اندر اسلام کی برتری کا عقیدہ ہو، اور اس بات پر ان کو یقین ہو کہ انسانیت اس دین کی محتاج اور ضرورت مند ہے۔

دعوتِ اسلام کی سرگرمی میں قربانی کا جذبہ، سرفروشی کی دھن، کو گنی کی

---

۱ اردو میں اس کا ترجمہ "پندرھویں صدی ہجری ماضی وحال کے آئینہ میں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۲ اس پورے مضمون کا ترجمہ مکہ معظمہ ہی میں عزیز گرامی ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی نے کیا تھا جو رسالہ "ذکر وفکر" نومبر ۱۹۸۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔

ہمت، تکلفات سے بری زندگی گزارنے کی عادت اور اگر ضروری ہو تو خطرات میں کودنے کی جرأت (مغامرہ- RISK) بھی مطلوب ہے، کیونکہ فطرتِ انسانی یہ ہے کہ وہ اسی ایمان کی عزت کرتی ہے جس میں قوت ہو، اس فرد کے احترام پر مجبور ہوتی ہے، جس کو اپنے اصول و عقائد پر اعتماد ہو، اور ان کو قابلِ فخر سمجھتا ہو، جس کے یہاں لذت اندوزی اور مال و جاہ کی بے وقعتی ہو، اور جس کے اندر اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنے کی ہمت ہو، انسانی فطرت ہمیشہ اس کے سامنے جھکتی ہے جو شئے نایاب اور اس کی دسترس میں نہ ہو، کمزور انسان قوی انسان کے احترام پر فطرتاً مجبور ہے، غریب آدمی امیر کی عزت کرتا ہے، ناخواندہ پڑھے لکھے آدمیوں پر رشک کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک کمزور انسان بالاتر انسان کی عزت اپنے دل میں رکھتا ہے، اسلامی تاریخ جانبازی کے کارناموں اور خطرات کا مقابلہ کرنے کے واقعات سے پُر ہے، وہ اصحابِ علم و بصیرت جو اقوام و ملل کی تاریخ سے واقف ہیں، اور وہ لوگ جن کے ضمیر زندہ ہیں وہ مشرقی و مغربی قیادتوں (بلاکوں) سے اکتا چکے ہیں، اور اُن کے اندر ان سے نفرت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

ایک خلا کا پایا جانا یعنی ایسی تحریک ایمانی اور دعوتِ دینی کا نہ پایا جانا جو اپنی جگہ پر قوی بھی ہو، اور ایجابی بھی، اور ایک ایسی سوسائٹی کا نہ پایا جانا جو مضبوط بنیادوں پر قائم ہو اور مادی تمدنوں کی پیدا کردہ خرابیوں سے پاک ہو، اور جو اسلام کی تعلیمات اور اس کی قدروں کی محافظ ہو، ایسی سوسائٹی کا نہ پایا جانا، اور دعوتی خلا اسلامی وجود کے لئے بڑا خطرہ ہے

صحیح عقائد اور اسلامی زندگی کے لئے خطرہ ہے کیونکہ کسی ضروری چیز یا
جو بشریت کی نفع بخشی کے لئے ضروری ہو' خلا کا زیادہ مدّت تک باقی رہنا
غیر طبعی امر ہے' ایسے خلا کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی دوسری تحریک سامنے آئے گی
جو بے راہ روی کی دعوت دے گی' وہ عقائد کے لحاظ سے فاسد و گمراہ سلبی
و تخریبی مقاصد کی حامل ہوگی' جن لوگوں نے مذاہب' تحریکات اور مختلف قسم
کی دعوتوں کا مطالعہ کیا ہے' وہ جانتے ہیں کہ جب کوئی صحیح اور طاقت ور
اسلامی تحریک سامنے نہیں ہوتی تو ایک غلط قسم کی تحریک اس کی جگہ لے لیتی
ہے' اور اگر کہیں اس غلط قسم کی تحریک نے کسی درجہ میں خطرات کا مقابلہ
کر لیا اور کچھ قربانیاں دکھا دیں اور مادّی مظاہر سے اپنے آپ کو ذرا بلند
دکھا دیا' اور مسلم ممالک میں اسلامی تعلیمات سے دوری کی وجہ سے جو فساد
ہے' اس کی نشان دہی کر دی' اور بڑی طاقتوں کو ذرا للکار دیا' نعرہ بازیوں
سے فضا کو اپنے حق میں استوار کر لیا' اور پروپیگنڈوں سے اپنے تھوڑے کام کو
پہاڑ بنا کر پیش کر دیا تو پھر کیا ہے' لوگوں پر اس کا سحر چل جاتا ہے' اور سب
اندھا دھند اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں' خاص طور پر نوجوان تعلیم یافتہ
طبقہ یا نیم تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کی دھوم مچ جاتی ہے' اور وہ لوگ جو
بعض مسلم ممالک کی بے راہ روی جمود راحت پسندی اور بے عملی سے نالاں ہیں'
ان پر اس طرح کی تحریکوں کا ایسا جادو چل جاتا ہے' جس کو نہ کسی واعظ کا
وعظ دور کر سکتا ہے' اور نہ کسی صاحب ضمیر و قلم کا قلم' اور نہ کوئی منطقی
استدلال کام دیتا ہے' اور نہ کوئی علمی جائزہ اور تحقیق' پہلی صدی ہجری میں

خوارج کی تاریخ، چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں باطنیوں اور فدائیوں کی تحریک کی تاریخ، حسن بن الصبّاح کے افسانے اور جو اس کے مرکز عمل "قلعۂ الموت" میں ہوا کرتا تھا، اور بہتیری فوجی اور انقلابی تحریکوں کی تاریخ جو اسلام کے نام پر بگڑی ہوئی صورت حال کو از سر نو الٹ کر درست کرنے کا دعویٰ کرتی رہی ہیں، اور محض جھوٹ اور مکر و فریب کا لبادہ اوڑھ کر پبلک کے سامنے آئیں، اسی طرح بعض معاصر انقلابی و عسکری تحریکیں جنھوں نے اپنے ذاتی و سیاسی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہزاروں نوجوانوں کو اپنے گرد جمع کرلیا جو ہر قربانی کے لئے تیار نظر آتے تھے، یہاں تک کہ بعض دین پسند حلقے، اور باشعور جماعتیں بھی اس زد میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں، اور قرآنی نصوص اور اسلامی عقائد کی روشنی میں کسی کو جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی، اور نہ انھوں نے اسلام کی طرف نسبت کرنے والے فرقوں کا علمی و تنقیدی مطالعہ اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کا احتساب کرنے کی ضرورت سمجھی۔

مسلم زعماء و مفکرین کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ سیلاب کی رو کو ایک سیلاب ہی روک سکتا ہے، طوفان کا مقابلہ اس سے زیادہ قوت کا طوفان ہی کرسکتا ہے، عالم اسلام کی موجودہ جو حالت ہے اس کو معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ وہ جمود کی حالت میں ہے، اس پر راحت طلبی اور گراں خوابی طاری ہے، اس کے اندر کوئی ایمانی مضبوط دعوت نہیں ہے، اور نہ صحیح عقائد اور بلند و پاک مقاصد کے لئے قربانی اور فدائیت کا جذبہ ہے، فکری اور عسکری لحاظ سے بھی وہ خود کفیل نہیں ہیں، اور یہ بات ہمیشہ ایک خطرناک صورت حال

کے پیدا ہو جانے کی آگاہی دیتی ہے' اور ہر طور پر غلط قسم کی کھوکھلی تحریکوں کے جال میں نوجوانوں کو ڈال دینے کے لئے زمین ہموار کرتی ہے' کیونکہ نوجوان جو موجودہ صورت حال سے نالاں ہیں' اُن کو صحیح میدان عمل نہیں مل رہا ہے ان تحریکات کا باآسانی شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے اندر ان کو اپنے جذبات کی تسکین کا سامان نظر آتا ہے' اگرچہ ان تحریکات کی حیثیت اس سراب کی ہے' جس کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

کَسَرَابٍۭ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ	مثل سراب کے چٹیل میدان میں کہ
الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤی	پیاسا اس کو پانی خیال کرتا ہے
اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْئًا	یہاں تک کہ جب اس کے پاس
وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ	آیا تو اس نے کچھ بھی نہ پایا اور اس کے
حِسَابَهٗ۔ (سورۂ نور۔ ۳۹)	پاس (قضائے) الٰہی کو پایا سو اللہ
	نے اس کا پورا حساب چکا دیا۔

لیکن یہ انسانی فطرت اور اقوام و ملل کا تجربہ ہے' اور جو لوگ بھی "عصر جدید میں اسلام" اور اسلام کے مستقبل کی فکر رکھتے ہیں' اور جن کو عقیدہ کی صحت' خدا و رسول پر ایمان کی اہمیت و ضرورت اور تعلیمات دین عزیز ہیں' ان کو اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیئے۔

میں اپنا یہ مختصر مقالہ ایک قرآنی آیت پر ختم کرتا ہوں جس میں اللہ تعالےٰ نے انصار و مہاجرین کی اوّلین مختصر جماعت کو مخاطب فرمایا ہے' اور ان میں رشتۂ مواخات کے قیام سے ساری دنیا اور انسانیت کے مقدر کو مربوط کیا ہے۔

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ (سورۂ انفال پ۱۰،۷)

اگر یہ نہ کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔

۲۲ صفر ۱۵ اکتوبر پنجشنبہ کے دن مؤتمر کا اختتامی جلسہ ہوا، جس میں کمیٹیوں کی مرتّب کردہ قراردادیں پڑھی گئیں، شیخ عبد العزیز عبد اللہ بن الباز کی ایک رہنما اختتامی تقریر، ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف کی طرف سے شکریہ بھی ادا کیا گیا، آخر میں مؤتمر کے شرکاء اور مختلف ملکوں اور مسلم تنظیموں کے نمائندوں اور مندوبین کی طرف سے "کلمۃ الوفود" کے عنوان سے جو تقریر ہوتی ہے، وہ راقم کے سپرد کی گئی، میں نے اس تقریر میں شرکائے مؤتمر کی ان ذمہ داریوں کو یاد دلایا جو حرمین کے سلسلہ میں اور اس کے مقام و پیغام کے تسلسل و دوام کے تعلق سے ان پر عائد ہوتی ہیں، نیز خود ان کے ملکوں میں ان پر خدمت اسلام اور حفاظت ملّت کی جو ذمہ داریاں عائد ہیں، ان کو یاد دلایا اور عرض کیا کہ ہر مؤتمر اور مسلمانوں کے ہر اجتماع کا ایک وِداعی پیغام ہونا چاہیئے، جس کو شرکاء لے کر اپنے اپنے ملک (جہاں سے وہ دور دراز کا فاصلہ طے کر کے آئے ہیں) واپس جائیں، اور جس کو الکلمۃ الرائدۃ (ایک رہنما و نگراں عہد و وصیّت اور ایک رہبر اصول کہنا چاہیئے) میرے نزدیک اس کے لئے سب سے موزوں حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کا وہ تاریخی و ایمانی جملہ ہے، جو انھوں نے متعدد قبائل عرب کے ارتداد اور بیت المال کو زکوٰۃ سپرد کرنے سے انکار کے موقعہ پر کہا تھا، اور جس نے تاریخ کا رُخ اور واقعات کا دھارا بدل دیا اور شریعت و ملّت کو اس آزمائشی مرحلہ پر کہ وفات نبوی کو ابھی تھوڑا عرصہ گذرا تھا، ہزاروں برس کے لئے محفوظ کر دیا، انھوں نے فرمایا تھا،

"أینقص الدین وانا حیؓ" (کیا دین میں ترمیم و تنسیخ اس حالت میں ہوسکتی ہے کہ میں زندہ موجود ہوں) آپ بھی اس پیغام کو اپنے لوح قلب پر نقش کرکے اور اپنا رہبر و رفیق سفر بنا کر لے جائیں، اس کے ساتھ اس شعور و احساس اور عہد و پیمان کا بھی اضافہ کریں کہ کیا حرمین شریفین کے تقدس و حرمت پر کوئی آنچ آسکتی ہے اور ان پر ترچھی نگاہ ایسی حالت میں پڑسکتی ہے کہ ہم مختلف ملکوں کے مسلمان زندہ سلامت ہوں، اور اپنی آنکھوں سے یہ دیکھیں اور کانوں سے یہ سنیں؟

جلسہ سے فراغت کے بعد اسی روز بعد نماز عصر مہمانوں کی جدّہ کے ہوائی اڈہ سے مدینہ طیبہ روانگی کا انتظام تھا، جہاں ایک دن قیام کرکے ۲۳ صفر ۶؍ اکتوبر کو جمعہ کی نماز مسجد نبوی میں پڑھ کر اور امیر مدینہ کی دعوت میں شرکت کرکے ہوائی جہاز سے جدّہ واپسی تھی، میں نے اس قافلہ کے ساتھ جانے پر (جس میں بہت سی پابندیاں تھیں اور ایک دن کا قیام تھا) بطور خود حاضری اور اطمینان کے ساتھ چند دن قیام کو ترجیح دی۔

بلد امین (مکّہ) کی خصوصیات اور شعار و دعوت

ہفتہ کے روز ۲۴ صفر، ۷؍ اکتوبر کو مکہ کے بعض دوستوں نے مکہ کی ایک بڑی مسجد میں میری تقریر کا انتظام کیا تھا، محرّک خاص طور پر کچھ ہندوستانی احباب تھے، میں سمجھا کہ اردو میں خطاب ہوگا، وہاں پہونچا تو دیکھا کہ شیخ عبدالعزیز بن الباز (جن کا دفتر اور مکّہ کی قیام گاہ اسی محلہ میں اور مسجد سے قریب ہے) خطاب فرما رہے ہیں، میرے پہونچنے پر انھوں نے خطاب کو مختصر کیا، میں نے دیکھا کہ

عرب سامعین کا اچھا خاصہ مجمع ہے اور ہندوستانی بھی اچھی تعداد میں ہیں، میری دو کتابیں "ماذا خسر العالم" اور "صورتان متضادتان" جو حکومت قطر کے ادارۂ احیاء التراث الاسلامی سے اعلیٰ پیمانہ پر شائع ہوئی ہیں، وہاں بڑی تعداد میں موجود ہیں، اور لوگوں کو دی جارہی ہیں[1] میں نے سورۂ ابراہیم کا رکوع ۶ :-

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ (سورۂ ابراہیم - ۳۵)	اور جب ابراہیم نے دعا کی کہ میرے پروردگار اس شہر کو (لوگوں کے لئے) امن کی جگہ بنادے اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ بتوں کی پرستش کرنے لگیں بچائے رکھ۔

پڑھا، پھر ان آیات کی روشنی میں عرض کیا کہ ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کا دائمی پیغام نشان اور شعار، اور اس کی دعوت چار[2] اجزاء پر مشتمل ہے۔

۱۔ توحید خالص کی دعوت جو "وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ" (الیٰ قولہ تعالیٰ "وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝") سے عیاں ہے، شرک و بت پرستی کے اس عالمگیر دور ظلمت میں جس میں توحید کی جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی، صدیوں کے بعد یہ پہلی انقلاب انگیز و زلزلہ خیز صدا تھی، جو

---

[1] اس میں ہمارے فاضل دوست اور اس ادارہ کے ناظم و نگراں شیخ عبداللہ بن ابراہیم الانصاری کا بڑا حصہ ہے جو اس طرح کی مفید کتابیں حکومت کی اعانت سے شائع کرتے رہتے ہیں۔ [2] سورۂ ابراہیم ۳۵ تا ۳۷

اس مقام اور بانی بیت الحرام کی زبان مبارک سے بلند ہوئی۔

دوسرے عبادت دائمی اور اقامت صلوٰۃ کی وہ لافانی وصیّت جو حضرت ابراہیمؑ نے یہ کہہ کر ساکنانِ حرم اور اپنی اولاد کو دی:۔

رَبَّنَآ اِنِّیۡٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ	اے پروردگار میں نے اپنی اولاد
بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ	میدانِ (مکّہ) میں جہاں کھیتی نہیں
الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ	تیرے عزّت (وادب) والے گھر کے
(سورۂ ابراہیم ۔ ۳۷)	پاس لابسائی ہے اے پروردگار
	تاکہ یہ نماز پڑھیں۔

خود اس مقام کا انتخاب جو زراعت و تجارت اور تمدّن و ترقی کے بنیادی ولابدی اسباب سے خالی ہے، "بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ" اس شعور و عزم کو تازہ کرنے والا ہے کہ دنیا کے سرسبز و شاداب اور متمدّن و ترقی یافتہ شہروں اور تجارت و زراعت کے مرکزوں کو چھوڑ کر (جہاں سے حضرت ابراہیمؑ کا اس سفر ہدایت میں گذر ناہوا تھا) اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا گیا، اور اس کو بیت اللہ کی تعمیر اور آل ابراہیمؑ (معنوی و جسمانی دونوں طور پر) کی سکونت و قیام کے لئے کیوں ترجیح دی گئی؟

تیسرے اسباب کے بجائے خالقِ اسباب اور رب الارباب پر توکل کی تلقین و ہدایت ہے، جو ان کی اس دعا سے مفہوم ہوتی ہے:۔

فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ	تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ
تَهۡوِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُمۡ	ان کی طرف جھکے رہیں، اور ان کو

مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ میووں سے روزی دے تاکہ (تیرا) شکر کریں۔ (سورۂ ابراہیم۔ ۳۷)

اور جو انھوں نے خود آتش نمرود میں مومنانہ ومتوکلانہ طریقہ پر داخل ہو جانے کے عمل سے ثابت کر دیا کہ آگ عناصر اربعہ، اور فطری وتکوینی طاقتیں مامور ہیں آمر نہیں، ان کو خود اپنا خاصّہ ظاہر کرنے اور اپنا عمل کرنے کا اختیار نہیں، چنانچہ وہ آگ ان کے حق میں بردو سلام بن گئی۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا ہم نے حکم دیا اے آگ سرد ہو جا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ اور ابراہیم پر (موجب) سلامتی (بن جا)۔ (سورۃ الانبیاء۔ ۶۹)

اہل مکّہ اور ساکنان حرم کو ان تینوں خصوصیتوں کو اپنے سینہ سے لگائے رکھنا اور اپنا دائمی شعار بنانا ضروری اور مطلوب ہے، اس لئے کہ اس شہر کو البلد الأمین کہا گیا ہے، اس کی خصوصیات، اس کا مزاج اور اس کی فطرت زمانہ کے ہزاروں انقلابات، حکومتوں کے عروج وزوال، تمدّن وترقی کے تنوّعات واختلافات کے ساتھ یہی رہنی چاہیئے، اور اس پر انقلابِ زمانہ کا کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے، پھر میں نے تاریخ کی روشنی میں اور محققین ومستشرقین کے حوالوں سے بتایا، نیز حدیث صحیح کی سند سے بھی جس میں کہا گیا ہے کہ اس شہر وملک میں بُت پرستی لانے والا عمرو بن لُحیّ تھا، جو عرب کے باہر سے بُت پرستی لے کر آیا، اور اس نے اس کو رواج دیا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹتا ہوا چل رہا ہے[1]، محققین اور فضلائے مغرب کی بھی تحقیق

[1] بخاری۔ مسلم احمد۔

یہی ہے کہ مکہ اور طائف کے مشہور بُت ہُبل، لات، مناۃ، وعُزّیٰ اردن کے شہر بترا (PETRA) اور عراق وار دن سے در آمد (IMPORT) کئے گئے[1]، یہ اس سرزمین بلد امین کی چیز نہیں تھی، اور فتح مکہ میں بیت اللہ اور حرم کے ان بتوں سے خالی کر دیئے جاتے اور مکہ و طائف کو بتوں سے پاک کر دیئے جانے کے بعد پھر یہ سرزمین اساس ابراہیمیؑ پر آگئی، اور حدیث میں بشارت دی گئی ہے کہ آئندہ بھی یہ سرزمین عرب کھلی ہوئی بُت پرستی سے محفوظ اور پاک رہے گی، " الا اِنّ الشیطان قد أيس ان يُعبد فی بلدِکم ھذا ابداً[2] " اس سرزمین کے بلد امین ہونے کی صفت اور دعوت ابراہیمی کے علمبردار اور داعی و مبلّغ ہونے کی خصوصیت ہمیشہ باقی رکھنی چاہیئے کہ یہی اس سرزمین کا شرف اور یہاں کے رہنے والوں کا امتیاز اور فخر ہے۔

مکہ معظمہ و حرم کے تأثرات

عصر حاضر کی ترقیات، بیرونی دنیا کے اثرات، دولت و تجارت کی گرم بازاری کے باوجود جو حرم شریف کے چاروں طرف اپنے پورے مظاہر کے ساتھ موجود ہے، حرم شریف اور بیت اللہ کا ماحول اسی طرح نور بار، ضیا پاش، اور مہبط برکات و تجلّیات ہے، جیسے صدیوں پہلے تھا، بقول شاعر ؎

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشاں است
خم و خمخانہ با نام و نشاں است

اور بقول عارف رومی ؎

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "نبی رحمت" کا عنوان "مکہ میں بُت پرستی اور اس کا اصل سرچشمہ اور تاریخ" ص ۹۷...۸۰
[2] سنن ابن ماجہ ابواب المناسک۔

کعبہ را ہر دم تجلّی می فزود
ایں ز اخلاصات ابراہیم بود

ایک دن حرم سے واپسی پر کچھ ہندوستانی احباب قیام گاہ پر جمع ہو گئے اور فرمائش کی کہ کچھ تذکیر کے طور پر کہا جائے، میں نے ان کو حرم شریف میں حاضری، دعا و طواف اور بیت اللہ کے قرب و موجودگی سے (جس کی دولت ان کو خوش قسمتی سے میسّر ہے) زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی طرف توجہ دلائی، میں نے کہا کہ ہم کو یقین کرنا چاہیے کہ یہ چشمۂ فیض اسی طرح جاری ہے، جیسے صدیوں اور ہزاروں برس پہلے تھا، اور امّت کا بڑے سے بڑا آدمی (خواہ روحانی و علمی اعتبار سے ہو خواہ مادّی و سیاسی لحاظ سے) اس دربار کا سائل ہے، اور وہ اپنا جیب و دامن یہاں کی برکتوں اور نعمتوں سے بھر سکتا ہے، میں نے کہا کہ امّت محمدیہ کے اولیاء و اصفیاء میں جو شہرت و مقبولیت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کو حاصل ہوئی وہ سب کو معلوم ہے، لیکن آپ بھی اگر دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں، اور یہاں داخل ہوں تو بیت اللہ کا طواف وجد و والہانہ کیفیت میں فرمائیں گے، اور حسب ذیل اشعار وردِ زبان ہوں گے ؎

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو — شیئاً للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما — آفریں بر دست تو بازوئے تو

جب آپ کا یہ حال ہوگا تو ہمارا کیا حال ہونا چاہیے؟

ہفتہ ۲۴ر صفر، ۷ ار اکتوبر کو سعودی عرب کی جلیل القدر شخصیت شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ الباز صدر رابطۂ عالم اسلامی و صدر ادارۃ البحوث

والافتاء ریاض کی طرف سے بعد نماز جمعہ اپنے دولت خانہ پر کھانے کی مخصوص دعوت تھی، حسنِ اتفاق سے محترمی سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اور محبّی مکرم ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین صاحب قریشی بھی مکۂ معظمہ آئے ہوئے تھے، دوسرے رفقاء کے ساتھ وہ بھی اس میں شریک ہوئے، اور شیخ عبدالعزیز صاحب سے تعارف وگفتگو کا موقعہ ملا۔

مدینہ طیّبہ کی حاضری

۲۵ر صفر-۱۸ر اکتوبر یکشنبہ کو مدینہ طیبہ کے لئے روانگی ہوئی، عزیزی عبداللطیف ساعاتی جونپوری نے جو مکہ معظمہ کے قیام میں پہلے دن سے اپنی قیمتی کار کے ساتھ ہر وقت موجود رہتے تھے، اور وہی مؤتمر اور حرم شریف اور جہاں جہاں جانا ہوتا تھا لے جاتے تھے، اس عرصہ میں کسی سرکاری گاڑی کی نوبت نہیں آئی، انھوں نے مدینہ طیّبہ لے جانے اور وہاں کی مدّت قیام میں رہنے اور واپس لانے کی پیش کش کی جس کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا گیا صبح ۸ بجے کے قریب مکہ معظمہ سے روانگی ہوئی، اور مدینہ طیّبہ کے نئے راستہ طریق الہجرۃ سے سفر کیا گیا، جو مختصر ترین راستہ ہے، سڑک اس اعلیٰ پیمانہ کی ہے جس کی بڑے سے بڑے متمدّن ملک اور شہر سے توقع کی جاسکتی ہے، فاصلہ کے نشانات اور جگہوں کے نام کی تختیاں پوری سڑک پر لگی ہوئی ہیں ONE WAY TRAFFIC کا انتظام ہے، ایک راستہ جانے کا اور ایک راستہ آنے کا جس کی وجہ سے حوادث کا امکان کم سے کم رہ گیا ہے، دونوں طرف اس خطرہ سے کہ جانور

(خاص طور پر اونٹ جو موٹر کے لئے بہت خطرناک سمجھا جاتا ہے) اچانک سڑک پر نہ آجائے، تار لگے ہوئے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک حجاج و زائرین کے لئے تسہیل و راحت کے انتظامات کا تعلق ہے، سڑکوں کی تیاری، پانی کی فراوانی، اور امن و امان اور جان و مال کے تحفظ کا تعلق ہے، حکومت سعودیہ نے اس سلسلہ میں جو انتظامات کئے ہیں، اور جس دریا دلی اور فراخ حوصلگی سے اس پر صرف کیا ہے، اس کی مثال تاریخ میں اوپر صدیوں تک نظر نہیں آتی۔

راقم سطور کو اپنا پہلا حج یاد آتا ہے جو ۱۹۴۷ء یا ۱۳۶۶ھ میں ہوا تھا، جدہ سے مدینہ طیبہ کے درمیان سرے سے کوئی سڑک نہ تھی، بسوں کے ڈرائیور اندازہ سے چلتے تھے، گرمیوں میں دوپہر میں ان کو کہیں ٹھہرنا پڑتا تھا، پانی کے پیپے (ٹنک) جدہ اور مکہ میں بھی قیمتاً خریدنے پڑتے تھے، جن سے پیاس بجھائی جاتی اور وضو اور غسل کیا جاتا، اس سے پہلے راستوں کی دشواری اور ناہمواری، پانی کی قلت اور اس کی وجہ سے عرفات و منیٰ میں بکثرت موتیں، راستہ کی بدامنی، اور بدوؤں کی غارت گری اور سفاکی کی ہوش ربا داستانیں (جو ایک خبر متواتر کی حیثیت رکھتی ہیں) سعودی حکومت کے قیام سے پہلے کے عربی، اردو سفرناموں میں آسانی سے دیکھی جا سکتی ہیں[1]، اس انقلاب عظیم اور

---

[1] نواب حاجی احمد حسین صاحب رئیس حسن پور مراد آباد نے ۱۹۰۴ء میں حجاز کا سفر کیا تھا، انھوں نے مکہ مکرمہ پہنچنے سے پہلے ایک منزل پر قیام کیا وہاں اچانک بدوؤں نے حملہ کر دیا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"تمام بدو مسلح بندوقیں لے کر ادھر اُدھر بھاگنا شروع ہوئے، تمام قافلہ میں

(باقی ص۳۰۲ پر)

سعودی حکومت کے کارنامہ کا اعتراف نہ کرنا (سارے مخلصانہ مشوروں، داعیانہ وناصحانہ تنقیدوں اور نیک تمناؤں اور امیدوں کے ساتھ) ایک بڑی ناسپاسی اور حق پوشی کے مرادف ہے۔

ہم تقریباً چار گھنٹے میں (ایسی حالت میں کہ راستہ میں تیل لینے اور قدرے تفکّہ کے لئے ٹھہرنا پڑا تھا) مدینہ طیبہ پہونچ گئے، یہی سفر ہم نے ۱۹۴۷ء (۱۳۶۶ھ) کے حج میں ایک دن اور دو راتوں میں بس پر طے کیا تھا، اور اس سے پہلے خود برادر معظم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم نے جنھوں نے ۱۹۲۶ء (۱۳۴۴ھ) میں حج کی سعادت حاصل کی تھی، اونٹوں پر ۱۳ دن میں طے کیا تھا۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا؟

(باقی صا۳۰۱ کا)

شور اور کھلبلی مچ گئی، اور برابر بندوقوں کے فیروں کی کثرت سے آواز بڑھتی گئی، دو گھنٹے کامل یہی کیفیت رہی، اس کے بعد قلعہ سے ترکی فوج پلٹن مسلح روانہ ہوئی اور سامنے کی جھاڑیوں میں جا کر مورچہ بند ہو گئی، تھوڑی دیر کے بعد ترکوں نے چند بار بدوؤں کے مار بھگائے، اس وقت کے انتشار قافلہ کا حال لکھنا مشکل ہے، بالکل غدر ۱۸۵۷ء کی کیفیت تھی، تمام قافلے میں سب سے پہلے قوم جاوہ میں بھاگڑ پڑی کہ ان کے حواس صحیح نہیں تھے، اور اسباب کی گٹھریاں باندھ کر کسی نے بہنگی بنائی، کسی نے کمر پر بار کیا، کسی نے سر پر رکھا اور بھاگنا شروع کیا، سب لوگ اسباب اور شغدفوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔" (سفرنامہ حجاز ص۱۰۵ مطبوعہ کرزن اسٹیم پریس دہلی)

مدینہ طیبہ کا چند روزہ قیام

مدینہ طیبہ میں قیام اپنی قدیم قیام گاہ بستان نورولی میں ہوا جو عبدالغنی محمد نورولی کے فرم کے مالکان آل نورولی کی ملکیت ہے، پہلے سے طے کرلیا گیا تھا کہ اس سفر کا مقصد محض حاضری اور سلام ہے، تقریروں اور جلسوں کے پروگرام نہیں ہوں گے، اور اس سلسلہ میں دعوت دینے والوں سے معذرت کردی جائیگی، صرف رابطۃ الادب الاسلامی کی مجلس امناء (بورڈ آف ٹرسٹیز) کی نشستوں میں شرکت ہوگی، جس کے جلسے بعض مجبوریوں اور مصالح کی بناء پر اس سال قاہرہ یا دوسرے مقام کے بجائے مدینہ طیبہ میں رکھے گئے ہیں، وہ محدود اور مختصر نشستیں ہوں گی جن میں ارکان شریک ہوں گے، جن کی تعداد دس۱۰ بارہ۱۲ سے زیادہ نہیں، اس مجلس میں شرکت کے لئے لکھنؤ سے عزیزان مولوی سعید الرحمٰن ندوی استاد دارالعلوم و مدیر "البعث الاسلامی" اور مولوی محمد واضح (واضح رشید ندوی) استاد دارالعلوم و مدیر "الرائد" چہار شنبہ کو براہ راست مدینہ طیبہ پہونچ رہے ہیں، نیز پاکستان سے رفیق قدیم اور صدیق مکرم ادیب کبیر مولانا محمد ناظم صاحب ندوی سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء و شیخ الجامعۃ العباسیہ بہاول پور کراچی سے آرہے تھے، ان کے جدہ پہونچنے کی اطلاع مل گئی تھی۔

مسجد نبوی حاضر ہونے کے لئے عزیزی عبداللطیف کی کار اور عزیز گرامی سید حسن طارق (ٹیلیفون انجینیر مدینہ طیبہ) کی رفاقت کی وجہ سے (جو مدینہ طیبہ کے زمانۂ قیام کے حضرت شیخ الحدیثؒ کی وفات کے بعد مستقل میزبان ہوتے ہیں)

سہولت تھی، عصر کی نماز کے علاوہ جو اپنے ضعف و ماندگی اور مسجد شریف میں بہت سویرے ہونے کی بنا پر مجھے قیام گاہ پر پڑھنی ہوتی تھی، چاروں وقت حاضری کی توفیق ہوتی، کارباب السلام کے عین دروازہ تک پہونچ جاتی، اس مرتبہ ڈیوٹی پر متعین سپاہیوں نے جو کاروں کو دور روک دیتے ہیں بہت رعایت سے کام لیا اور دروازہ تک پہونچنے کی اجازت دی، مغرب اور عشا کے درمیان کا وقت حسب معمول مسجد شریف ہی میں گذارنے کی سعادت حاصل ہوئی، جو مختصر لیکن بڑا قیمتی اور مبارک وقت ہوتا ہے۔

اس مرتبہ اکثر حاضری کے موقعہ پر اقبالؔ مرحوم کے دو شعر بے اختیار زبان پر آجاتے اور حسب حال ہونے کی وجہ سے خاص لطف دیتے ؎

آہوئے زار و زبوں و ناتواں ، کس بہ فتراکم نہ بست اندر جہاں

اے پناہِ ما حریم کوئے تو ، من بہ امیدے رمیدم سوئے تو

چونکہ مؤتمر کے مندوبین اور باہر کے مہمان جمعہ کو سرکاری انتظام کے ساتھ آکر واپس جاچکے تھے، مدینہ طیبہ کے بہت سے احباب نے قیاس کیا ہوگا کہ یہ ناچیز بھی اسی گروہ میں آکر واپس جاچکا ہے، مدینہ طیبہ میں عام طور پر میری حاضری کا دوستوں کو علم نہیں ہوا، پھر بھی شدہ شدہ کچھ احباب کو اس کی خبر ہوگئی، اور وہ قدیم معمول کے مطابق عصر اور مغرب کے درمیان آتے رہے، ان میں علماء بھی تھے، ادباء بھی، جامعہ اسلامیہ کے اساتذہ بھی اور ہندوستانی احباب بھی، بعض ادبی مجلسوں سے تعلق رکھنے والے احباب نے کسی ادبی اسلامی موضوع پر (حسب سابق) ایک محاضرہ (تقریر) پر اصرار کیا،

لیکن ان سے معذرت کر دی گئی۔

رابطۂ ادب اسلامی کی نشستیں

چہار شنبہ اور پنجشنبہ (۲۸ر ۲۹ر صفر۔ ۲۱ر ۲۲ر اکتوبر) ڈاکٹر عبدالباسط بدر استاد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے مکان پر جو حوالی مدینہ میں ہے، رابطۂ ادب اسلامی کے ٹرسٹیوں کی نشستیں شروع ہوئیں، چہار شنبہ کو صبح اور بعد عشاء نشستیں رہیں، پنجشنبہ کو بعد عشا ایک ادبی اور شعری نشست ہوئی جس میں مدینہ طیّبہ کے متعدد ادباء و شعراء اور شاعر کبیر بہاء الامیری (جو رابطہ کے اعزازی رکن ہیں اور خاص طور پر اس کی مجالس میں شرکت کے لئے مکہ معظمہ سے آئے تھے) شریک ہوئے، مولانا محمد ناظم صاحب ندوی بھی جو مواصلات کی دقّت کی وجہ سے جدّہ سے تاخیر میں پہونچے تھے، اس میں شریک ہوئے، اور اپنا کچھ عربی کلام بھی سنایا، عمر بہاء الامیری صاحب نے اسلامی ادب پر ایک بڑی بلیغ اور خطیبانہ تقریر کی۔

جمعہ کی نماز مسجد نبوی شریف میں ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اور اسی روز بعد نماز عصر ذرا تاخیر سے سلام و وداع پڑھ کر جدّہ کو روانگی ہوئی اور تقریباً ساڑھے تین گھنٹے بعد ۹½ بجے شب میں جدّہ پہونچ گئے۔

جدّہ کا ایک روزہ قیام اور ایک تقریر

جدّہ میں صرف ایک روز شنبہ ۲۴ر اکتوبر کو قیام کرنا تھا، اس لئے

یہ دن بہت مصروف گذرا اسی عرصہ میں خواہر زادۂ عزیز سید مصباح الفنی حسنی سلمہ کے مکان پر بھی جانا تھا، اور دوپہر کو اپنے قدیم فاضل و باوفا دوست شیخ محسن احمد باروم مالک دارالشروق کے یہاں کھانا تھا، اس میں قدیم احباب سے ملنے کی بھی توقع تھی، جدّہ پہونچ کر معلوم ہوا کہ یہاں میرے ایک محاضرہ کا بڑا اعلان ہوا ہے، اور شہر میں اس کا بڑا چرچہ ہے، میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی کہ مجھ سے اس کا سرسری طور پر تذکرہ ہوا تھا، اور میں نے زیادہ غور کئے بغیر اس کی حامی بھر لی تھی، اسی روز ۹½ بجے ریاض کے لئے اور ریاض سے دوسرے جہاز پر دہلی کے لئے پرواز تھی، جس کے لئے دو گھنٹے پہلے ہوائی اڈّہ پہونچ جانا ضروری سمجھا جاتا ہے، ذہن پر سخت بار ہوا کہ مغرب کے بعد جو ۶ بجے ہو رہی ہے، تقریر کیسے ہو سکے گی؟ لیکن "سنگ آمد و سخت آمد" لوگوں نے کہا کہ اب کسی معذرت یا انکار کی گنجائش نہیں، اس تقریر کی عام شہرت ہو گئی ہے، اور تفصیل کے ساتھ اعلان اور مقرر کا تعارف کرایا گیا ہے، میں یہ بھی تحقیق نہیں کر سکا کہ اصل داعی و منتظم کون سی جماعت ہے، کسی نے کہا کہ ندوة الشباب العالمی جس کو انگریزی میں W.A.M.Y کہتے ہیں، کسی نے کسی اور جماعت کا حوالہ دیا، میزبانوں اور دوستوں نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں سامان اور ضروری کاغذات پہلے سے ہوائی اڈہ چلے جائیں گے، آپ ایک گھنٹہ پہلے بھی پہونچئے تو حرج نہیں ہے۔

حسن اتفاق کہ مسجد منصور شعلبی جس میں تقریر کا اعلان ہوا تھا، ہوائی اڈہ کے راستہ میں تھی، اور وہاں سے ہوائی اڈہ کا رستہ ۱۰۔۲۰ منٹ کی

مسافت پر رہ جاتا تھا، توکلاً علی اللہ مغرب سے پہلے مسجد کے لئے روانگی ہوئی
یہ جدّہ کی عظیم اور وسیع ترین مسجدوں میں ہے، مغرب کی اذان کے وقت
وہاں پہونچنا ہوا، دیکھا تو مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، اور لوگ سراپا شوق
تھے، امام اور خطیب مسجد شیخ عبداللہ علی بصفر نے مقرر کا تعارف اس طرح کرایا کہ معلوم
ہوا کہ وہ شخصی طور پر واقف ہیں، یا "فی مسیرۃ الحیاۃ" (کاروانِ زندگی کا ترجمہ)
پڑھ چکے ہیں، میں نے سورۂ مائدہ کی آیت :۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ	آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین
وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ	کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر
وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا	پوری کر دیں، اور تمہارے لئے
(سورۃ المائدہ - ۳)	اسلام کو دین پسند کیا۔

پڑھ کر تقریر شروع کی، محسوس ہوا کہ خدا کی مدد اور مضامین کا ورود
ہے، میں نے پہلے بتایا کہ دین کا پایۂ تکمیل کو پہونچ جانا، اور ختم نبوت کتنی
بڑی نعمت اور شریعت کی حفاظت اور ملّت کی شیرازہ بندی کی کیسی بڑی
ضمانت ہے، اور یہ اعلان کسی سابق دین و امت کو نصیب نہیں ہوا، جس کا اظہار
بڑی حسرت سے اس یہودی عالم نے حضرت عمرؓ سے کیا، اور اس کے نہ ہونے کی
وجہ سے سابقہ شرائع آسمانی اور دینی ملّتیں دَورِ ابتلاء سے گذرتی رہیں، ان میں
نبوّت کے دعویدار وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے، اور ان ادیان و ملل کے علماء
کی توانائیاں، ذہانتیں اور اوقات و توجّہات ان کی تردید و ابطال میں
صرف ہوتے رہے، جس کا اظہار و اعتراف یہودی عیسائی مذہب کی

تاریخوں اور مذاہب واخلاق کے دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) میں موجود ہے۔

پھر میں نے کہا[1] کہ جس شان اور آن بان اور احسان وامتنان کے انداز میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ "میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت تمام کر دی" اس کی روح اور مزاج اور اس کے تقاضے اور ذہنی ونفسیاتی اثر کے یہ بالکل منافی ہے کہ جن لوگوں کو یہ بشارت دی گئی، اوران کو اس انعام سے سرفراز اور اس تمغۂ امتیاز سے مشرف کیا گیا، وہ اس حجۃ الوداع اور وقوف عرفات کے چند مہینے بعد (جس میں یہ بشارت سنائی گئی تھی اور اعلان کیا گیا تھا) اپنے نبی کے دنیا سے تشریف لے جانے کے متصلاً بعد اس دین کو خیر باد کہہ دیں گے اور معاذ اللہ ارتداد اور کفر وکفرانِ نعمت کا راستہ اختیار کریں گے، عالم الغیب خدا جو بعد کے پیش آنے والے واقعات سے بھی اسی طرح باخبر ہوتا ہے، جس طرح ماضی کے واقعات سے، ایسے حال میں کبھی ایسا اعلان نہ فرماتا، اور یہ خوشخبری نہ دیتا، اسی طرح قرآن مجید میں سورۃ النصر میں "یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا" کہا گیا ہے، لیکن کہیں ان نفوس قدسیہ کے فوج بہ فوج اس دین سے نکلنے کا ذکر تو الگ "یخرجون من دین اللہ افرادًا" کا بھی ذکر نہیں آیا ہے، اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ صحابہ کرامؓ کی معاذ اللہ عمومی ردّت اور انحراف

---

[1] مجھے معلوم ہوا تھا کہ تقریر کے بعد خمینی تحریک اور ایرانی انقلاب کے بارہ میں مجھ سے سوالات کئے جائیں گے، جن کا اس جلسہ میں موقعہ اور وقت نہیں تھا۔

وتحریف کا افسانہ محض طبع زاد اور تسویل شیطانی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ"

کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ ہم عقائد وعبادات کے علاوہ اخلاق ومعاشرت

تہذیب وتمدّن میں بھی خود کفیل اور خالص اسلامی تعلیمات، قرآنی رہنمائی

اور اس کے دیئے ہوئے رہنما اصولوں اور حدود کے پابند ہوں، اور معاشرتی

وتمدّنی وتہذیبی طور پر مغرب کی نقّالی کے مرتکب اور اس کا سایہ بن کر

نہ رہ جائیں، ہم کو اللہ تعالٰے نے اصول وعقائد کے ساتھ ایک مستقل نظام

معاشرت اور ممیز تہذیب وتمدّن بھی عطا فرمایا ہے، اور ہم کو اسی کا نمونہ

اس مرکز اسلام میں پیش کرنا چاہیئے۔

الحمد للہ تقریر اطمینان سے ہوئی، امام صاحب نے اعلان کیا کہ شیخ کو

اسی وقت روانہ ہونا ہے، مصافحہ اور معانقہ کی کوشش نہ کی جائے، انھوں نے

ایک دوسرے دروازہ سے بھی نکلنے کا انتظام کیا لیکن پُرجوش نوجوانوں کی

ایک تعداد ٹوٹ پڑی اور بڑی مشکل سے ان کے گھیرے سے نکل کر ہوائی اڈہ

کے لئے روانگی ہوئی، محبّی محمد عثمان صاحب ریاض تک رخصت کرنے آئے

اور وہاں سے دوسرے جہاز پر بٹھا کر روانہ کیا، اور ہم لوگ اطمینان وراحت

کے ساتھ اگلے دن صبح یکشنبہ ۸ ½ بجے دہلی پہونچ گئے۔

باب سیزدہم ۱۳

دو سیمنار، ایک عظیم حادثہ

دار العلوم ندوۃ العلماء میں رابطۂ ادب اسلامی کا ایک سیمنار

راقم سطور کو نومبر ۱۹۸۷ء کے پہلے ہفتہ میں عزیز گرامی مولوی قاضی محمد معین اللہ صاحب ندوی، نائب ناظم ندوۃ العلماء کے بچوں کی تقریب شادی میں شرکت کے لئے اندور کا سفر کرنا تھا، رفقاء و اہل تعلق کی ایک جماعت کے ساتھ بھوپال کے راستہ سے ۴ نومبر کو شب میں وہاں پہونچنا ہوا، دو دن کے مصروف و خوشگوار قیام کے بعد براہ بھوپال واپسی ہوئی، رفیق قدیم مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی مرحوم کی وفات پر تیسرے ہی دن جو سفر اکتوبر ۸۶ء میں کیا گیا تھا، اس کے بعد سے بھوپال جانا نہیں ہوا تھا، اس لئے وہاں ایک روز ایک شب (۷ نومبر ۸۷ء کو) قیام ضروری سمجھا گیا، مولانا مرحوم کے فرزندوں پسماندگان اور رفقائے کار سے ملنا ہوا اور تاج المساجد میں بعد مغرب ایک عمومی اجتماع کو بھی خطاب کیا گیا، (جو مولانا سعید مجددی صدر وقف بورڈ مدھیہ پردیش کی صدارت میں ہو رہا تھا) جس میں موجودہ حالات کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنے دعوتی و اصلاحی مقام پر مضبوطی سے قائم رہنے اور ان ملی و وطنی ذمہ داریوں کو

پورا کرنے اور "خیر امّۃ" کے معیار پر پورا اترنے کی تلقین کی گئی، جس کے لئے وہ مامور اور منتخب کئے گئے ہیں، اور جس کو متزلزل کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، اور واقعات وحالات کا (جو وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے ہیں) ردِّ عمل بھی ہوتا ہے۔

اس سفر میں یا اس سے ایک ڈیڑھ روز پیشتر معلوم ہوا تھا کہ رابطۂ ادب اسلامی کے ہندوستانی مرکز و دفتر نے (جو دار العلوم ندوۃ العلماء میں ہے) ۱۱، ۱۲ر نومبر کو ایک سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جس کا عنوان ہوگا "اُردو ادب پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا اثر" اور اس کے لئے اس موضوع سے مناسبت اور تعلق رکھنے والے فضلاء وادباء اور یونیورسٹیوں کے دینی وادبی رجحان رکھنے والے ممتاز اساتذہ کو دعوت نامے بھیج دیئے گئے ہیں، اور اچھی تعداد میں ان کی شرکت کی توقع ہے، یہ رابطۂ ادب اسلامی کے سکریٹری مولوی سیّد محمد رابع ندوی اور دفتر کے انچارج مولوی عبد النور (نور عظیم) ندوی کا انتخاب کیا ہوا موضوع اور منصوبہ تھا، اور اس سلسلہ میں مولوی نور عظیم صاحب کا بنیادی حصّہ اور ان کی محنت وجدّ وجہد تھی۔

سیمنار کے انعقاد کی تاریخ سے صرف ایک دو روز پہلے لکھنؤ پہونچا ہوا، ۱۱ر نومبر کو کتب خانہ شبلی نعمانیؒ دار العلوم ندوۃ العلماء کی شاندار عمارت کے وسیع زیریں ہال میں سیمنار کا آغاز ہوا، سکریٹری رابطہ مولوی محمد رابع حسنی ندوی نے اپنی رپورٹ پڑھی جس میں رابطۂ ادب اسلامی کے قیام کی ضرورت اور اس کے دائرۂ کار پر روشنی ڈالی گئی تھی، اور اس سلسلہ میں اس وقت تک جو کچھ پیش رفت ہوئی ہے اس کو بیان کیا گیا، پھر مختصراً سید صاحب کی تحریک سے اردو زبان وادب

جو اثر پڑا اور اس کو اس سے جو فائدہ پہونچا اس کی نشاندہی کی گئی۔

اس رپورٹ کے بعد میں نے بحیثیت صدر جلسہ افتتاحی تقریر کی جس میں تحریک اور زبان کے درمیان جو دائمی اور طاقتور رشتہ ہے، اس کو واضح کیا گیا، اور بتایا گیا کہ کوئی عوامی، اصلاحی، تعمیری یا سیاسی و انقلابی تحریک، زبان سے بے نیاز نہیں ہو سکتی، یہ اس کا سب سے بڑا ہتھیار اور عوام کے دل و دماغ تک پہونچنے کا آسان راستہ ہے، اسی طرح زبان بھی کسی طاقتور تحریک کے ذریعہ ہی وسعت، تاثیر اور طاقت میں صدیوں کی منزل بعض اوقات برسوں اور مہینوں میں طے کر لیتی ہے، اور اس کو وہ فائدہ پہونچتا ہے، جو کسی حکومت کی سرپرستی اور تعلیمی اداروں سے نہیں پہونچ سکتا، دنیا کا کوئی انقلاب زبان کے بغیر نہیں ہوا، اور اسلام نے جو صالح عالمگیر انقلاب برپا کیا، اس کی دعوت اور سرگرمی نے تو زبان سے اتنا بڑا کام لیا جتنا کسی مذہب یا دعوت نے نہیں لیا ہوگا، اسلام کے بہترین ترجمان اور داعی، اس زبان کے بہترین خطیب اور اہلِ قلم تھے، دراصل زبان کسی منصوبہ یا سمجھوتہ کے ماتحت نہ بنتی ہے، نہ ترقی کرتی ہے، اس کے لئے تین بڑے تخلیقی عناصر ہیں، ضرورت، جذبہ، اور افادیت، اردو زبان کے وجود میں آنے، اس کے عوامی بننے اور نشو ونما میں صوفیاء کرام کا بنیادی حصہ رہا ہے، مصنفِ "گلِ رعنا" نے تصوّف، صوفیائے کرام کی تاریخ، بزرگانِ دین کے ملفوظات سے (جن کو برکت کے خیال اور احترام و عقیدت کے ماتحت ناقلین و مورخین نے جوں کا توں انھیں کے لفظوں میں نقل کر دیا ہے، جس کی مثال دوسرے طبقہ کی اہم شخصیتوں کے معاملہ میں

نہیں ملے گی[1] متعدد مثالیں دی ہیں، اس لئے کہ صوفیائے کرام اور داعیانِ اسلام کا مقصد بات کو دل میں اتارنا تھا، اپنی عربی اور فارسی کی دھاک بٹھانے اور اپنی علمیت جتانے کی کوشش نہیں تھی، اس لئے ان کو ایک ایسی زبان کی ضرورت پڑی جو عام فہم، مشترک، روزمرہ کی بولی اور عربی، فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ سے پاک ہو، تاکہ ناخواندہ لوگ بھی ان کی بات سمجھ لیں، اس کے نتیجہ میں وہ زبان وجود میں آئی جو ترقی اور وسعت اختیار کرنے کے بعد اردو کہلائی، اس کا سُراغ ہمیں نویں صدی ہجری ہی کی ابتدا میں اور گجرات جیسے مرکزی سلطنت سے دور علاقہ میں ملتا ہے[2]۔

دعوت کے بعد دوسرا نمبر تحریک کا ہے، جس کو ایسی زبان کی ضرورت ہوتی ہے، جو جذبہ کو عام کرسکے اور عوام کو تحریک کا نہ صرف ہم نوا، بلکہ اس کا سپاہی اور سرفروش مجاہد بنا سکے، ورنہ وہ تحریک علمی و فکری دائرہ میں محدود، اور ایک طبقے میں محصور ہو کر رہ جاتی ہے، اسی بناء پر حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقائے کار نے عام فہم اردو زبان میں دینی و اصلاحی خطاب کرنے اور

---

[1] ملاحظہ ہو تذکرہ شعرائے اردو "گلِ رعنا" (مولفہ مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء، مطبوعہ دار المصنفین۔ اعظم گڑھ) ص۱۴-۱۷

[2] مولانا نے ایک دفعہ پر حضرت قطب عالم گجراتی کی زبان سے نکلا ہوا فقرہ "لوہے یا لکڑ یا پتھر یا کیا ہے" اور اسی طرح محمود شاہ اول فرماں روائے گجرات کا جملہ "نیچی بیری ہر کوئی جھورے" نقل کیا ہے، (گلِ رعنا ص۱۵-۱۷) نیز اس عہد میں زبان سے نکلے ہوئے دوسرے برجستہ جملے جو آج بھی اچھی خاصی اردو کے معلوم ہوتے ہیں، نقل کئے ہیں (ص۱۵-۱۹)

سہل اور روزمرہ زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعہ اصلاحِ عقائد و رسوم اور اصلاحِ معاشرہ کا وہ زبردست، انقلاب انگیز، اور عہد آفریں کام کیا جس کی مثال اس سے پیشتر کی اصلاحی تحریکوں میں ملنی مشکل ہے، انھوں نے عین میدانِ جنگ میں بھی شاعری کی ضرورت اور جوش آفریں کلام کے ذریعہ جذبۂ جہاد کو فروزاں کرنے کی صلاحیت کو نظر انداز نہیں کیا، مولانا اسماعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" مولانا محرّم علی بلہوری کی "نصیحت المسلمین" اور ان کا قصیدۂ جہادیہ (جو فوجی صف آرائی کے موقعہ پر پڑھا جاتا تھا) اور مولانا کرامت علی صاحب جونپوری کی عقائد ــــــ و دینی مسائل کی اردو کتابیں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں، جن سے لاکھوں نہیں کروروں انسانوں نے مجموعی طور پر فائدہ اٹھایا اور ان کی زندگیوں میں انقلاب آیا۔

اسی حقیقت پسندی اور فطرتِ انسانی کے رمز سے آگاہی اور اصلاحِ مسلمین کے جذبہ نے اس تحریک سے پہلے حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے دو بلند پایہ فرزندوں حضرت شاہ عبد القادر صاحب اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کو قرآن مجید کے اردو ترجمہ پر آمادہ کیا، اور میں اپنے تقابلی مطالعہ اور جن زبانوں سے واقفیت رکھتا ہوں، ان کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ قرآن مجید کا کسی زبان میں بھی ترجمہ حضرت شاہ عبد القادر صاحب کے ترجمہ سے بہتر کامیاب اور مؤثر نہیں ہوا[۱]، شاہ صاحب کا یہ ترجمہ بھی سید صاحبؒ کی

---

[۱] اس موقع پر مقرر نے شاہ صاحبؒ کے ترجمہ کی ایسی مثالیں دیں، جن میں قرآنی الفاظ (باقی ص ۳۱۵ پر)

جماعت کے بعض ناشرین اور اہلِ مطابع ہی کی توجہ اور کوشش سے پہلی مرتبہ شائع ہوا اور گھر گھر عام ہوگیا۔

ہندوستان کی تحریک آزادی نے بھی ہر طرح کے مذہبی، لسانی، تہذیبی تعصّبات کو بالائے طاق رکھ کر اردو کے عام فہم اور اثر انگیز جملوں سے کام لیا چنانچہ "انقلاب زندہ باد" کے نعرہ کا اب بھی کوئی بدل نہیں، اسی طرح لفظ "شہید" میں جو دل کشی اور اثر انگیزی ہے، وہ کسی اور لفظ میں نہیں ہے[1]، ضرورت ہے کہ اس موضوع پر تحقیقی کام کیا جائے، اور سید صاحب رح کی دعوت و تحریک اور ان کے رفقاء کی اردو تصنیفات و رسائل کے فنّی و لسانی پہلوؤں اور زبان و ادب پر ان کے گہرے اور دیرپا اثرات کو نمایاں کیا جائے۔

وقت کی تنگی اور داعیوں و منتظمین کی گوناگوں مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کے باوجود خاصی تعداد میں جامعات و مدارس کے فضلاء، عربی، فارسی اور اسلامیات کے شعبوں کے ذمہ دار اور سربراہ اور تحقیقی و علمی کام کرنے والے حضرات شرکت کے لئے آگئے تھے، ہند گیر شہرت رکھنے والوں میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم، اے، ناظم دار المصنّفین اور خواجہ احمد صاحب فاروقی (سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی) جن کا اس موضوع پر

(باقی ص۳۱۴ کا) ان کی روح، طاقت اور درجۂ حرارت کی ایسی نمود تھی جو خود عربی کی بہت سی تعبیروں اور دوسری زبانوں کے ترجموں میں نہیں ملتی۔

[1] تقریر قلم بند کرنے میں اصل تقریر کے الفاظ کی پابندی نہیں کی گئی، اور لکھاتے وقت اس میں کہیں کہیں تشریحی و تمثیلی اضافے کر دیئے گئے ہیں۔

ایک مستقل تحقیقی مقالہ اور خطبہ "اردو میں وہابی ادب" کے عنوان سے ہے، جو انھوں نے ۱۹۶۷ء میں مستشرقین کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں امریکہ میں پڑھا تھا[1]، موجود تھے، ہندوستان کی آٹھ نامور یونیورسٹیوں (لکھنؤ، الہ آباد، علی گڑھ، بنارس، دہلی یونیورسٹی نہرو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، اور کشمیر یونیورسٹی) کے ممتاز اساتذہ اور متعدد اپنے شعبوں کے صدر اور پروفیسر و ریڈر شریک ہوئے، جن میں اکثر ندوی فضلاء تھے، کشمیر یونیورسٹی کی نمائندگی خود وہاں کے وائس چانسلر ڈاکٹر مشیر الحق ندوی نے کی، ان میں سے اکثر اس موضوع پر مقالات تیار کر کے لائے تھے، ان میں سے اکثر کا موضوع اور مرکز بحث حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی "تقویت الایمان" تھی، ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی سابق پروفیسر جامعۃ أم القریٰ مکہ معظمہ وحال معتمد تعلیمات دار العلوم نے بھی بحث میں حصہ لیا، متعدد نمائندوں کا تأثر اور مشورہ یہ تھا کہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک کے بارہ میں اس سے زیادہ اہتمام اور تیاری کے ساتھ بین الاقوامی سطح پر ایک مجلس مذاکرہ (سیمینار) منعقد ہونا چاہیئے، اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں سید صاحب کی تحریک پر تحقیق کے لئے ایک مستقل شعبہ قائم ہونا چاہیئے۔

اس مجلس مذاکرہ (سیمینار) کے ساتھ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک سے متعلق کتابوں اور مخطوطات کی ایک نمائش (DISPLAY) بھی کتب خانہ کی عمارت کے دوسری منزل میں تھی، جس کا غالباً سب سے بڑا ذخیرہ برصغیر میں (رائے بریلی اور ٹونک کے تعلق کی وجہ سے، نیز پنجاب یونیورسٹی لاہور کے تعاون

---

[1] اس مقالہ کا اردو ترجمہ خواجہ صاحب کے مجموعہ مضامین "چراغ رہ گزر" میں شامل ہے (ص ۱۰۹-۱۴۲)

سے) کتب خانہ ندوۃ العلماء ہی میں ہے، خاندانی خطوط، دستاویزوں اور حضرت سید صاحبؒ کے دستخط سے مزیّن مکاتیب مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کے کتب خانہ سے (جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں امانت ہے) لے کر یہاں رکھے گئے تھے، جن کا اس تعداد میں کہیں فراہم ہونا، بعید از امکان ہے، اہلِ ذوق نے ان سب نوادر و مخطوطات کی بڑے ذوق و شوق سے زیارت کی اور ان کی اہمیت کا اعتراف کیا، اور اس علمی نمائش سے سید صاحب اور ان کی تحریک پر ایک وسیع اور وقیع سیمنار کے منعقد کرنے کے خیال کو مزید تحریک و تقویت حاصل ہوئی۔

مقالات اور برجستہ تقریروں میں چونکہ بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا جن میں سے بعض سے یہ تأثر پیدا ہوتا تھا کہ سید صاحب کی یہ تحریک محض جنگ آزادی کی ایک تحریک تھی اور بعض سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی تھی کہ وہ محض رنجیت سنگھ کی سکھ حکومت (جس سے پنجاب کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا) کے خلاف ایک محدود اور مقامی جدّوجہد تھی، اس تاثر کو دور کرنے کے لئے مولوی محمد عارف ندوی نے ایک مؤثر تقریر کی جس میں سید صاحب کی تحریک کی ہمہ گیری اور اس کے حقیقی مقاصد پر روشنی ڈالی گئی تھی، سیمنار کی آخری نشست میں راقم سطور نے ضرورت سمجھی کہ خود سید صاحبؒ کے مکاتیبؒ کے اقتباسات کی مدد سے اور ان کی روشنی میں اس کی وضاحت کی جائے کہ ان کا مقصد محض رضائے الٰہی کا حصول، فریضۂ جہاد کا احیاء، قانون شریعت اور احکامِ الٰہی کا اجراء، اور ان کی بنیاد پر ایک آزاد دینی اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور (علیٰ منہاج الخلافۃ

الراشدہ) حکومت اسلامی کا قیام تھا، انھوں نے اپنے متعدد خطوط میں اس کی صاف صاف تشریح کی ہے کہ مقصد اصلی ہندوستان ہے، اور اس کو ان کے الفاظ میں "بیگانگانِ بعید الوطن، اور تاجرانِ متاع فروش" (انگریزوں سے) جو ملوک زمین و زمن بن گئے ہیں، آزاد کرانا اور پھر یہاں سے لے کر افغانستان اور ترکستان تک ایک آزاد اسلامی سلطنت قائم کرنا تھا، راقم نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ میں نے ہندو بیرونِ ہند کی کثیر التعداد مجالس مذاکرہ (سیمناروں) میں شرکت کی ہے، اور بحث و مذاکرہ میں حصہ لیا ہے، لیکن مجھے اس سیمنار میں جو نورانیت یا واضح لفظوں میں روحانیت محسوس ہوئی، وہ اس سے پیشتر کسی سیمنار میں محسوس نہیں ہوئی، اور یہ اس سیمنار کی اُس مخلص اور مقبول گروہ اور اس کے ربّانی وحقّانی قائد سے نسبت کی برکت ہے جس کے نام پر یہ سیمنار منعقد ہوا ہے۔[1]

ایک عظیم حادثہ، سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کی وفات

محترمی سید صباح الدین صاحب ایم، اے، ناظم دار المصنّفین اعظم گڑھ جن کو ۱۹ر نومبر کو منعقد ہونے والی دار المصنفین کی مجلس انتظامی میں شرکت اور

---

[1] یہ تأثر راقم سطور کا ذاتی تأثر ہی نہیں تھا، کئی شرکائے مجالس نے جو دینی شعور و صلاح رکھتے ہیں، اس کا اظہار کیا، ان دو دنوں کے اندر جن میں یہ سیمنار منعقد ہو رہا تھا، راقم سطور کو اپنی نمازوں اور دعاؤں میں بھی فرق محسوس ہوا، اور یہ حضرت سید صاحب کے تذکرہ و حالات کی ایک خصوصیت ہے جس کا راقم کو بارہا تجربہ ہو چکا ہے، اور متعدد اہلِ قلوب اور اہلِ باطن نے خود اپنے بارہ میں اس کی شہادت دی ہے۔

اس کے انتظام کے لئے آنا تھا، بعض ضروری مشوروں اور اس سیمنار میں شرکت کے خیال سے جو ان کے ذوق، مسلک، تاریخی مطالعہ اور دینی رجحان کے عین مطابق تھا، ۱۰ ر نومبر ہی کو لکھنؤ پہونچ گئے تھے، وہ اس کی مجلسوں اور کارروائی میں پورے طور پر شریک رہے، ایک نشست کی صدارت بھی کی، اور ایک مؤثر اور معلومات افزا تقریر بھی فرمائی، اس مرتبہ خلاف معمول انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں ۸ دن قیام کیا، جس کا اتفاق غالباً اس سے پہلے پیش نہیں آیا تھا، وہ دارالمصنفین کے قضیہ میں بعض پریشان کن اور انتشار انگیز مقامی مخالفتوں اور کوششوں کے باوجود جن کے نتیجہ میں سنّی وقف بورڈ اور مقامی عدالت تک قضیہ پہونچ گیا تھا، غیر معمولی طریقہ پر ہشّاش بشّاش اور اچھے موڈ میں تھے، عصر اور بعد عشا کی مجلسوں میں جو مہمان خانہ میں ہوتی تھیں، وہ رونق محفل ہوتے تھے، اور اپنے وسیع تاریخی مطالعہ، متنوّع معلومات اور لطائف و ظرائف سے مجلس کو باغ و بہار بنا دیتے تھے۔

اسی زمانہ قیام کے آخری دنوں میں سید شہاب الدین دیسنوی صاحب جو ان کے عزیز قریب اور معاون و مشیر بھی تھے، پٹنہ سے تشریف لے آئے، اس سے ان کو اور بھی مسرّت و تقویت حاصل ہوئی، محترمی افتخار فریدی صاحب بھی جو ان کے بڑے قدردانوں میں ہیں، مراد آباد سے آئے ہوئے تھے، ان سے بھی خوب مجلسیں رہیں۔

۱۷ ر نومبر کو مجھے بعض ضرورتوں کی بنا پر رائے بریلی جانا پڑا، ۱۸ ر نومبر کو دوپہر کے کھانے کے بعد ۲-۲½ بجے کے درمیان جب میں قیلولہ کے لئے بستر پر

لیٹ گیا تھا، عزیزی عبدالرزاق نے آکر کہا کہ ایک بری خبر دہلی سے ٹیلیفون پر نیاز صاحب[1] نے دی ہے، اور وہ یہ ہے کہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا ایک حادثہ میں اچانک انتقال ہوگیا، سید شہاب الدین دیسنوی صاحب جوان کے ساتھ ہی رکشا میں بیٹھے ہوئے تھے، بال بال بچ گئے، یہ خبر بجلی بن کر دل و دماغ پر گری اور اعصاب بری طرح سے متأثر ہوئے، میں ان کو اچھا خاصہ تندرست اور ہشاش بشاش چھوڑ کر آیا تھا، اگر ذریعہ اطلاع معتبر نہ ہوتا تو اس پر یقین کرنا مشکل تھا، پھر بھی فرط تعلق سے دل کو یہ سمجھاتا رہا کہ یہ واقعہ لکھنؤ میں پیش آیا اور اطلاع دہلی سے آئی ہے، اس میں کچھ غلط فہمی کا دخل بھی ہو سکتا ہے، مجھے اسی دن شام کو لکھنؤ واپس ہونا تھا، اس لئے کہ اگلے روز ۱۹ نومبر کو دار المصنّفین کی مجلس انتظامی کا جلسہ تھا، اور رات ہی سے باہر کے ارکان کے آنے کا سلسلہ شروع ہونے کی توقع تھی، لکھنؤ، رائے بریلی کے درمیان کا راستہ جس طرح کٹا وہ اللہ ہی جانتا ہے، عین مغرب کی نماز کے وقت ہماری گاڑی دار العلوم کے احاطہ میں داخل ہوئی تو وہ مسجد کی طرف آرہی تھی اور غسل و تکفین کے بعد مرحوم کا جنازہ نماز جنازہ کے لئے مسجد کے میدان میں آرہا تھا، نماز مغرب کے بعد راقم ہی کو یہ خدمت انجام دینی پڑی۔

حادثہ کی تفصیل یہ معلوم ہوئی کہ سید صباح الدین صاحب مرحوم کو اچانک

---

[1] عزیزی نیاز احمد رائے بریلوی، جو محترمی ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب وزیر مملکت کے P.A ہیں، اور عام طور پر میرے سفروں اور قیام کے زمانہ میں رابطہ کا کام دیتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے ضروری امور کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔

مولانا مفتی رضا انصاری صاحب سے ملاقات کے لئے (جو اردو اکیڈمی کے جس کے سید صاحب قدیم رکن تھے، سابق صدر تھے) فرنگی محل جانے کا تقاضہ پیدا ہوا[1]، سیّد شہاب الدین صاحب دلیسنوی نے بھی کہا کہ میں نے ابھی تک فرنگی محل کی زیارت نہیں کی ہے، مجھے بھی شوق ہے، دونوں دارالعلوم سے ایک رکشہ پر روانہ ہوئے، ڈالی گنج کے پُل پر (جو راستہ میں پڑتا ہے، اور تنگ ہونے کی وجہ سے اس پر بڑی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے) تھوڑی دور چلے تھے کہ رکشہ کے سامنے اچانک ایک آوارہ گائے آگئی، رکشہ والے نے رکشہ کو روکا جس سے ایک جھٹکا لگا، سید صباح الدین صاحب جو غالباً گفتگو میں محو تھے، اس جھٹکہ سے نیچے گر گئے اور غالباً سر کے بَل جس سے سر پر چوٹ آئی، بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت ایک ٹرک آرہا تھا، اس نے برک لگایا لیکن اس کا ایک پہیہ ان کے سر سے لگ گیا جس سے صدمہ میں مزید اضافہ ہوا، سید صاحب مرحوم کو اسی وقت ٹرک پر رکھ کر شہاب الدین صاحب کی معیت میں میڈیکل کالج پہونچا دیا گیا، جہاں ڈاکٹروں نے دیکھ کر ان کے انتقال کی خبر دے دی، کسی طرح دوادوش کر کے پوسٹ مارٹم کے قانونی مرحلہ سے ان کو بچا لیا گیا، جس میں گورنر صاحب یو۔پی جناب محمد عثمان عارف صاحب نقشبندی کی سفارش اور توجہ کو بھی دخل تھا۔

عشا کے وقت نعش کی گاڑی پر اساتذہ اور طلبہ کی ایک جماعت اور سیّد شہاب الدین صاحب دلیسنوی کی معیت میں علم و شرافت کے اس گنج گراں مایہ کو

---

[1] مولانا مفتی رضا انصاری صاحب کے تعزیتی خط سے معلوم ہوا کہ وہ اس حادثہ سے ایک ہی دو روز پہلے لکھنؤ سے دہلی روانہ ہو چکے تھے، اور انھوں نے سید صاحب کو اپنے ایک خط سے اطلاع بھی دی تھی، جو ان کو سفر کی وجہ سے نہیں ملا تھا۔

اعظم گڑھ کے لئے رخصت کیا گیا، جس کا ان کا آخری آرام گاہ بننا مقدر تھا، اور اس کا حق تھا۔

اس اچانک حادثہ نے دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالا جو عرصہ تک فراموش نہ ہوگا، خاص طور پر جب ان کے بڑے فرزند ڈاکٹر احتشام الرحمٰن صاحب کانپور سے اعظم گڑھ جانے کے لئے یہاں آئے تو اپنے کو قابو میں نہیں رکھ سکا، ۱۹ر نومبر کو ۱۰ بجے کے قریب (جس دن اور جس وقت دارالمصنّفین کی مجلس انتظامی کا ہونا طے تھا) مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، اور ان کو ان کی خواہش اور وصیّت کے مطابق علامہ شبلیؒ کی لحد کے قریب سپرد خاک کیا گیا ؎

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اگلے روز ۱۹ر نومبر کو (جب دارالمصنفین کی مجلس کا جلسہ ہونا تھا) ٹھیک اسی وقت دارالعلوم کی وسیع مسجد میں ان کے سلسلہ میں پروفیسر ضیاء الحسن صاحب فاروقی کی صدارت میں تعزیتی جلسہ ہوا، جس میں مولوی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی، مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی اور راقم نے تقریریں کیں، اور صدر جلسہ نے آخری خطاب کیا۔

۲۲ر نومبر کو مجھے جامعہ سلفیہ بنارس میں ہونے والے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کے سیمنار میں شرکت کرنی تھی (جس کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ آئندہ سطور میں آرہا ہے) اس سے فارغ ہو کر ۲۳ر نومبر کو اپنے وعدہ کی تکمیل کے سلسلہ میں

جامع مسجد مئو کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے عزیزی مولوی سعید الرحمٰن ندوی کی رفاقت اور داعی و منتظم تقریب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نعمانی کی قیادت میں مئو جانا پڑا، جہاں اس تقریب سے فراغت اور بعض دوسرے پروگراموں کی تکمیل کے بعد ۲۳ نومبر کی شام کو شبلی منزل اعظم گڑھ پہونچنا ہوا، وہاں بعد مغرب اعلان شدہ پروگرام کے مطابق میری صدارت میں ایک نمائندہ تعزیتی جلسہ ہوا جس میں مختلف دینی جماعات و مدارس، مسلم تنظیموں کے رہنما، ضلع کے علماء، اور حکام میں سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور کپتان پولیس بھی شریک تھے، تمام مقررین نے اپنے گہرے تأثرات پیش کئے اور مرحوم کی خصوصیات و خدمات کا بلند الفاظ میں اظہار کیا، دار المصنّفین کی ایک شبانہ اور اگلے دن کے چند گھنٹوں کے قیام نے اور پھر ان چیزوں کے علم نے جو ملّت کے تمام اداروں تعمیری اور خاموش خدمات کے خطرہ میں پڑجانے کی پیشین گوئی کرتی ہیں، اور ملّت کے مستقبل کی طرف سے (اغیار کی مخالفانہ کوششوں سے زیادہ) لرزاں اور ترساں بناتی ہیں، پھر اس بزم علمی کو اس کے ایک طویل المدّت اور قدیم خادم و محافظ کے وجود سے خالی دیکھ کر دل و دماغ پر جو اثر پڑا، اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں" والی اللہ المشتکی"

اس موقعہ پر اس کا ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب مرحوم عرصہ سے اس بات کے خواہشمند تھے کہ کسی حج یا عمرہ و زیارت کے موقعہ پر میرا ان کا ساتھ ہوجائے لیکن اس کی نوبت نہیں آتی تھی، غالباً ۱۹۸۶ء کے اوائل میں ان کو ایک ـــــــ اوارڈ میں ایک گرانقدر رقم ملی، انھوں نے تہیّہ کرلیا کہ وہ اس سے عمرہ و زیارت کا فائدہ اٹھائیں گے، اور یہ مبارک سفر کریں گے، تقدیری بات کہ مجھے بھی انھیں دنوں رابطۂ عالم اسلامی کی مؤتمر المجمع الفقہی میں شرکت

کے لئے وہاں حاضری دینی تھی، اس طرح اس رفاقت کا ایک غیبی انتظام ہوگیا اوائل رجب ۱۴۰۶ھ میں اس مبارک سفر کا پروگرام طے ہوا، اور ۱۶ مارچ ۱۹۸۶ء کو دہلی سے عزیزان مولوی معین اللہ صاحب ندوی، محمد رابع ندوی اور سید صباح الدین صاحب کی معیت میں دہلی سے جدہ کے لئے روانگی ہوئی، انھوں نے اس سفر سے پورا فائدہ اٹھایا، بڑے ذوق وشوق اور عقیدت واہتمام کے ساتھ عمرہ کیا اور حرم شریف کی حاضری اور طوافوں کی سعادت حاصل کی۔

مکہ معظمہ کے زمانہ قیام میں امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السُبَیّل نے کھانے پر مدعو کیا، اور دوسری مجالس وتقریبات میں شرکت کی نوبت آئی پھر بڑے ذوق وشوق کے ساتھ مدینہ طیبہ حاضری ہوئی، اور وہاں میرے ساتھ بستان نورولی میں قیام رہا، جہاں مدینہ طیبہ کے علماء ادباء اور احباب بہ کثرت آتے رہے، اوران سے تعارف ہوا، اسی زمانۂ قیام میں ہمارے قدیم کرم فرما شیخ محمود الحافظ نے (جو ہندوستان اور وہاں کی شخصیتوں اور اداروں سے بہت واقف ہیں، اوران کے صاحبزادہ استاد محمد الحافظ جو رابطہ کے ایک اہم عہدہ پر فائز ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل ہیں) اپنی شاندار قیام گاہ پر بڑی پُرتکلف دعوت کی جس میں اہلِ علم واہلِ ذوق کا اچھا اجتماع تھا، اور وہاں مدینہ طیبہ کی مناسبت سے ایک اچھی دینی وادبی نشست رہی، واپسی میں مجھے ابوظبی جانا تھا، جہاں امام مالکؒ پر ایک اہم سیمنار ہو رہا تھا، اور خیال تھا کہ سید صاحب بھی ساتھ ہوں گے، اور وہاں کی علمی ودینی مجلسوں میں شرکت کا موقعہ ملے گا، لیکن ہندوستان سے بعض علالتوں کی اطلاع ملنے پر میں نے

وہ سفر ملتوی کیا اور اپنے مقالہ کے ساتھ عزیز گرامی مولوی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کو بھیج دیا، اور ہم لوگ ۶ر اپریل ۸۶ئہ کو جدّہ سے براہ راست ہندوستان واپس ہوگئے۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ سید صباح الدین صاحب نے چونکہ یہ سفر اپنے دینی ذوق اور عقیدت کی بناء پر کیا تھا، واپس آکر "معارف" میں اس کے متعلق ایک لفظ نہیں لکھا، جبکہ اہلِ قلم و مدیران رسائل مختلف عنوانوں اور بہانوں سے بڑی آب و تاب سے ایسے سفروں کے تاثرات و مشاہدات کا ذکر کرتے ہیں، اور اس کو اپنی ذات کی تشہیر اور رسالہ کی ترویج کا ذریعہ بنالیتے ہیں، مجھے ان کے اس جذبہ اور طرز عمل کی بڑی قدر آئی۔

شیخ الاسلام امام حافظ ابن تیمیہؒ پر جامعہ سلفیہ بنارس کا سیمنار

۲۲، ۲۳، ۲۴ر نومبر ۱۹۸۷ئہ کو جامعہ سلفیہ بنارس کی طرف سے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ پر ایک علمی سیمنار کے انعقاد کا اعلان ہوا تھا، اس موضوع سے خصوصی تعلق رکھنے [1] اور اس کی اہمیت کے پیش نظر راقم کو اس میں شرکت کی خصوصی دعوت دی گئی تھی، جامعہ کا ایک وفد بھی آکر ملا تھا، اور جامعہ کے ایک مؤقّر عالم و استاد مولانا مقتدیٰ حسن صاحب ازہری یاد دہانی اور تاکید کے لئے خود تشریف لائے تھے، اور سید صاحب والے سیمنار میں خود شرکت بھی کی تھی،

---

[1] شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ پر میری ایک مستقل کتاب شائع ہوچکی ہے، جو سلسلۂ "تاریخ دعوت و عزیمت" کا دوسرا حصہ ہے، انگریزی و عربی میں بھی اس کے ترجمے ہوئے ہیں، عربی ایڈیشن حال میں دار القلم کویت سے ایک لاکھ کی تعداد میں شائع ہوا ہے۔

میں نے بڑی عجلت کے ساتھ شدید مصروفیت میں عربی میں مقالہ تیار کر لیا تھا، جس کا عنوان تھا "شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا عظیم ترین کارنامہ اس حقیقت کا اثبات اور اس پر زور ہے کہ نبوت ہی صحیح معرفت اور کامل ہدایت کا واحد اور قابلِ اعتماد ذریعہ ہے" اس سیمینار میں عرب فضلاء بعض قانونی مجبوریوں اور دشواریوں کی بناء پر بڑی تعداد میں نہیں آسکے تھے، جن کا خیال کر کے میں نے یہ مقالہ اصلاً عربی میں لکھا تھا، لیکن جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض کے فاضل وئوقر وائس چانسلر معالی الشیخ عبداللہ عبدالمحسن الترکی اور ان کے رفیق سفر و معاون محبّی ڈاکٹر عبدالحلیم عویس مصری کی شرکت نے (جو جامعہ کے کلیۃ العلوم الاجتماعیہ کے ایک اہم استاد ہیں) اس کی بہت حد تک تلافی کردی، ان دونوں سے راقم کے قریبی تعلقات اور مناسبت ہے، ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن ترکی رابطہ اور آکسفورڈ کے اسلامک سنٹر کے بھی رکن ہیں، جس کی وجہ سے ہم لوگوں کے ایک ساتھ بیٹھنے اور تبادلۂ خیال کی نوبت باربار آتی رہتی ہے، اور میں نے ان کی دعوت پر ریاض کے متعدد سفر بھی کئے ہیں۔

میں نے اس مقالہ میں جو سیمینار کی افتتاحی نشست ہی میں پڑھا گیا سب سے پہلے اس کا اظہار کیا کہ امام ابن تیمیہؒ کی شخصیت اور ان کی خدمات اس لائق تھیں کہ اس موضوع پر عالم اسلام کے گوشہ گوشہ میں سیمینار اور علمی مجلسیں منعقد کی جائیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم اس عہد کو امام ابن تیمیہؒ کا دور کہہ سکتے ہیں، مختلف خصوصیات اور اسباب کی بنا پر (جن کی تشریح موجب طوالت ہے)

اس عہد میں ان کی دعوت اور ان کی علمی تحقیقات کی طرف علمی واصلاحی حلقوں میں توجہ اور قدر شناسی کی ایک نئی لہر پیدا ہوگئی ہے اور ان کی اہمیت وافادیت کا احساس تازہ ہوگیا ہے، خود ہندوستان میں ان کے سلسلہ میں اس سے پہلے متعدد مقامات پر سیمینار منعقد ہونے چاہئے تھے، اس لئے کہ یہیں کے ایک ممتاز ترین اور نامور داعی و مصلح اور محققانہ و مجتہدانہ فکر و نظر رکھنے والے عالم حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) نے اپنے زمانہ میں ان کی طرف سے واضح اور طاقتور مدافعت فرمائی، اور ان کی توثیق کی تھی، پھر شاہ صاحب کے خلفاء اور تلامذہ اور ان کے خلفاء و تلامذہ نے دو صدیوں تک مسلسل اس برّصغیر کے حالات و ضروریات کی رعایت کے ساتھ اور جہاد فی سبیل اللہ، تزکیۂ نفوس، قیام مدارس، کتب حدیث کے درس و تدریس اور شرح و ترجمہ اور اصلاح معاشرہ کے بیش قیمت اضافہ کے ساتھ دعوت و اصلاح کے اس عظیم الشان کام کو ایسا جاری رکھا جس کی مثال دوسرے اسلامی ملکوں میں ملنی مشکل ہے۔

پھر میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے اصلاحی، تجدیدی و تحقیقی کام کے اہم اور مرکزی شعبوں کا ذکر کرتے ہوئے، جن میں عقیدۂ توحید کی تجدید اور مُشرکانہ عقائد و رسوم کا ابطال، کتاب و سنّت کے طرز و اسلوب کی ترجیح اور فلسفہ و منطق اور علم کلام کی تنقید، غیر اسلامی ملل و فِرق کی تردید، اور ان کے عقائد و رسوم و اثرات کا مقابلہ، علوم شریعت کی تجدید اور فکر اسلامی کے احیاء اور اس میں ایک نئی حرکت و وسعت پیدا کرنا، ان کی کتاب زندگی کے روشن ترین

عنوانات اور ان کے کارِ تحقیق و تجدید کے اہم ترین شعبے ہیں، عرض کیا کہ میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا قابلِ قدر، واجب الاعتراف کارنامہ اور ان کی تصنیفات و تحریرات کا مرکزی نقطہ جس کو ان کے کمالات و خدمات کے خزانہ کی شاہ کلید MASTER KEY کہا جا سکتا ہے، وہ اس بات کو علمی و عقلی و عملی دلائل سے ثابت کرنا ہے کہ نبوت ہی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی صحیح معرفت اور ہدایتِ کامل کا واحد اور قابلِ اعتماد ذریعہ ہے، پھر میں نے قرآن مجید سے اس حقیقت کے اثبات میں آیات واضحہ اور نصوص صریحہ نقل کرنے کے بعد اس تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی جو بعثت محمدیؐ، نزول قرآن اور ظہور اسلام سے پہلے دنیا کے علمی و فکری اور دینی و اعتقادی حلقوں میں پایا جاتا تھا، اور جس کی قیادت عہد قدیم اور قرون وسطیٰ میں یونان نے اپنے ذمہ لی تھی، اور بتایا کہ اس میدان میں یونانی فلسفہ اور اس کے عظیم ترین قائدین اور علمبرداروں نے (جن کو دنیا کے بہت سے علمی حلقوں نے تقدّس اور معصومیت کا مقام اور ما فوق البشر انسانوں کا درجہ دیا) اس میدان میں کیسی کیسی ٹھوکریں کھائی ہیں، اور خدا کی ذات و صفات اور مخلوق و کائنات سے اس کے ربط و تعلق کے سلسلہ میں کس ابلہی و ابلہ فریبی کا ثبوت دیا ہے، اور کیسی کیسی بوالعجبیاں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں، پھر امام ابن تیمیہؒ نے جس طرح اس "جہل مرکّب" کا پردہ چاک کیا، اور جس یقین و اعتماد اور قوت و قابلیت کے ساتھ فلاسفۂ یونان اور ان کے معتقدین و ناقلین ابن سینا وغیرہ پر تنقید کی اس کے نمونے پیش کیے۔[1]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ جو اس سیمینار میں پیش کیا گیا، یا اس کی تصنیف "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ دوم ص ۲۱۹-۲۴۴

اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہؒ کے اس اہم ترین، عارفانہ و محققانہ نکتہ کو یاد دلایا جو ایک مستقل کتاب پر بھاری ہے، جو انھوں نے قرآن اور فلسفۂ یونان کے درمیان اصولی و اساسی فرق کے سلسلہ میں بیان کیا ہے، وہ یہ کہ قرآن نے صفاتِ خداوندی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اور ہر طرح کی تمثیل کی نفی کی ہے، اور یہی انبیائے کرام کا طریقہ ہے کہ ان کے یہاں اثباتِ مفصّل ہوتا ہے اور نفی مجمل، اس کے برخلاف نا آشنایانِ حقیقت اور فلاسفۂ یونان کے یہاں نفی تو مفصّل ملتی ہے، اور اثبات مجمل، ان کا سارا زور اس پر ہوتا ہے کہ خدا یہ نہیں ہے، یہ نہیں ہے، لیکن خدا کیا ہے، اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کے بارہ میں ان کے یہاں انتہائی اختصار سے کام لیا جاتا ہے، اور وہ سرسری طور پر گذر جاتے ہیں، (اس لئے کہ وہ معرفتِ الٰہی سے محروم ہوتے ہیں[1]) پھر میں نے کہا کہ نفسیاتِ انسانی، فطرتِ بشری، علم الاخلاق اور علم الاجتماع سب کا فیصلہ ہے کہ ہزار نفی NEGATIVES ایک اثبات POSITIVE کے قائم مقام نہیں ہو سکتی، کسی وجود کا کسی وجود سے تعلق، عقیدت و محبت، امید و رجا، اور سوال و طلب کا تعلق اس کے کمالات اور صفاتِ حمیدہ کی بنا پر ہوتا ہے، اور اسی کے نہ ہونے کی وجہ سے فلسفۂ یونان کے حلقوں اور اس کے عہدِ قیادت میں، اس کے ماننے والوں اور ان ملکوں کے معاشرہ کا ذاتِ باری سے تعلق نہ عمیق تھا، نہ قوی، نہ دائمی۔

امام ابن تیمیہؒ کے پُر زور اور پُر اثر اقتباسات نقل کرنے کے بعد میں نے عرض کیا کہ علم کلام اور دینی فکر و نظر کی تاریخ میں طویل سفر جاری رکھنے کے بعد

---

[1] ملاحظہ ہو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتاب (جو بقامت کہتر بقیمت بہتر کی مصداق ہے) النبوات ص ۱۶۸

یہ عجیب و غریب انکشاف ہوتا ہے کہ پوری دو صدیوں کے بعد ہندوستان کے ایک جلیل القدر عالم و مصلح اور مجدد وقت (شیخ احمد بن عبد الاحد سرہندی معروف بہ مجدد الف ثانیؒ متوفی ۱۰۳۴ھ) جن کے متعلق عام اندازہ ہے کہ ان تک شیخ الاسلام کی تصنیفات اور شاید ان کی شہرت بھی نہ پہونچی ہو ٹھیک اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں، یہ علمی توارد کی ایک ایسی مثال ہے جس کی توجیہ توفیق الٰہی کتاب و سنت کے عمیق مطالعہ اور اخلاص کے سوا نہیں کی جا سکتی اور جو قرآن مجید کی آیت :-

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (العنکبوت - ۶۹)	اور جن لوگوں نے ہمارے لئے کوشش کی ہم اُن کو ضرور اپنے رستے دکھا دیں گے اور خدا تو نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔

کی تفسیر اور اس کا ایک نمونہ ہے۔

انھوں نے اسی زور و طاقت اور وضاحت و صراحت کے ساتھ اپنے متعدد مکتوبات میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ نہ عقل محض کا وجود ہے نہ کشف خالص کا، عقل صانع عالم کے اثبات اور اس کے کمالات کی معرفت میں قطعاً عاجز و ناصر ہے، وہ حقائق دینی کے ادراک میں ناکافی ہے، پھر انھوں نے لکھا ہے کہ جس طرح عقل طور حس سے ماوراء ایک چیز ہے، نبوت طور عقل سے اسی طرح ماوراء و مافوق ہے، انھوں نے پوری صفائی سے ثابت کیا ہے کہ عقل کا خالص اور بے آمیز ہونا ممکن ہی نہیں اور وہ حقائق الٰہیہ کی دریافت کے لئے مفید نہیں، عقل و کشف دونوں ایک کشتی کے سوار ہیں اور کشف میں بھی

ایسی ہی آمیزش ہوتی ہے، جیسی عقل میں، بعثت کے بغیر حقیقی تزکیہ ممکن ہی نہیں وہی اللہ کی ذات وصفات واحکام معلوم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔[1]

پھر اس مقالہ میں حاشیہ میں بطور تائید اشارہ کیا گیا کہ حضرت مجدد صاحب کے دو سو برس[2] کے بعد جرمنی کے مایۂ ناز اور اس کے سرمایہ فخر فلسفی امانویل کانٹ EMANUEL KANT–(1724-1804) نے عقل خالص کے امکان و وجود پر اپنی کتاب CRITIQUE OF PURE REASON میں آزادانہ اور ناقدانہ بحث کی، اور ایسی عقل خالص کے وجود میں بڑا شبہ ظاہر کیا جو موروثی عقائد، ماحول کی روایات واثرات اور لاشعور میں بیٹھے ہوئے مسلّمات کے اثر سے آزاد ہو، علامہ اقبال نے اپنے مدراس کے ایک لکچر میں صحیح کہا ہے کہ کانٹ اور اس کی کتاب نے روشن خیالوں اور عقل پرستوں کے کارناموں کو خاک کا ڈھیر بنا دیا۔[2]

میں نے یہ مقالہ صبح کے افتتاحی جلسہ میں اردو کے ایک مختصر تمہید و تعارف کے بعد کسی قدر اختصار کے ساتھ عربی میں سنایا جو توجہ سے سنا گیا، اس کا ترجمہ جو عزیزی مولوی نذر الحفیظ ندوی تیار کر کے لے گئے تھے، شام کو مقالات کی نشست میں سنایا گیا، داعیان اور منتظمین جلسہ کی خواہش اور اہل شہر کے شوق و تقاضہ کی بنا پر شب میں میں نے وہیں ایک جلسۂ عام کو خطاب کیا اس میں بڑی تعداد میں شہر کے شائقین بھی شریک تھے، اور اس پر زور دیا کہ ملت اسلامیہ کو

---

[1] مکتوبات کے اقتباسات اور تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" (مخصوص بحضرت مجدد الف ثانی شیخ سرہندیؒ) حصۂ چہارم ص ۱۹۵-۲۲۶

[2] THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM p. 5.

اس ملک میں باعزت طریقہ پر اور اپنے تشخص کے ساتھ باقی رہنے اور خود ملک کی حفاظت وخدمت کا موقعہ پانے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان اپنی سیرت و اخلاق اور زندگی کے امتیاز کا ثبوت دیں اور اس سے اس ملک کی اکثریت کو اسلام قرآن اور سیرت کے مطالعہ پر آمادہ اور ملّت کے احترام اور اس کی افادیت کے قائل ہونے پر مجبور کریں، نیز وہ ملک میں معتدل معمول کے مطابق NORMAL فضا اور ماحول قائم رکھنے کی کوشش کریں، منافرت اور اشتعال و تصادم اور جذباتیت سے پرہیز کریں، تاکہ ملّت کے نہ صرف تعلیمی و تصنیفی ادارے بلکہ مساجد و معابد بھی محفوظ رہ سکیں، اور ایک پُرسکون اور باوقار فضا میں ایسے سیمنار اور مجالس علم و مذاکرہ منعقد ہو سکیں، جن کا ایک نمونہ ہم صبح سے دیکھ رہے ہیں، اگر یہ معتدل فضا اور باہمی احترام و اعتماد کا ماحول باقی نہ رہا اور بقائے باہم COEXISTENCE کا اصول تسلیم نہ کیا گیا تو پھر کسی چیز کے باقی رہنے کی ضمانت نہیں، اور کسی ادارہ، تحریک اصلاحی و اخلاقی دعوت، اور کسی علمی سرمایہ کے تحفّظ کا بھی کوئی بھروسہ نہیں، خدا کا شکر ہے، جہاں تک معلوم ہوا، یہ تقریر توجہ سے سنی گئی اور لوگوں نے پسند کی۔

والحمد للہ اولاً و آخراً

INDEX

اشاریہ

"کاروانِ زندگی حصّۂ سوم"

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

الف

(سیدنا حضرت) ابراہیم علیہ السلام ۱۹۱
۲۹۶،۲۹۵،۲۲۴
(حضرت) ابوبکر صدیق رضؓ ۲۹۳
(حضرت) انس بن النضر رضؓ ۳۹
(سید) ابراہیم حسنی ندوی ۲۷۷،۱۳
(الحاج) ابراہیم سلیمان سیٹھ ۱۳۳،۱۲۵
(علامہ) ابراہیم شاطبی ۲۲۸
ابراہیم شقرہ دیکھئے محمد
(ڈاکٹر سید) ابراہیم ندوی ۲۲۱
(شیخ الاسلام حافظ) ابن تیمیہؒ
۳۲۵،۳۲۲،۲۶۲،۲۲۸،۲۲۴،۷۵
۳۲۶-۳۰
(علامہ) ابن حجر عسقلانی ۲۲۹
(علامہ) ابن حزم اندلسی ۲۲۸
(علامہ) ابن خلدون ۲۲۹
(شیخ) ابواسحاق اسفرائنی ۲۲۸
(مولانا سید) ابوالاعلی مودودی ۱۲۱،۴۵
(قاضی) ابوبکر باقلانی ۲۲۸
(علامہ) ابوبکر رازی ۲۲۹
(امام) ابوالحسن اشعری ۲۶۲،۲۲۸
(مولانا سید) ابوالحسن علی ندوی ۹۰،۱۰
(علامہ) ابوالریحان البیرونی ۲۲۹،۲۲
(مولانا) ابوالعرفان خاں ندوی ۵۶
۳۲۲،۱۸۸،۶۳
(شیخ الرئیس) ابوعلی ابن سینا ۲۲۹
ابوالفائد محمد یحیی ۶۴،۵۷
(مولانا) ابوالکلام آزاد ۸۴
(سید) ابومحمد ۴۰
(ڈاکٹر) احتشام الرحمن ۳۲۲
(امام) احمد ابن حنبلؒ ۴۶
(مجدد الف ثانی شیخ) احمد بن عبدالاحد سرہندیؒ
۳۳۱،۳۳۰،۱۷۷،۷۵،۳۳
(شیخ) احمد بن عبدالعزیز المبارک ۲۵
(نواب حاجی) احمد حسین مرادآبادی ۳۰۱
احمد رشید شروانی ۱۹۹
احمد شاہ ابدالی ۲۰۰
(حضرت سید) احمد شہید رائے بریلوی
۲۴۱،۱۰۵،۹۳،۵۵،۵۴،۴۴،۴۰
۳۱۷،۳۱۶،۳۱۳
(شیخ) احمد عبدہ ناشر ۳۲،۳۱
(سید) احمد علی حسنی ندوی ۱۳
(خواجہ) احمد فاروقی ۳۱۵
(مولوی) احمد فہمی زمزم انڈونیشی ۲۳۷

(پروفیسر) اختر حسین نظامی ۱۰۵
آرتھر جے آربری ۱۲۱
ارجن سنگھ ۱۰۵
(جنرل) ارشاد ۶۰
(پروفیسر) آرنلڈ ۲۵۳
(مولوی سید) اسحاق حسینی ندوی ۱۰۵
(ڈاکٹر) اسحاق فرحان ۲۴
(مولانا) اسلم جیراجپوری ۲۱۹
(قاضی) اسماعیل الاکوع ۴۸
(مولانا شاہ محمد) اسماعیل شہیدؒ ۳۱۴، ۳۱۶
(ڈاکٹر) اسماعیل راجی فاروقی ۱۱۰
(مسٹر) اشوک سین ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۵
۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۶
آغا محمد جعفر ۱۲۲
(مولانا) افتخار فریدی ۳۱۹
(ڈاکٹر محمد) اقبال ۱۸، ۲۴، ۳۲، ۳۶
۵۰، ۵۵، ۶۲، ۷۲، ۹۵، ۹۷، ۱۶۳
۱۶۹، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۳۲، ۲۸۶، ۳۰۴
۳۳۱
امانویل کانت (فلسفی) ۳۳۱
(جسٹس سید) امیر علی ۲۳۲، ۲۵۲
(شیخ) امین سراج ۱۶۲
(خواجہ) الطاف حسین حالی ۵۹، ۲۲۷
(پرنس) انجم قدر ۱۲۶
انجمن آراء بیگم ۱۲۲
اندر کمار گجرال ۱۹۹
(مسز) اندرا گاندھی ۷۹، ۸۳، ۸۴، ۹۱
(ڈاکٹر) انعام اللہ خاں ۶۸
انور ابراہیم (وزیر تعلیم ملیشیا) ۲۳۷
انیس چشتی ۲۰۵
(مسٹر) اوجول تاوڑے ۲۰۶
(شیخ) اہدل یمنی ۵۰
(جسٹس) آئر ۱۳۵
(ڈاکٹر) اے، سی بورڈ ۱۰۷
ایڈورڈ فلیرو ۱۴۴
ایڈورڈ گبن ۲۵۲
ایڈورڈ ولیم لین ۱۱۷

ب پ

(سلطان) بابر ۵۰، ۸۱
باسورتھ اسمتھ ۲۵۳
باقر علی خاں ۱۲۲
بالا صاحب دیورس ۲۰۰
بدر الدین طیّب جی ۱۹۹
(ڈاکٹر) براؤن ۲۳۲
(ڈاکٹر) براؤننگ دیکھئے ڈیوڈ
(مولانا محمد) برہان الدین سنبھلی ۱۲۰
۳۲۲
(ڈاکٹر) برین جی گیزرڈ ۲۷۶
(مسٹر) بردواج ۱۳۵
(شیخ) بشیر الابراہیمی ۱۸۱

(حاجی) بشیر الدین ۶۴
بلرام جھاکھڑ ۱۴۲
(نواب) بہادر یار جنگ ۵۴
(استاد) بہاء الامیری دیکھئے عمر
(مولوی) بہاء الدین ندوی ۲۲۲
البیرونی دیکھئے ابو الریحان
بیگم اقتدار علی خاں انجنیر ۱۲۷
بیگم خورشید عالم خاں ۱۲۸
بیگم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ۱۲۸
بیگم ساغر نظامی ۱۲۷
بیگم ضیاء الرحمٰن انصاری ۱۲۷
بے نظیر بھٹو ۱۷۲
(مسٹر) پنت ۱۴۴

ت ٹ

(پروفیسر) تیواری ۱۴۴
ٹنکو عبد الرحمٰن ۲۴۴
ٹیپو سلطان ۷۰

ج چ

(حضرت) جعفر طیارؓ ۳۹
(شیخ) جاد الحق علی جاد الحق (شیخ الازہر) ۱۷۹
جارج سیل ۱۲۱
(مولوی سید) جعفر مسعود حسنی ندوی ۹۴، ۲۲۲
(مولانا) جلال الدین رومی ۱۶۳، ۲۳۰
(علامہ) جلال الدین سیوطی ۲۲۰
(ڈاکٹر) جمال الدین عطیہ ۱۰۶، ۱۰۹
(صدر) جمال عبد الناصر ۲۵۵
(ڈاکٹر) جمیل جالبی ۷۰
(پنڈت) جواہر لال نہرو ۸۴، ۱۹۸
(مسٹر) چانسر کر ۲۰۱
ایچ، اے، ڈورا ۱۴۳
چدرانہ سوامی ۱۴۰
چوائن لائی ۲۰۲
چیدانند داس گپتا ۸۲

ح

(سید) حامد ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۰۱، ۲۰۶، ۲۶۹، ۳۰۰
(نواب صدر یار جنگ مولانا) حبیب الرحمٰن خاں شروانی ۲۵۹
(مولانا) حبیب الرحمٰن نعمانی ۳۲۳
(مولانا) حسرت موہانی ۲۱۵
حسن بن صبّاح ۲۵۵
(امیر) حسن بن طلال ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۱۷، ۲۵
(سید) حسن عسکری طارق ۲۶، ۹۴، ۲۸۲، ۳۰۳
(ملک) حسین ۱۴
(شیخ) حسین بن محسن انصاری یمانی ۳۱، ۴۸

(مفتی) حمد الخلیلی ۲۵
(استاد) حیدر غدیر ۲۷
(شیخ الحدیث مولانا) حیدر حسن خاں ٹونکی ۳۱

(خ)
(حضرت) خبیبؓ ۳۹
(ڈاکٹر) خادم رحمانی نوری ۱۱۸
(مولانا) خرّم علی بلہوری ۳۱۴
(امیر) خسرو ۲۳۰
(شیخ) خلیل بن محمد حسین یمانی (عرب ھتا) ۵۱،۴۷،۳۰
(پروفیسر) خلیق احمد نظامی ۷۲،۷۵
خمینی دیکھئے روح اللہ

(د) (ڈ)
دانیال لطیفی ۱۲۶
(حمید) دلوائی ۱۲۶
دنیش گوسوامی ۱۴۴
(ڈاکٹر) ڈیویڈ براؤننگ ۲۷۲،۱۰۷

(ر) (ڑ)
رابندر ناتھ ٹیگور ۶۲
(ڈاکٹر) راٹھور ۱۰۵
(مسٹر) راجیو گاندھی (وزیر اعظم ہند) ۳۹-۱۳۱،۱۴۱،۱۴۴،۱۴۶،۱۴۸،۱۴۹،۱۵۷،۱۶۰
رام ۸۱
رچرڈ بل ۱۲۱
رحیم قریشی ۱۳۸،۱۳۵
(مولانا قاری سید) رشید الحسن ۱۷۱،۶۵
(مولانا مفتی) رضا انصاری ۳۲۱
(استاد) رضوان دعبول ۲۵،۲۳
(مولانا شاہ) رفیع الدین دہلوی ۳۱۴
(ڈاکٹر) رفیق وفا الدّجانی ۲۲،۲۱
(مہاراجہ) رنجیت سنگھ ۳۱۷،۹۳
روپ کنور ۱۳۰
(آیۃ اللہ) روح اللہ خمینی ۲۵۲،۲۵۱ ۲۵۵-۵۸
(مولانا) روم دیکھئے جلال الدین
(ڈاکٹر) آر ایل، شکلا ۸۲
(امام) زہری ۲۴۱

(س)
(حضرت) سعد بن ربیعؓ ۳۹
(شیخ) سعدی ۲۳۰
(مولوی) سعود الحق ندوی ۶۴
(مولانا) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی ۲۲۱، ۳۰۳، ۳۲۳
(ڈاکٹر) سعید رمضان ۱۱۰
(مولانا) سعید مجدّدی ۳۱۰
سلامت اللہ دہلوی ۱۴۷
(مولوی) سلطان ذوق ۶۴،۵۵
(مولوی سید) سلمان حسینی ندوی ۶۳،۵۶،۹، ۱۶۵،۷۷

(علامہ) سلیمان یحییٰ الاہدل ۵۰
(علامہ سید) سلیمان ندوی ۲۳۲،۱۸۷
(حکیم) سنائی ۲۳۰
(ڈاکٹر) سون سنگھ ۱۰۵
(استاد) سید قطب ۱۶۲،۴۵
(مسٹر) ایس، ڈی، واگھ ۲۰۶،۲۱۱،
۲۱۲

ش

(ڈاکٹر) شاخت ۲۳۳
شاہ بانو بیگم ۱۲۷،۱۱۶
(علامہ) شبلی نعمانی ۵۹، ۲۱۷،۲۳۲،
۳۲۲،۲۵۹
شبیر بھائی نورالدین ۱۲۶، ۱۳۸،
شرف الدین باباخانوف ۱۴
(شیخ) شعیب ارناؤوط ۲۳
(مولانا) شمس الحق ندوی ۲۳۶
(علامہ) شمس الدین سخاوی ۲۲۹
(شیخ) شمس الدین ملیشی ۲۴۹
(شری) شنکر کرشن ٹھاکر ۲۶۵
(صاحبزادہ) شوکت علی خاں ۲۲۲
(سید) شہاب الدین ایم، پی ۱۹۹،۲۸۱
(سید) شہاب الدین دیسنوی ۲۱-۳۱۹
(حافظ) شیرازی ۲۳۰
شیر شاہ سوری ۵۶
شیطان ۲۰۸

ص

(سیدنا حضرت) صالح علیہ السلام ۲۴۸
صادق علی خاں ۱۲۲
صادق فؤاد مفتی (سفیر سعودی) ۱۸۹
(مولانا سید) صباح الدین عبدالرحمٰن
۸۲، ۳۱۵، ۳۱۸، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۴،
۳۲۵
(شیخ) صُبیحی (وزیر خارجہ یمن) ۴۴
(مولانا قاری سید) صدیق احمد باندوی
۱۰۵
(امیر الملک نواب سید) صدیق حسن خاں
۶۵
(استاد) صدیق فاضل ۲۴۶
(سلطان) صلاح الدین ایوبی ۱۸،۲۳

ض

(علامہ) ضیاء ابن بیطار ۲۲۹
(پروفیسر) ضیاء الحسن فاروقی ۳۲۲
(مولانا) ضیاء الدین اصلاحی ۳۲۲
(شیخ) ضیاء الدین باباخانوف ۱۴
ضیاء الرحمٰن انصاری (وزیر ہند) ۱۲۷
۱۳۲، ۱۴۷، ۱۹۹، ۲۰۰، ۳۲۰

ط

(وکیل) ظفر احمد صدیقی ۱۱۰
(ڈاکٹر) ظفر احمد صدیقی ندوی ۲۲۱
(مولانا) ظفر علی خاں ۷۲

ع

(حضرت) عمر بن الخطابؓ ۳۰۷
(حضرت) علی بن طالبؓ ۴۷، ۱۷۳
(حضرت) عمرو بن العاصؓ ۷۴، ۱۵۶
(بیگم) عابدہ احمد ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۴۷
عارف محمد خاں ۱۴۵
(ڈاکٹر) عبدالباری ۲۲۱
(ڈاکٹر) عبدالباسط بدر ۲۷، ۳۰۵
(مولانا) عبدالحق ۶۴
(ڈاکٹر) عبدالحلیم ندوی ۲۲۱
(ڈاکٹر) عبدالحلیم عویس مصری ۳۲۶
(حکیم) عبدالحمید ۱۹۹، ۲۶۹
(قاضی) عبدالحمید اندوری ۱۰۵، ۱۹۷
(سلطان) عبدالحمید خاں ۱۶۶
(مولانا حکیم سید) عبدالحی حسنی ۱۶
۵۱، ۲۳۳، ۳۱۳، ۳۱۷
(شیخ) عبدالرحمن خلیفہ ۲۳
(ڈاکٹر) عبدالرحمن رافت الباشا ۲۸
(قاضی) عبدالرحمن محبوب ۴۴، ۱۰۴
(مولوی) عبدالرحمن بٹ ندوی ۹۱
(مولانا شاہ) عبدالرحیم مجددی ۲۱۸
۲۲۰
(محدث) عبدالرزاق بن ہمام ۴۶
(حاجی) عبدالرزاق رائے بریلوی ۵۶
۱۸۹، ۲۶۹، ۳۲۰

(ڈاکٹر) عبدالرؤوف مصری ۲۳۸
۲۵۰
(مسٹر) عبدالستار افغانی ۱۷۲
(مولانا) عبدالسلام ندوی ۲۵۹
(امام اہلسنت مولانا) عبدالشکور فاروقی
۲۵۷
(شیخ) عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز
۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۹، ۳۰۰
(مولانا شاہ) عبدالعزیز دہلوی ۲۶۲
(شیخ) عبدالعزیز الرفاعی ۱۰۳
(سلطان) عبدالعزیز ۱۶۶
عبدالعزیز عبدالغنی (وزیر اعظم یمن) ۴۴
(شیخ) عبدالعزیز العلی المطوع ۲۷۳
۲۷۶
(علامہ) عبدالعزیز میمنی ۵۲
(ڈاکٹر سید) عبدالعلی حسنی ۳۰۲
(مولانا میر) عبدالعلی ۱۰۴
(الحاج) عبدالغفور پاریکھ ۲۰۱
(شیخ) عبدالغنی شمس الدین ۲۴۴
(شیخ) عبدالغنی نورولی ۲۸۱
(شیخ) عبدالقادر جیلانی ۲۹۹
(مولانا شاہ) عبدالقادر دہلوی ۳۱۴
(ڈاکٹر) عبدالقدوس ابوصالح ۲۷، ۲۱۶
۲۱۹، ۲۲۱
(مولانا) عبدالکریم پاریکھ ۵۶، ۶۳، ۱۳۸، ۲۰۰، ۲۰۴

(شیخ) عبداللہ بغدادی ۹۸
(ملک) عبداللہ بن شریف حسین ۱۴
(شیخ) عبداللہ بلخیر ۹۸
(شیخ) عبداللہ بن ابراہیم الانصاری
۲۱۶، ۲۹۵
(استاد) عبداللہ قادری ۲۷
(ڈاکٹر) عبداللہ عباس ندوی ۲۲۱
۲۸۲، ۲۸۸، ۳۱۶، ۳۲۲، ۳۲۵
(ڈاکٹر) عبداللہ عبدالمحسن الترکی ۱۰۳
۲۷۳، ۳۲۶
(شیخ) عبداللہ علی بصفر ۳۰۷
(ڈاکٹر) عبداللہ عمر نصیف ۷، ۱۰، ۱۸۹
۲۷۲، ۲۷۳، ۲۸۲، ۲۸۴، ۲۹۳
(شیخ) عبداللطیف ساعاتی جونپوری
۳۰۰، ۳۰۳
(مولانا) عبدالماجد دریابادی ۱۲۱
(شیخ) عبدالمقصود خوجہ ۹۸
(شیخ) عبدالہادی الحاج اوانخ ۲۴۰
(مولانا مفتی) عتیق الرحمٰن عثمانی ۱۸، ۲۹
(سلطان) عثمان خاں اول ۱۷۰
عثمان عارف نقشبندی (گورنر یوپی)
دیکھئے محمد عثمان
عثمان نوری آفندی ۱۶۲، ۱۶۹
(قاضی محمد) عدیل عباسی ۱۱۰، ۲۱۳
عرب صاحب دیکھئے خلیل
(شیخ) عزت ازودترکی ۱۶۵
(شیخ) عطیہ سالم ۹۷
(سید) علی حسن قدعق ۹۸
(ڈاکٹر) علی رضا عدنان نحوی ۲۱۶
علی عبداللہ الصالح (صدر جمہوریہ یمن)
۴۳
(امیر) علی میمنی ۳۴
عماد الدین خطیب مدراسی ۲۵۰
(حضرت) عمر بن عبدالعزیز ۴۰
(استاد) عمر بہاء الامیری ۲۴، ۲۵
۲۱۶، ۳۰۵
عمرو بن لحیؒ ۲۹۷

غ

(امام) غزالی ۲۲۸، ۲۶۸
(الحاج) غلام محمد (محمد بھائی) ۲۶۹
(سید) غلام محمد انجینیر حیدرآبادی ۲۳۸

ف ق

(شیخ) فاروق جرّار ۱۴
فخر الدین علی احمد (سابق صدر جمہوریہ ہند)
۱۲۶
(امام) فخر الدین رازی ۲۲۸
(ڈاکٹر) فرحان احمد نظامی ۱۰۷
۷۳--۲۷۰، ۲۷۵
(مولوی) فرید احمد ندوی ۲۲۲
فلپ ہٹی ۲۳۲، ۲۵۲، ۲۵۳

فونہ دار ۱۳۹
القاضی الارشی ۳۴
(شیخ) قطب عالم گجراتی ۳۱۳
(ڈاکٹر سید) قمرالدین ۲۶۸

ک

(ڈاکٹر) کامل الباقر ۲۷۳
(استاد) کامل الشریف ۲۴
کاشانی (مغربی فاضل) ۲۵۲
(حافظ) کرامت اللہ دہلوی ۲۹، ۱۳۷، ۱۴۷، ۱۸۷
(مولانا) کرامت علی جونپوری ۵۴، ۳۱۴
کرشن جی ۸۲
کرشنا سنگھ ۱۲۳
(مولانا سید) کلب عابد مجتہد ۱۲۶، ۱۳۸
کلثوم بی بی ۱۲۲
کُلدیپ نیّر ۱۹۹، ۲۶۶
(استاد) کمال ابوالمجید ۲۴
کمال اتاترک ۲۵۵
(ڈاکٹر) کے، بی گریفن ۱۰۷، ۱۰۸
(مسٹر) کے، کے تیواری ۱۴۰

گ ل

گاندھی جی ۸۱، ۸۶، ۹۱، ۱۲۹، ۱۵۰، ۱۹۷
گولڈ زیہر ۲۳۳
گاتو (فرانسیسی مستشرق) ۲۲
(ڈاکٹر) لیبان ۲۵۲
لین پول ۲۵۳

م

(سیدنا و نبینا حضرت) محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ۱۹، ۳۵، ۶۰، ۹۶، ۱۰۰، ۱۰۸، ۱۱۷، ۱۹۱، ۱۹۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۵، ۲۳۳، ۲۳۷، ۲۵۲، ۲۵۴، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۸۵، ۲۹۷
(سیدنا حضرت) موسیٰ علیہ السلام ۱۷۴
ارماڈیوک پکتھال ۱۲۱
مارکس ۱۰۸
(امام) مالکؒ ۳۲۴
مالک رام ۱۹۹
ماؤ ۱۰۸
متھرا اہیر ۱۲۳
(علامہ) مجدالدین فیروزآبادی ۵۰، ۵۲
(مولانا) مجاہدالاسلام قاسمی ۱۲۵
مجدّد الف ثانی دیکھئے احمد سرہندی
(مولانا) محبوب الرحمٰن ازہری ندوی ۱۸۹
(استاد سید) محسن احمد باروم ۳۰۶
(ڈاکٹر) محسن شمسی ۲۶۸
محسن کاکوروی ۲۲۱
(استاد) محمد ابراہیم شقرہ ۲۳، ۲۴
(علامہ) محمد ابن الہثیم ۲۲۹
محمد احمد خاں ۱۱۶

محمد اسحاق کانپوری ۲۷۱، ۲۷۵، ۲۷۶
(مولانا) محمد اسعد مدنی ۱۲۶
(ڈاکٹر) محمد اشتیاق حسین قریشی ۱۰۵
۱۹۶، ۲۶۹، ۳۰۰
(شیخ) محمد بن محمد الادریسی ۲۲۹
(علامہ) محمد بن جابر البتانی ۲۲۹
(شیخ) محمد بن عبداللہ السبیل (امام حرم)
۱۸۹، ۲۸۴، ۳۲۴
(علامہ) محمد بن علی الشوکانی ۴۶
(علامہ) محمد بن موسیٰ الخوارزمی ۲۲۹
(سید) محمد جمیل ۷۴
(استاد) محمد الحافظ ۳۲۴
(ڈاکٹر) محمد حسان خاں ندوی ۱۸۸
(ماسٹر) محمد حسن انصاری ۱۰۵
(استاد) محمد حسن بریغش ۱۶۵
(مولانا سید) محمد الحسنی ۴۴
(مولوی) محمد حسین آزاد ۵۹
(مولانا سید) محمد رابع حسنی ندوی ۲۸
۶۵، ۱۶۲، ۱۷۱، ۱۷۹، ۲۳۵، ۲۵۰
۲۷۱، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۸۰، ۳۱۱، ۳۲۴
(ڈاکٹر) محمد راشد ندوی ۲۲۱
(شیخ الحدیث مولانا) محمد زکریا سہارنپوری
۲۳۷
محمد شاہ رنگیلے ۵۰
(مولانا قاری) محمد طیب ۱۱۱، ۱۱۲
محمد ظفر اللہ خاں ۱۱۸
(مولانا) محمد عارف ندوی ۳۱۷
محمد عثمان حیدرآبادی ۲۸۱، ۳۰۹
(گورنر) محمد عثمان عارف نقشبندی
۱۹۰، ۳۲۱
(شیخ) محمد علی الاکوع ۴۸
(مولانا) محمد علی جوہر ۲۱۷
(شیخ) محمد علی الدولہ ۹
(مولوی) محمد علی رجب ندوی ۲۳۷
(مولانا سید) محمد علی مونگیریؒ ۱۱۳
(مولانا حافظ) محمد عمران خاں ندوی
۱۸۷، ۳۱۰
(شیخ) محمد الغزالی ۲۵
(سلطان) محمد فاتح ۱۷۰
محمد فیضان بیگ ۲۲۲
(استاد) محمد قطب ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۶۵
۱۶۷
(مولانا سید) محمد مرتضیٰ ۱۰۵
(ڈاکٹر) محمد محسن عثمانی ندوی ۲۲۱
(مولانا قاضی) محمد معین اللہ ندوی
۱۸۸، ۲۶۹، ۳۱۰، ۳۲۴
(مولانا) محمد منظور نعمانی ۲۵۶
(مولانا) محمد ناظم ندوی ۳۰۳، ۳۰۶، ۳۰۵
(الحاج) محمد نور عبدالقادر نورولی
۲۶، ۲۸، ۲۸۱

(مولانا سید) محمد واضح رشید حسنی ندوی ۱۳
۶۵، ۹۴، ۳۰۳
(الحاج) محمد ولی عبداللہ نوروی ۲۶
(شیخ) محمد المؤید یمنی ۳۲
محمد یونس سلیم ۲۸۱
محمود بنات والا ۱۳۸، ۱۴۷
(ملاّ) محمود جونپوری ۲۲۹
(شیخ) محمود الحافظ ۳۲۴
(حافظ) محمود خاں شیرانی ۲۳۲
(مولانا) محمود الحسن ۱۱۰
(سلطان) محمود شاہ اول ۳۱۳
(سید) محی الدین احمد ۲۲۱، ۲۷۱
(مولوی) محی الدین ۶۴
(ڈاکٹر) مختار الدین آرزو ۲۶
(علامہ سید) مرتضیٰ بلگرامی زبیدی
۵۰، ۵۱
مسرور احمد لکھنوی ۱۰۹، ۲۷۵
(ڈاکٹر) مسعود الرحمن خاں ندوی ۱۸۸
(ڈاکٹر) مشیر الحق ندوی ۳۱۶
(سید) مصباح النبی حسنی ۳۰۶
(ڈاکٹر) مصطفیٰ ۱۶۲
(ڈاکٹر) مصطفیٰ السباعی ۲۰
(مولانا سید) مظفر حسین کچھوچھوی ۱۲۶
(مولانا) مقتدیٰ حسن ازہری ۳۲۵
مقدسی ۲۲
ملکۂ سبا ۴۱، ۴۵
(مولانا سید) مناظر احسن گیلانی ۲۰
(مولانا سید) منت اللہ رحمانی ۱۱۳
۱۲۵، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۷
۱۴۱، ۱۹۹، ۲۰۴
(مولوی سید) منظر عالم ندوی ۲۷۷
منو ۱۱۷
مہاراجہ صاحب پنّا ۱۰۵
(شیخ) مہدی بن عبّود ۲۵

(ن)

(ڈاکٹر) ناصر الدین الاسد ۲۵
(مولوی) نثار الحق ندوی ۲۶۹
نجمہ ہبۃ اللہ ۱۲۶، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۴۷
(قاضی) نذر الاسلام ۶۱
(مولوی) نذر الحفیظ ندوی ۲۱۴
۲۲۲، ۲۳۶، ۳۳۱
(ڈپٹی) نذیر احمد ۵۹
(خواجہ) نظام الدین اولیاء ۲۱۰
(شیخ) نعمت یوسف ملیشی ۲۳۸
نفیس احمد ۲۶۷
(مسٹر) نکلسن ۲۳۲
(مسٹر) نکھل چکرورتی ۲۶۴، ۲۶۶
(مولوی) نور عظیم ندوی ۲۲۲، ۳۱۱
نوروی دیکھئے محمد عبدالقادر
نیاز احمد رائے بریلوی ۲۲۰

نیاز حسن خاں (اسپیکر یوپی اسمبلی) ۱۹۰
(شری) این ڈی تیواری ۱۳۹

و ۔ ہ

(سلطان) وحیدالدین ۲۸۶
(مفتی) ولی حسن ٹونکی ۷۲
(حکیم الاسلام شاہ) ولی اللہ دہلوی
۱۵، ۵۲، ۶۷، ۶۷-۷۴، ۲۰۰
۲۲۹، ۲۶۲، ۳۱۴، ۳۲۷
(سر) ولیم میور ۲۵۲، ۲۵۳
(مسٹر) وہیری (WHERRY) ۲۵۳
ہٹلر ۲۶۶
ہٹی دیکھئے فلپ

(مولانا شاہ) ہدایت علی مجددی ۲۱۸

ی

یاقوت حموی ۲۲
(مولانا) یحییٰ علی صادقپوری ۴۰
(شیخ) یحییٰ الفسیل ۳۴، ۴۳
(شیخ) یحییٰ لطیف الفسیل ۴۴
(شیخ) یٰسین عبدالعزیز ۳۳
(ڈاکٹر) یٰسین مظہر صدیقی ندوی ۲۲۲
(ایڈوکیٹ) یوسف حاتم مچھالہ
۱۲۶، ۱۳۸
(شیخ) یوسف کاراجہ ۱۷۰
(ڈاکٹر) یوسف القرضاوی ۲۵

کتابیات

قرآن مجید

الف

اخبار نو دہلی (اخبار) ۱۴۷
اذاہیت ریح الایمان ۴۴
ازالۃ الخفاء ۷۷
اسٹیٹسمین (اخبار) ۱۹۹
اسوۂ صحابہ ۲۵۹
اصول کافی ۲۵۲
انسانی تہذیب وتمدن پر اسلام کے
اثرات واحسانات ۱۳۳

الاہرام (جریدہ) ۱۸۶
ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت
۲۵۶، ۲۵۷

A LITERARY HISTORY OF
THE ARABS ۲۳۲
A LITERARY HISTORY OF PERSIA ۲۳۲
A SHORT HISTORY OF THE ARABS ۲۳۳
ISLAM AND THE EARLIEST
MUSLIMS TWO CONFLICTING
PORTRAITS ۲۶۰

ب پ

بابری مسجد تاریخی پس منظر اور پیش نظر کی روشنی میں ۸۲
برہان (رسالہ) دہلی ۳۰
البعث الاسلامی (مجلہ) ۳۰۳
پرانے چراغ ۲۱، ۳۰
پندرہویں صدی ہجری ماضی وحال کے آئینہ میں ۲۸۸

ت ث

تاج العروس ۵۱
تاریخ دعوت وعزیمت ۴، ۷، ۲۶، ۲۶۱، ۳۲۵، ۳۲۸، ۳۳۱
تحفۂ پاکستان ۶۶
تعمیر حیات (اخبار) ۱۷۱، ۲۱۴
تغلق (ٹامل اخبار) ۱۴۰
تقویۃ الایمان ۳۱۴، ۳۱۶
TIMES OF INDIA ۱۳۱، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷
THE MEANING OF QURAN ۱۱۸
THE QURAN ۱۱۸
THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM ۳۳۱
THE RUNNING COMMENTARY OF THE HOLY QURAN ۱۱۸
THE TELEGRAPH ۲۶۵
الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ۱۶، ۲۳۲

ج چ

جب ایمان کی بہار آئی ۴۰، ۴۴
الجزیۃ فی الاسلام ۲۳۲
چراغ رہ گزر ۳۱۶

ح خ

حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان ۲۵۴
حجۃ اللہ البالغۃ ۷۶، ۷۷
الحکومۃ الاسلامیۃ ۲۵۳
حماسہ (دیوان) ۳۲
خطبۂ صدارت دینی تعلیمی کونسل کانفرنس بنارس ۱۹۸۶ء ۱۵۹
خطبۂ صدارت اجلاس ہشتم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بمبئی ۱۹۸۶ء ۱۵۹، ۱۶۰
خیام ۲۳۲

د ذ ر

دائرۃ المعارف مذاہب واخلاق ۳۰۸
دستور حیات ۱۶۴
دستور ہند ۱۲۳، ۱۵۲
دعوت دہلی (اخبار) ۱۴۰
دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں ۵۱-۵۳، ۱۵۷، ۱۶۰، ۱۶۱
ذکر وفکر دہلی (ماہنامہ) ۲۳۵، ۲۸۸
الرائد (جریدہ) ۱۳، ۳۰۳

روائع اقبال ۲۵، ۵۵، ۱۶۴

(س) (ش)

سفرنامہ حجاز ۳۰۲

سنن ابن ماجہ ۲۹۸

سیرت سید احمد شہیدؒ ۴۰، ۷۶

سیر الصحابہ ۲۵۹

سیرۃ الصدیق ۲۵۹

السیرۃ النبویۃ ۹۸

SPIRIT OF ISLAM ۲۳۲

شعر العجم ۲۳۲

(ص)

صحاح ستہ ۲۲۸

صحیح بخاری ۳۰، ۱۰۰، ۲۹۷

صحیح مسلم ۲۹۷

الصّراع بین الایمان والمادّیۃ ۲۲

صورتان متضادّتان ۲۶۰

۲۹۵

(ع)

عالمِ عربی کا المیہ ۲۵۴

عرب و ہند کے تعلقات ۲۳۲

عربوں کی جہاز رانی ۲۳۲

العقیدۃ والعبادۃ والسلوک ۱۶۴

(ف) (ق)

الفاروق ۲۵۹

فی مسیرۃ الحیاۃ ۹، ۳۰۷

قاموس ۵۱، ۵۲

القرن الخامس عشر الہجری الجدید ۲۸۷، ۲۸۸

قصیدۂ جہادیہ ۳۱۴

قصیدۂ مدیح خیر المرسلین ۲۲۱

قومی آواز (اخبار) لکھنؤ ۱۲۴، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۴۰، ۱۹۸، ۲۶۸

(ک) (گ)

کاروانِ زندگی ۹، ۱۱، ۱۴، ۲۹، ۶۵، ۷۴، ۷۵، ۱۰۶، ۱۱۱، ۱۸۰، ۱۹۵، ۲۶۱، ۲۶۳، ۲۷۰، ۳۰۷

کتاب الممالک والمسالک ۲۲۹

کشف الاسرار ۲۵۲، ۲۵۳

کہف اہلِ الکتاب ۲۲

CRITIQUE OF PURE REASON ۳۳۱

گلِ رعنا ۳۱۲، ۳۱۳

(م)

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ۲۹۵

مثنوی مولانا روم ۱۶۳، ۲۳۰

المجتمع (جریدہ) ۲۷۶، ۲۷۷

مختارات من ادب العرب ۲۸، ۹۸

مدینہ (اخبار) ۶۴

مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش ۴۷

مسلم پرسنل لا کی صحیح نوعیت و اہمیت (رسالہ) ۱۱۴

مسلمانوں کے مسائل وجذبات سمجھنے کی کوشش کیجئے (رسالہ) ۱۹۷
مسند احمد ۲۹۷
مصنف عبدالرزاق ۴۶
مطالعۂ سلیمانی ۱۸۸
معارف (ماہنامہ) ۳۲۵
المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ ۱۶
ملک کے بہی خواہوں کے سوچنے اور کرنے کی باتیں (رسالہ) ۲۰۶
ملک ومعاشرہ انتہائی خطرناک موڑ پر ہے اور اس کی جلد خبر لینے اور فکر کرنے کی ضرورت ہے (رسالہ) ۲۰۲
منتخبات قرآن ۱۱۷
الموافقات ۲۲۸
مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت ۷۶

MAHARASHTRA HERALD ۲۰۶، ۲۱۱
MAIN STREAM ۲۶۴

ن و ہ

النبوات ۲۲۴، ۳۲۹
نبی رحمت ۲۹۸
نزہۃ الخواطر ۵۱، ۲۳۲
نصیحت المسلمین ۳۱۴
نغمات الایمان بین صنعاء وعمان ۳۷، ۳۹، ۴۰
نفقۂ مطلقہ کے بارے میں سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ (رسالہ) ۱۲۰
نقوش اقبال ۹۷
نیل الاوطار ۴۶
ولایۃ الفقیہ ۲۵۳
HINDUSTAN TIMES ۲۶۷

مقامات

الف

آبشار ٹورنٹو ۳۵
آبنائے باس فورس ۱۶۶، ۱۶۷
ابوظبی ۲۵، ۳۱، ۳۲۴
اجودھیا ۸۱، ۱۵۸
اربد ۱۹
اردن۔ شرق اردن ۱۱، ۱۵، ۱۷

۱۸، ۱۹، ۲۲، ۲۴، ۵۳، ۲۹۸
اڑلیسہ ۱۲۵
ازمیر (ترکی) ۲۲
آسام ۱۴۴
اسپین ۸۲
استنبول ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۹، ۱۷۰، ۲۱۸
آسنسول ۱۱۵

اعظم گڑھ ۸۱، ۲۱۷، ۳۱۳، ۳۱۸، ۳۲۲، ۳۲۳
افغانستان ۳۱۸
افیس ۲۲
اکبری گیٹ (لکھنؤ) ۲۶۹
آکسفورڈ ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۰۹، ۱۷۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۵، ۳۲۶
الہ آباد ۲۱۷، ۳۱۶
امارات عربیہ ۱۱
امریکہ ۲۲، ۵۳، ۲۰۷، ۲۳۱، ۲۳۶، ۲۵۶، ۲۸۲
اُمّ قیس (مقام۔ اردن) ۱۹
اناطولیہ ۲۲،
انبالہ ۴۰
انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل۔ مکۂ مکرمہ ۲۸۲
انٹرنیشنل سنٹر۔ دہلی ۱۲۹، ۱۹۹
اندور ۳۱۰
آندھرا پردیش ۱۲۵، ۲۶۹
انڈونیشیا ۱۴۳، ۱۹۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۶۲، ۲۸۲
انگلستان۔ انگلینڈ۔ برطانیہ ۷۹، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۵۴، ۱۷۹، ۲۶۲، ۲۷۱
اودھ ۵۱
ایتھوپیا ۹۸
ایران ۲۱، ۲۷، ۱۸۲، ۱۹۹، ۲۳۲، ۲۵۹، ۲۶۲
ایشیا ۶۳، ۱۵۴

(ب)

باب السلام (مسجد نبوی) ۳۰۴
باس فورس (ترکی) ۱۶۶
بالاکوٹ ۹۳
باندہ ۱۰۴
بترا (PETRA) ۲۹۸
بجنور ۲۶۷
بحر مرمرہ ۱۶۹
بحرین ۲۱۷
برّصغیر (ہندوپاک) ۲۵۶، ۲۶۴، ۲۷۵، ۳۱۶، ۳۲۷
برطانیہ دیکھیے انگلستان
برما ۵۳، ۵۶، ۲۳۵، ۲۳۶
بروکسلز ۱۰۹
برہانپور ۲۰۴
بستان نورولی ۳۰۳، ۳۲۴
بلجیم ۷۹، ۱۰۶
بلغاریہ ۱۷۰
بلگرام ۵۱
بمبئی ۱۱۱، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۵۴، ۱۵۹، ۲۵۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۸۱، ۲۸۲
بنارس ۸۱، ۱۵۹، ۲۱۷، ۲۲۱، ۳۱۶، ۳۲۲، ۳۲۵
بندیل کھنڈ ۱۰۴
بنگلہ دیش ۵۳-۵۸، ۶۰، ۶۳، ۶۶، ۱۹۴، ۲۱۷، ۲۳۶

بنّوری ٹاؤن (کراچی) ۶۵، ۶۶، ۱۷۲
۱۷۵
بہار ۱۰۴، ۱۱۴، ۱۲۵
بہاولپور ۳۰۳
بھوپال ۶۵، ۱۸۸، ۱۸۹، ۳۱۰
بوٹ کلب (نئی دہلی) ۱۲۷
بورصہ ۱۶۶، ۱۶۹، ۱۷۰
بورنیو ۲۳۵
بیروت ۱۶۱

(پ)

پاکستان ۲۵، ۵۳، ۵۴، ۶۴، ۶۵
۷۴، ۹۳، ۱۴۳، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۵
۲۱۶، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۸۶، ۳۰۳
پٹن ۲۶
پٹنہ ۲۰، ۲۰۴، ۳۱۹
پٹیہ ۵۶، ۵۷
پشاور ۲۴۱
پُنا ۱۰۴، ۱۰۵
پنجاب ۹۳، ۳۱۶، ۳۱۷
پونہ ۱۹۳، ۱۹۶، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۱۲
پینام ۵۶

(ت) (ٹ)

تامل ناڈو ۱۲۵
ترکی۔ترکستان ۲۲، ۲۹، ۱۲۹، ۱۶۱، ۱۶۳
۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۸، ۲۱۸، ۲۸۶، ۳۱۸
ترنگانو ۲۳۹، ۲۴۰
تعز ۴۸، ۵۰، ۷۴
تغلق آباد ۲۶۹
تلمسان ۱۸۱
تھانہ بھون ۲۶۴
تھائی لینڈ ۲۳۵، ۲۴۴
ٹورنٹو ۳۵
ٹونک ۶۵، ۲۲۲، ۳۱۶

(ج) (چ)

جاپان ۱۹۹
جبل الرجیب ۲۱
جدّہ ۹، ۲۹–۲۶، ۳۲، ۵۲، ۶۴
۹۸، ۱۸۶، ۱۸۷، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۷
۲۹۴، ۳۰۱، ۳۰۳، ۳۰۵–۷، ۳۲۴
۳۲۵
جرمن۔جرمنی ۱۵۴، ۱۱، ۲۷، ۲۷۶، ۳۳۱
الجزائر ۲۸، ۳۱، ۵۳، ۸۱–۱۷۹
۱۶۸، ۲۳۵
جزیرۃ العرب ۲۸۳، ۲۸۶
جنوبی ہند ۱۲۵
جنوبی یمن ۴۵
جونپور ۱۲۵
جے پور ۱۳۰، ۱۹–۲۱۷
جنیوا ۱۱۰
چاٹگام ۵۴–۵۶

چین ۲۰۱، ۲۰۲

(ح) (خ)

حبشہ ۲۱۷
حجاز مقدس ۱۱، ۱۳، ۲۶، ۳۲، ۴۷، ۵۳، ۷۵، ۷۹، ۹۴، ۱۷۹، ۲۱۸، ۲۷۸، ۲۸۱، ۲۸۶، ۳۰۱
حُدیبیہ ۲۴۱
حُدیدہ ۴۸، ۵۱
حرمین شریفین ۱۵، ۱۶، ۹۵، ۱۰۳، ۲۶۲، ۲۷۹، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۹۳، ۲۹۴، ۳۲۴
حسن پور ۳۰۱
حیدرآباد ۲۰، ۱۳۷، ۱۳۸، ۲۲۱
حیدرآباد کالونی (پاکستان) ۷۳
خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ۲۶۴
خانقاہ رحمانیہ (مونگیر) ۱۱۴
خلیج بنگال ۲۳۵
خلیج عرب ۲۸، ۳۱، ۵۸، ۲۶۲

(د) (ڈ)

دائرۂ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں ۹۲
دبئی ۲۷۱
دریائے یرموک ۱۹
دمشق ۹، ۱۶، ۲۰، ۲۸
دولمہ باغچہ (تاریخی قصر) ۱۶۶
دھارنی ۲۰۵
دہلی ایرپورٹ ۲۶۹
دہلی ۱۳، ۲۹، ۷۴، ۹۱، ۱۱۰، ۱۱۸، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۸، ۱۴۱، ۱۵۹، ۱۶۲، ۱۷۱، ۱۷۸، ۱۸۷، ۱۹۳، ۱۹۶، ۱۹۷-۲۰۱، ۲۰۶، ۲۱۷، ۲۲۲، ۲۳۵، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۵۰، ۲۶۴، ۲۶۷-۶۹، ۲۷۷، ۲۸۱، ۳۰۲، ۳۰۶، ۳۰۹، ۳۱۶، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۴
دیوبند ۱۱۱، ۲۶۴
دیورالا ۱۳۰
ڈالی گنج (لکھنؤ) ۳۲۱
ڈھاکہ ۵۴، ۵۶، ۶۰، ۶۴

(ر) (ز)

راجستھان ۱۰۴، ۱۳۰، ۲۱۸
رام جنم بھومی ۲۶۷، ۲۶۸
رانچی ۱۱۱
رائے بریلی ۶۴، ۱۱۲، ۱۲۴، ۲۷۲، ۳۱۶، ۳۱۹، ۳۲۰
رائے پور ۲۶۴
رباط ۲۵، ۳۱، ۹۴، ۲۳۵، ۲۸۲
روس ۱۹۹، ۲۰۷، ۲۵۶
روم ۱۸، ۲۱، ۷۲، ۲۲۵
ریاض ۲۷، ۲۸، ۱۰۳، ۲۱۹، ۲۸۱، ۳۰۰، ۳۰۶، ۳۰۹، ۳۲۶
ریجنسی بالاس (ہوٹل عمان) ۱۴
ریواں ۱۰۵
زبید ۴۸، ۵۰، ۵۱

زرقاء ۱۹
زین العابدین ہال۔ ملیشیا ۲۴۲

(س)

سنتنا ۱۰۴، ۱۰۵
سدّمآرب ۴۶
سری نگر ۲۱۰
سطیف ۱۸۱، ۱۸۶
سعودی عرب ۲۵، ۱۰۴، ۱۸۹، ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۹۹، ۳۰۱، ۳۰۲
سلہٹ ۵۶
سُمالیہ ۹۸
سُنارگاؤں ۵۶
سندھ ۵۶
سنکیانگ ۱۰۸
سوڈان ۹۸
سہارنپور ۲۶۴
سہاگ پیلس ۲۶۹
سیتاپور ۱۸۸
سیدھی ۱۰۴، ۱۰۵
سیکر ۱۳۰

(ش) (ص)

شارع منصور (مکۂ مکرمہ) ۲۸۲
شام ۲۰، ۲۴، ۲۵، ۷۵، ۲۱۷
شبلی منزل (اعظم گڑھ) ۳۲۳
شرقِ اردن دیکھیے اردن
شمالی یمن ۳۳، ۴۵
شہید مینار میدان (کلکتہ) ۱۱۴، ۱۹۹
صنعاء ۱۳، ۲۷، ۳۲، ۳۴، ۳۷، ۳۸، ۴۱، ۴۳، ۴۵، ۴۸، ۶۴
صنعاء ایئرپورٹ ۳۲
صوبۂ سرحد ۹۳

(ط)

طائف ۲۹۸
طریق الہجرۃ ۳۰۰
طور ۱۸
طیبہ ثانویہ (مدینہ منورہ) ۹۵

(ع)

عالم اسلام۔ ممالک اسلامیہ ۱۰، ۱۱، ۱۵، ۱۷، ۳۳، ۵۸، ۶۱، ۶۲، ۷۶، ۱۰۶، ۱۳۴، ۱۶۳، ۱۸۰، ۱۹۴، ۲۵۱، ۲۵۶، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۲، ۲۹۱، ۳۲۶
عالم عربی۔ عرب ممالک ۱۳، ۱۷، ۳۱، ۳۸، ۴۲، ۵۱، ۵۳، ۸۲، ۱۸۰، ۱۸۶، ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۵۶، ۲۶۱، ۲۷۹، ۲۸۷، ۲۸۸
عجم ۵۱، ۵۲
عراق ۲۶۲، ۲۹۸
عرفات ۳۰۷، ۳۰۸
علی گڑھ ۲۶، ۱۲۸، ۱۹۶، ۲۱۷، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۶۹، ۳۱۶

عمّان ۱۱-۱۴، ۱۸، ۲۱-۲۶، ۵۲، ۲۶۰

عُمان ۲۵

عیدگاہ متھرا ۸۱

عیدگاہ مرادآباد ۲۶۳

(ف)

فاران کلب (کراچی) ۱۷۲

فرنگی محل (لکھنؤ) ۳۲۱

فطانی ۲۴۴

فلاڈلفیا ۲۲، ۱۰۹

فلپائن ۲۳۵

فلسطین ۱۷، ۲۱۷

فندق الحمد السیاحی (یمن) ۳۴

فندق الحیاۃ (مکہ مکرمہ) ۲۸۲

فندق الیرموک (دمشق) ۲۰

فندی زادہ (محلہ استنبول) ۱۶۲

(ق)

قاعۃ البتراء (ہوٹل عمان) ۱۷

قاعۃ التضامن الاسلامی۔ جدہ ۲۸۲

قاہرہ ۳۷، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۶، ۲۶۰، ۳۰۳

قدح ۲۴۴، ۲۴۵

القدس ۲۳

قرطبہ ۳۲

قصر بلدز ۱۶۶

قطر ۲۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۹۵

قلعۂ الموت ۲۵۵

(ک)

کاشغر ۲۸۶

کالی کٹ ۱۲۵، ۲۱۷

کامٹی ۲۰۴

کانپور ۲۷۱، ۲۷۲، ۳۲۲

کراچی ۵۲، ۵۳، ۶۴-۶۶، ۶۸، ۷۳، ۱۶۱، ۱۷۱، ۱۷۲، ۳۰۳

کرامول ہاسپٹل۔ لندن ۲۷۵، ۲۷۶

کرناٹک ۱۲۵

کشمیر ۱۲۵، ۳۱۶

کشور گنج ۵۸

کلکتہ ۵۳، ۵۴، ۵۶، ۶۴، ۱۱۳، ۱۱۶، ۱۹۸

کنیا کماری ۲۱۰

کنیڈا ۳۵، ۵۳

کوالالمپور ۲۳۷، ۲۳۸-۴۲، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۹

کوچین ۱۲۵

کوفہ ۱۷۳

کوکس بازار ۵۶

کوہِ صفا ۲۲۵

کہف الرجیب ۲۱

کویت ۱۱-۱۳، ۱۴، ۱۸، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۳، ۲۷۶، ۲۷۷، ۳۲۵

کیرالا ۱۲۵، ۲۱۷
کیرانہ ۲۶۴

گ ل

گاندھی نگر ۱۹۸
گجرات ۲۶، ۳۱۳
گلشن رحیمی رائے پور (خانقاہ) ۲۶۴
گنگوہ ۲۶۴
گولان ۱۹
لاہور ۶۵، ۳۱۶
لکسمبرگ ۱۰۶، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۷۹
لکھنؤ ۲۸، ۵۵، ۵۶، ۷۴، ۷۶
۹۰، ۱۲۸، ۱۳۱، ۱۳۴، ۱۳۷، ۱۳۸
۱۵۹-۶۲، ۱۷۰، ۱۸۷-۹۰، ۲۰۳
۲۱۷، ۲۶۰، ۲۶۸
لندن ۱۰۶، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۲۲، ۱۷۹
۱۸۱، ۲۷۰-۷۲، ۲۷۵، ۲۷۶
لنکا ۵۳، ۲۳۶، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۲
۲۷۷، ۲۸۱، ۲۸۴، ۳۰۳، ۳۱۱
۳۱۹-۲۱

م

ماسکو ۱۴
مایار ۴۰
متھرا ۸۱
مٹروپول ہوٹل۔ کراچی ۱۶۹، ۱۷۲
مجیدیہ ہاسپٹل۔ دہلی ۲۶۹
مدراس ۱۳۵، ۱۴۰، ۲۵۰، ۳۳۱
مرچپورہ ۲۶۹
مدھیہ پردیش ۱۰۴، ۱۰۵، ۲۰۵، ۳۱۰
مدینہ منورہ ۲۶، ۲۷، ۳۱، ۹۴، ۹۵، ۹۷، ۹۸
۱۰۰، ۱۸۷، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۵
۲۹۴، ۳۰۰-۳۰۴، ۳۲۴
مرادآباد ۱۲۸، ۱۳۰، ۲۶۳
مراکش ۲۸، ۳۱، ۵۳، ۱۹۴، ۲۱۷، ۲۳۵
۲۸۲
مسقط ۲۵
مشرق اقصیٰ ۲۸۲
مشرقی بنگال ۵۴
مشرقی پنجاب ۱۰۴
مشرق وسطیٰ ۸۲
مصر ۷۴، ۷۵، ۱۳۴، ۱۵۶، ۱۶۲، ۱۷۹
۱۸۰، ۱۸۶، ۲۱۷
مظفر نگر ۲۶۴
مغربی بنگال ۶۲، ۶۳
مکۂ مکرمہ ۲۴، ۲۷، ۲۹، ۴۶، ۵۴، ۹۴، ۹۵
۹۸، ۹۹، ۱۳۴، ۱۸۷، ۲۲۱، ۲۶۲، ۲۷۸-۸۲
۲۸۸، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۰۰
۳۰۱، ۳۰۵، ۳۱۶، ۳۲۴
ملیانہ ۲۶۵، ۲۶۶
ملیشیا (ملایا) ۳۹-۲۳۵، ۲۴۶، ۲۴۹، ۲۶۲
منگلور ۱۲۵
منیٰ ۳۰۱
مومن پورہ ۲۱۲
مومن شاہی (میمن سنگھ) ۵۶
مونگیر ۱۱۴
مئو ۳۲۳
مہاراشٹر ۸۱، ۲۰۲، ۲۰۵، ۲۶۸

میرٹھ ۱۲۸، ۲۰۳، ۲۶۳، ۲۶۵-۶۸

(ن)

ناسک ۱۹۸
ناگپور ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۹۳، ۱۹۶، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۴، ۲۰۵
ناگود ۱۰۴، ۱۰۵
نانڈیڑ ۲۶۸
نالوتہ ۲۶۴
نجد ۴۷
نظام الدین دہلی ۲۹، ۱۳۷
نہیلیہ ۵۶
نئی دہلی ۱۲۶، ۱۳۷
(دریائے) نیل ۲۸۶
نیلاب ۵۶
نیوٹاؤن کراچی (بنّوری ٹاؤن) ۶۵، ۲۷

(و) (ھ)

واشنگٹن ۲۵۰
ولید پور ۲۶۷
ہاشم پورہ ۲۶۸
ہتھورہ ۱۰۴، ۱۰۵
ہندوستان ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۲۰، ۲۶، ۲۹، ۳۳، ۳۶، ۳۷، ۴۰، ۵۰، ۶۳، ۶۹، ۷۵-۷۷، ۸۲، ۸۴، ۹۱، ۹۴، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۱۰، ۱۲۲، ۱۲۹، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۳۶، ۱۴۰-۴۲، ۱۴۸، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۷-۵۹، ۱۷۵، ۱۷۹، ۱۸۲، ۱۸۹، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۶-۲۰۰، ۲۰۵، ۲۱۰، ۲۱۳، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۲۰، ۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۸، ۲۵۵-۵۷، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۷۲، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۸۶، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۷، ۳۳۰
ہوٹل پوربانی ۵۷
ہوڑہ اسٹیشن ۵۳

(ی)

یرموک ۱۹، ۲۰، ۲۱
یلووا ۱۷۰
یمن ۱۱-۱۳، ۲۶، ۲۷، ۳۰-۳۵، ۴۱، ۴۳، ۴۴، ۴۶-۴۹، ۵۲، ۵۳، ۷۴، ۲۱۷
یوپی ۱۰۴، ۱۱۰، ۱۲۵، ۱۵۹، ۱۹۰، ۲۰۷، ۲۱۳، ۲۳۱، ۲۶۸
یورپ ۶۳، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۵۴، ۲۲۰، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۳۶، ۲۳۹، ۲۸۲
یونان ۶۳، ۱۸۲، ۱۸۳، ۲۲۵، ۲۲۸، ۲۲۹

مساجد و معابد:

بیت اللہ شریف، کعبہ شریف ۱۹۰، ۱۹۱، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۹۶، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰
بیت المقدس۔ مسجد اقصیٰ ۱۴، ۱۷، ۲۱
مسجد نبوی ۲۶، ۹۵-۹۸، ۱۹۱، ۲۹۴، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵
بابری مسجد۔ اجودھیا۔ ۸۱، ۱۳۸، ۱۵۷-۵۹، ۲۶۷، ۲۶۸
بیت المکرم (جامع مسجد ڈھاکہ) ۶۰
تاج المساجد بھوپال ۱۸۸، ۱۸۹، ۳۱۰
جامع مسجد مئو ۳۲۳
جامع مسجد نیوٹاؤن۔ کراچی۔ ۶۵، ۶۶، ۱۷۲، ۱۷۵
جامع مشہد یمن ۴۱
جامع المظفر۔ تعز ۴۹
دربار صاحب۔ امرتسر ۸۳
مسجد اسلامک سنٹر، واشنگٹن ۲۵۰
مسجد البشیر الابراہیمی۔ سطیف ۱۸۱
مسجد تنبولیاں، پونہ ۲۱۲
مسجد سیدنا عمر بن الخطاب۔ اردن ۱۹
مسجد صلاح الدین الیوبی۔ اردن ۲۳

مسجد فاتح۔ استنبول ۱۶۲، ۱۷۱
مسجد فرقانیہ۔ حیدرآباد کالونی (پاکستان) ۷۳
مسجد مومن پورہ، پونہ ۲۱۲
مسجد منصور شعیبی۔ جدہ ۳۰۶
گیان باپی مسجد۔ بنارس ۸۱
گولڈن ٹمپل (گردوارہ) امرتسر ۸۳
وشوناتھ مندر۔ بنارس ۸۲

متفرقات

تعلیمی ادارے، جامعات و مدارس:

آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۷۹، ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۵، ۳۲۶
الٰہ آباد یونیورسٹی ۲۱۷، ۳۱۶
ام درمان اسلامک یونیورسٹی ۲۷۳
انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی۔ کوالالمپور ۲۳۸، ۲۴۹
بنارس یونیورسٹی ۲۱۷، ۳۱۶
پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور ۳۱۶
پونہ کالج ۲۱۲
ٹکنالوجی یونیورسٹی۔ کوالالمپور ۲۴۳، ۲۴۴
ٹیمپل یونیورسٹی۔ فلاڈلفیا ۱۰۹
جامع ازہر۔ مصر ۱۳۴، ۱۶۲، ۱۷۹، ۱۸۰
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ ۲۶، ۲۷، ۳۱، ۹۵، ۹۸، ۲۴۰، ۳۰۳، ۳۰۴
الجامعۃ الاسلامیۃ بہاولپور ۳۰۳
جامعہ اسلامیہ۔ پٹیہ (چاٹگام) ۵۵، ۵۷
جامعہ امام محمد بن سعود۔ ریاض ۲۷، ۲۸، ۱۰۳، ۲۱۹، ۲۷۲، ۳۲۶
جامعہ اُم القریٰ۔ مکۂ مکرمہ ۲۲۱، ۳۱۶
جامعہ امدادیہ۔ کشور گنج ۵۸
جامعہ سلفیہ۔ بنارس ۳۲۲، ۳۲۵
جامعہ عربیہ ہتھورہ ۱۰۵
جامعۃ العلوم الاسلامیہ (دارالعلوم) بنوری ٹاؤن۔ کراچی ۶۵، ۷۲
جامعہ ملیہ۔ دہلی ۲۱۷، ۲۲۲، ۳۱۶
جامعہ ہدایت، جے پور ۲۱۸، ۲۱۹
جامعۃ الیرموک۔ اربد ۱۹
جمعیۃ التربیۃ الاسلامیہ کوالالمپور ۲۳۸
جواہر لال نہرو یونیورسٹی۔ دہلی ۲۲۱، ۳۱۶
دارالعلوم تاج المساجد بھوپال ۱۸۹
دارالعلوم دیوبند ۱۱۱، ۲۶۴
دارالعلوم ندوۃ العلما۔ ۱۳، ۲۳، ۲۸، ۵۵، ۵۶، ۱۲۰، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۷۰، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۲، ۲۳۶، ۲۶۹، ۳۰۳، ۳۱۰، ۳۱۶، ۳۱۷، ۲۲-۳۱۹، ۳۲۴
دارالمبلغین۔ لکھنؤ ۲۵۷
دمشق یونیورسٹی ۲۰
دہلی یونیورسٹی ۲۱۷، ۳۱۵، ۳۱۶
سینٹ کراس کالج لندن ۱۰۶، ۱۰۷، ۲۷۳
شریعت فیکلٹی (کلیۃ الشریعۃ) کوالالمپور۔ ۲۴۳

صنعاء یونیورسٹی ۳۴
طبیہ کالج۔ پونہ ۲۱۲
عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد ۲۰، ۲۲۱
کالی کٹ یونیورسٹی ۲۱۷
کراچی یونیورسٹی ۷۰
کشمیر یونیورسٹی ۳۱۶
کلیۃ تحصیر البعثات۔ مکۃ مکرمہ ۹۸
کلیۃ الدعوۃ والاعلام۔ ریاض ۱۰۳
کلیۃ الشریعۃ۔ دمشق ۲۰
کلیۃ الشریعہ۔ قطر ۲۵
کلیۃ الطیران۔ صنعاء ۳۸
کلیۃ العلوم الاجتماعیہ۔ ریاض ۳۲۶
کلیۃ العلوم العربیۃ۔ عمّان ۲۱
کلیۃ اللغۃ العربیۃ۔ ندوۃ العلماء ۲۸
قومی یونیورسٹی کوالالمپور ۲۴۳
گیان پربودھنی۔ پونہ ۲۱۲
لکھنؤ یونیورسٹی ۳۱۶
مدرسہ عالیہ۔ ڈھاکہ ۶۴
مدرسۃ الوعاظ والخطباء۔ بورصہ ۱۷۰
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۶، ۱۹۶، ۲۱۷، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۶۹، ۳۰۰
مظاہر العلوم سہارنپور ۲۶۴
معہد التربیۃ الاسلامیہ۔ قدح ۲۴۵
المعہد العالی للدعوۃ۔ قدح ۲۴۵
مولدینہ جونیر کالج۔ پونہ ۲۰۵
مولدینہ ہائی اسکول۔ پونہ ۲۱۲
ملیشین یونیورسٹی۔ کوالالمپور ۲۴۵
میڈیکل کالج لکھنؤ ۳۲۱
میگ والن کالج۔ لندن ۱۰۷
ناگپور یونیورسٹی ۲۰۱
ہندو یونیورسٹی۔ بنارس ۲۲۱

نظریات و مذاہب:

استشراق ۲۳۱
تبرّا ۴۷
جمہوریت ۱۴۵، ۱۵۵، ۱۹۸
زیدی مذہب ۴۷
سیکولرزم ۱۴۵، ۱۴۶
شیعیت ۲۵۸، ۲۶۱
عیسائی مذہب ۳۰۷
فرقہ اثنا عشریہ ۱۳۶، ۲۵۱، ۲۵۷، ۲۶۰
قادیانیت ۲۶۱
کمیونزم۔ اشتراکیت ۴۵، ۴۹، ۲۲۱
مجوسیت ۲۵۹
مذہب اثنا عشری جعفری ۴۷
ہندو مذہب ۱۲۰
یکساں سول کوڈ ۱۳۹، ۱۵۱، ۱۵۴، ۱۶۰
یہودی مذہب ۳۰۷

تحریکات، جماعتیں، سوسائٹیاں اور فرقے

ابیم (ABIM۔ اسلامی تنظیم) ملیشیا ۲۳۶، ۲۳۹، ۲۴۴، ۲۴۶
اتحاد طلاب الیمن ۲۷، ۳۲
اتحاد المسلمین حیدرآباد ۱۲۶
اخوان المسلمین ۲۳

ادارۃ البحوث العلمیہ والافتاء - ریاض ۳۰۰
اردو اکیڈمی۔ لکھنؤ ۳۲۱
آریہ سماج ۲۰۶
آسام گن پریشد ۱۴۴
اسلامک سنٹر۔ آکسفورڈ ۹-۱۰۶، ۱۷۹، ۲۷۰، ۲۷۲، ۳۲۶
اسلامک سنٹر بیکر اسٹریٹ لندن ۱۱۰
اسلامک سنٹر واشنگٹن ۲۵۰
اسلامک ویلفیر۔ لندن ۱۱۰
آل انڈیا شیعہ کانفرنس ۱۲۶
آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ ۱۵-۱۱۱، ۱۲۶-۱۲۴، ۱۵۱، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۰
آل انڈیا مسلم لیگ ۱۲۶، ۱۳۸
ایمنسٹی انٹرنیشنل ۲۶۸
انجمن اشاعت قرآن عظیم۔ کراچی ۷۳
ایکشن کمیٹی بابری مسجد ۱۳۱
بوہرہ جماعت ۱۲۶
بریلوی کونسل - لندن ۱۲۲
بمبئی آندھرا ٹرانسپورٹ کمپنی ۲۶۹
تحریک آزادئ ہند ۸۴، ۲۱۲، ۲۱۵، ۲۱۷
تحریک اصلاح وجہاد (سید احمد شہیدؒ) ۵۴، ۵۵، ۷۷، ۳۱۵، ۳۱۶
تحریک باطنیہ ۲۵۵، ۲۹۱
تحریک پیام انسانیت۔ لکھنؤ ۱۰۴، ۱۹۵، ۲۰۱، ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۱۵
تحریک حسن بن صبّاح (قلعۂ الموت) ۲۵۵، ۲۹۱
تحریک خلافت ۱۹۸، ۲۸۶
تحریک خوارج ۲۵۵، ۲۹۱
تحریک فدائیان ۲۵۵، ۲۹۱
نغد بریلت حیدرآباد ۱۲۵، ۱۲۶
تلگو دیشم ۱۴۲، ۱۴۳
جماعت اسلامی حیدرآباد ۱۲۵
جماعت اسلامی ہند ۱۲۶
جماعت تبلیغ ۲۳، ۲۹، ۱۸۹، ۲۴۲
جماعت فری مین ۲۵۲
جمعیۃ اتحاد الطلبہ۔ یمن ۲۷
جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی۔ کویت ۲۷۶
جمعیۃ العلماء ہند ۱۲۶
جمیل الدین لمیٹڈ۔ ڈھاکہ (فرم) ۵۶
الحزب الاسلامی کوالالمپور ۲۳۷، ۲۴۹، ۲۵۰
خمینی تحریک ۳۰۸
دینی تعلیمی کونسل یو پی ۱۱۰، ۱۵۹
رابطۂ ادب اسلامی ۲۷، ۲۸، ۱۰۴، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۵، ۲۰۰-۲۱۵، ۲۳۳، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۱۰، ۳۱۱
رابطۂ عالم اسلامی۔ مکۂ مکرمہ ۲۴، ۶۴، ۶۸، ۹۴، ۱۰۷، ۱۳۴، ۱۸۹، ۲۷۲، ۲۷۸، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۹۹، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۶
راجیہ سبھا ۱۲۶
رائل بودھیک سوسائٹی ناگپور ۲۰۱
آر۔ ایس۔ ایس ۸۱، ۱۰۶، ۲۱۲
سپریم کورٹ (ہند) ۲۳-۱۱۱
۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۲-۱۳۶، ۱۵۱، ۱۵۷، ۱۶۰، ۱۹۵
الشبان المسلمین۔ پونہ ۲۱۲
شنوسینا ۸۱، ۸۶، ۱۹۶
عبد الغنی محمد نور ولی سعودیہ (فرم) ۲۶، ۳۰۳

فاران کلب۔ کراچی ۶۹
کانگریس (آئی) ۷۹، ۸۱، ۸۳، ۱۳۹، ۱۴۲
۱۴۴، ۱۴۵، ۱۹۸، ۲۰۳
کل ہند مجلس استحکام و یکجہتی فورم لکھنؤ ۱۹۷
کمیونسٹ پارٹی ۱۴۲

لائنز کلب۔ پونہ ۲۰۶
لوک سبھا (ہند) ۱۴۲، ۱۴۶
مجلس البحوث الاسلامیہ العالمیہ۔
لکسمبرگ ۱۰۹، ۱۷۹، ۱۸۰
مجلس الشعب۔ یمن ۳۴
المجلس العالمی للمساجد، رابطہ، مکہ مکرمہ ۲۸۰
مجلس مشاورت ۲۹
مرکزی ادارۂ امور زراعت مدا۔ قدرح ۲۴۵
مرہٹہ چیمبرس آف کامرس۔ پونہ ۲۰۶
مسلم مجلس ۱۲۶
مسلم ویلفیر۔ لندن ۱۱۰
مکتبۃ التوجیہ والارشاد یمن ۲۷، ۳۱-۳۳
ملتقی الفکر الاسلامی۔ الجزائر ۸۲-۱۷۹، ۱۸۶
منظمۂ مؤتمر اسلامی۔ قدس ۱۶۶
مہاراشٹر اردو اکیڈمی ۲۰۲
نادی المدینۃ المنورۃ الادبی ۹۴
نادی مکۃ المکرمۃ الثقافی ۹۸
ندوۃ الشباب العالمی سعودیہ ۳۰۶
ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ ۱۱۳، ۲۱۵

نیشنل کانفرنس ۱۴۵
وشو ہندو پریشد ۸۱، ۸۶، ۱۵۷
وقف بورڈ مدھیہ پردیش ۳۱۰
ہمدرد فاؤنڈیشن۔ دہلی ۲۶۹
ہندو احیائیت (تحریک) ۷۹-۸۶
۱۵۱، ۱۵۲، ۱۹۶، ۲۰۰، ۲۰۵
الہیئۃ العامۃ للمعاہد العلمیۃ یمن ۴۳، ۴۴

ڈائیلاگ، سیمینار و کانفرنسیں:

اجلاس ہشتم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
بمبئی (۹ دسمبر ۱۹۸۶ء) ۱۵۹
پچاسی سالہ جشن تعلیمی ندوۃ العلماء
(۱۹۷۵ء) ۲۳
پہلی کانفرنس رابطۂ ادب اسلامی۔
ندوۃ العلماء، لکھنؤ (۷-۹ جنوری ۱۹۸۶ء) ۲۱۶
ڈائیلاگ و پریس کانفرنس۔ دہلی (۱۴ مئی ۱۹۸۶ء)
۱۲۸، ۱۲۹، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۰۰
" ناگپور (۵ اکتوبر ۱۹۸۶ء) ۲۰۰، ۲۰۵
" پونہ (۲۱ فروری ۱۹۸۷ء) ۲۰۵، ۲۱۴
سیمینار۔ اسلام اور مستشرقین اعظم گڑھ
(۲۴ فروری ۱۹۸۲ء) ۲۹
سیمینار علامہ سید سلیمان ندوی خدمات
وکارنامے۔ بھوپال (ستمبر ۱۹۸۵ء) ۱۸۷، ۱۸۸
سیمینار امام مالک الموطأ (مارچ ۱۹۸۶ء)
۳۲۴

سیمنار ملتقی الفکر الاسلامی۔ الجزائر (ستمبر ۸۶ء) ۱۸۱
سیمنار رابطۂ ادب اسلامی۔ جے پور (۱۷/۱۸/ فروری ۸۷ء) ۲۱۷، ۲۱۸
سیمنار "اردو ادب پر حضرت سید شہیدؒ کی تحریک کا اثر" ندوۃ العلماء لکھنؤ (۱۱/۱۲/ نومبر ۸۷ء) ۳۱۱
سیمنار شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ بنارس (۲۱-۲۳/ نومبر ۸۷ء) ۳۲۲، ۳۲۵
کانفرنس دینی تعلیمی کونسل۔ سیتاپور (اکتوبر ۶۶ء) ۱۸۸
کانفرنس دینی تعلیمی کونسل۔ بنارس (نومبر ۶۶ء) ۱۵۹
کل ہند تحفظ شریعت کانفرنس رائے بریلی (۹/ فروری ۶۶ء) ۱۲۴
مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس۔ امریکہ (۱۹۶۷ء) ۳۱۶
المؤتمر الاسلامی العام الثالث للرابطہ مکۂ مکرمہ (اکتوبر ۸۷ء) ۲۸، ۲۸۷، ۲۹۳
مؤتمر عالم اسلامی۔ کراچی ۶۸

علمی تحقیقاتی و نشریاتی ادارے

کتب خانے اور مطابع:

احیاء التراث الاسلامی قطر ۲۱۶، ۲۹۵
اسلامک فاؤنڈیشن۔ ڈھاکہ ۵۸-۵۶، ۶۱، ۶۳، ۶۴
بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز۔ دہلی ۱۱۸
دار البشیر اردن ۲۱، ۲۳
دار الشروق۔ جدّہ ۹۸، ۳۰۶
دار الصحوہ۔ قاہرہ ۳۷
دار القلم۔ دمشق وجدّہ ۹
دار القلم۔ کویت ۷۵، ۷۷، ۳۲۵
دار المصنفین اعظم گڑھ ۲۹، ۸۱، ۸۲، ۲۱۷، ۲۵۹، ۳۱۳، ۳۱۵، ۳۱۸-۲۳
عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک ۲۲۲
کتب خانہ اسکندریہ ۲۳۲
" مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ رائے بریلی ۹۱
" ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۰۵، ۳۱۱، ۳۱۷
کرزن اسٹیم پریس۔ دہلی ۳۰۲
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ ۳۷، ۶۳، ۷۶، ۸۱، ۲۶۰
مجمع بحوث الحضارۃ الاسلامیہ۔ عمّان ۱۲-۲۳
المجمع العلمی العربی (مجمع اللغۃ العربیۃ) دمشق ۱۶، ۲۸
المجمع الفقہی للرابطہ۔ مکۂ مکرمہ ۱۳۴، ۲۸۰، ۳۲۳
مکتبۃ الملک عبدالعزیز۔ مدینہ منورہ ۹۵
مؤسسۃ آل البیت۔ اردن ۱۴، ۱۲-۲۵
مؤسسۃ الرسالہ ۲۳

ہوائی کمپنیاں:

ایرانڈیا ۲۵۰
ایروفلوٹ (روسی جہاز کمپنی) ۲۳۸
برٹش ایرویز ۲۷۷
B.O.A.C. (ایرویز) ۱۳، ۳۷۱
الجیرس ایرلائن ۱۸۶
سعودی ایرلائن ۳۲، ۱۸۶
کویت ایرویز ۲۷۶
ملیشین ایرلائن ۲۵۰

جنگیں، اہم و تاریخ ساز واقعات:

ایرانی انقلاب ۱۹۷۹ء ۲۵۱، ۲۵۶، ۲۶۲، ۲۷۹، ۳۰۸
المیۂ میرٹھ مئی ۱۹۸۷ء ۱۲۸، ۲۰۳، ۲۶۳
تقسیم ہند ۱۲۸
تنازعۂ بابری مسجد و رام جنم بھومی
اجودھیا ۲۶۷، ۲۶۸
جنگ آزادیٔ ہند ۱۸۵۷ء ۱۹۸، ۲۶۳
" ایران و عراق خلیجی جنگ ۲۶۲، ۲۷۹
شاہ بانو کیس ۱۰، ۱۲۷
جنگ صلیبی ۱۸
جنگ عظیم اول ۱۵۴
" " دوم ۱۵۴
جنگ ما بار ۴۰
جنگ یرموک ۱۹
حجۃ الوداع ۲۵۱، ۳۰۸
رسم چندری (دیورالا ستمبر ۱۹۸۷ء) ۱۳۰، ۱۳۱
صلح حدیبیہ ۲۴۱
غدر ۱۸۵۷ء ۳۰۲
غزوۂ بدر ۱۰۰
فساد مرادآباد اگست ۱۹۸۰ء ۲۶۳
قضیہ بوفورس ۲۰۳
مقدمۂ انبالہ (۱۸۶۴ء) ۴۰
مسئلہ خلافت ۱۲۹
مسلم مطلقہ قانون بل ۶ مئی ۱۹۸۶ء ۱۳۰، ۱۹۷، ۱۹۹
واقعۂ اسراء و معراج ۱۷، ۱۹، ۲۱
واقعۂ ستی دیورالا ستمبر ۱۹۸۷ء ۱۳۰

دیگر متفرقات:

ایرانڈیا ٹینری کانپور ۲۷۱
جدہ ریڈیو ۲۹
جنبیہ (ایک رسم) ۴۷
جنتا حکومت ۱۹۷۷ء ۷۹
درس نظامی ۶۳
رومن امپائر ۱۰۱
قات (یمنی بوٹی) ۴۸، ۴۹
یہودی سلطنت ۲۵۱